امام یحییٰ بن شرف الدین النّووی ؒ کے مجموعۂ احادیث

اربعینِ نوَوی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل

خطاباتِ جمعہ

حصّہ دوم

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاھور

امام یحییٰ بن شرف الدّین النّووی رحمہ اللہ کے مجموعہ احادیث

اربعینِ نَوَوِی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل خطاباتِ جمعہ

از

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین:

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور

حصّہ دوم

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

حدیث
17
18

حُسنِ تہذیب اور حُسنِ سلوک

۲۲ فروری ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ)

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (النساء: ۱۲۵)

عَنْ اَبِیْ یَعْلٰی شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ ؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:

((اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ، فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذَّبْحَةَ، وَلْیُحِدَّ اَحَدُکُمْ شَفْرَتَهٗ، وَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَهٗ)) (۱)

سیدنا ابویعلیٰ شداد بن اوس ؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

’’بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے‘ پس جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو بھی اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تمہیں چاہیے کہ اپنی چھری کو خوب تیز کر لو اور ذبیحہ کو راحت پہنچاؤ۔‘‘

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَةَ وَاَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عنھما عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:

((اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ، وَاَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الصید والذبائح وما یؤکل من الحیوان‘ باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ۔ وسنن النسائی‘ کتاب الضحایا‘ باب الامر باحداد الشفرۃ۔

بِخُلُقٍ حَسَنٍ)) (۱)

سیدنا ابوذر جندب بن جنادہ رضی اللہ عنہ اور ابوعبدالرحمٰن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھا کرو اور گناہ کے بعد نیکی کر لیا کرو' وہ نیکی اس گناہ کو مٹا ڈالے گی۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیا کرو۔''

معزز سامعین کرام!

امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمہ اللہ کے شہرۂ آفاق مجموعۂ احادیث ''اربعین'' کے سلسلہ وار مطالعہ کے ضمن میں آج ہم حدیث نمبر سترہ اور اٹھارہ کا مطالعہ کریں گے۔ ان احادیث کا شمار بھی جوامع الکلم میں ہوتا ہے ـــــ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام کے بارے میں خود یہ فرمایا: ((اُوْتِیْتُ جَوَامِعُ الْکَلِمِ)) کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت جامع کلمات عطا ہوئے ہیں۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی خاصیت یہ ہے کہ مختصر ترین الفاظ میں معانی اور ہدایت کا گویا سمندر پنہاں ہے۔ اس ضمن میں یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید سب سے اعلیٰ کلام ہے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ)) (۲) یعنی بہترین کلام قرآن مجید ہے' اور پھر اس کے بعد نمبر ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا۔

ہر چیز پر احسان کا لزوم

ہمارے زیر مطالعہ آج کی پہلی حدیث میں ''احسان'' کا لفظ آ رہا ہے اور اسی مناسبت سے میں نے دو آیات آپ کے سامنے پڑھی ہیں۔ عام طور پر ہمارے ذہن میں احسان کا مفہوم یہ آتا ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ کرنا' کسی پر کوئی احسان کرنا وغیرہ۔ اردو میں یہ لفظ صرف اسی معنی میں مستعمل ہے' لیکن عربی میں اس لفظ کے اور بھی کئی معانی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ زیادہ تر بطور اصلاح کے آیا ہے اور اس کے معنی

(۱) سنن الترمذی' ابواب البر والصلۃ' باب ما جاء فی معاشرۃ الناس۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔

ہیں: انتہائی خوبصورتی کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔ چنانچہ احسانِ اسلام کا مفہوم یہ ہوگا کہ کسی شخص کا اسلام بہت خوبصورت ہو جائے' دلفریب ہو جائے' اس میں خوبیاں موجود ہوں' اس کے اندر روشنی پائی جائے' تو یہ گویا اسلام کا احسان ہو گیا۔

زیر مطالعہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل ہوا ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ)) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے واجب کر دیا ہے ہر شے میں احسان کو''۔ یعنی جو کام بھی کرو دل لگا کر' خوبصورت سے خوبصورت انداز میں اور اچھے سے اچھے طریقے پر کرو تاکہ بہتر سے بہتر نتائج حاصل ہو سکیں۔ دنیوی کام ہو تو اس کے اندر بھی دل لگانا چاہیے' نیم دلی کے ساتھ کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ حلال ذریعے سے کمانا ہے تو دل لگا کر اور محنت سے کماؤ' اس میں کوئی حرج نہیں ہے' بلکہ اس حوالے سے تو حضور اکرم ﷺ نے یہاں تک فرمادیا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ)) (۱)

''امانت دار سچا تاجر (قیامت کے دن) انبیاء' صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

اس اعتبار سے دنیا کا کام بھی عمدگی سے کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ دنیا اور دین کی تقسیم ایک سطح پر آ کر ختم ہو جاتی ہے اور وہاں پہنچ کر دنیا اور دین ایک ہو جاتے ہیں۔ جب آپ دنیا کا کام بھی دین کے طریقے پر کر رہے ہوں اور آپ کا اصل مقصود و مطلوب آخرت ہی ہو تو پھر وہ دنیا' دنیا نہیں رہتی' بلکہ عین دین اور عین عبادت بن جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص حلال کمائی کی کوشش کر رہا ہے تو وہ بھی عبادت اور باعث ثواب ہے۔ اس لیے کہ اُس نے اپنے نفس کا ایک حق جائز طریقے سے ادا کیا اور نفس کے حقوق کے ضمن میں رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان بہت مشہور ہے: ((اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۲) ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔ اب تمہارے جسم و جان کے جو تقاضے ہیں ان کو بھی اگر جائز طریقے سے پورا کرو گے تو وہ عین عبادت بن جائیں گے اور اس پر ثواب ملے گا۔

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب البیوع' باب ما جاء فی التجار وتسمیة النبی ایاھم۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب منه۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الصلاة' باب ما یؤمر به من القصد فی الصلاة۔

اس پر بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حیرت کے ساتھ پوچھا تھا: یارسول اللہ! ہم اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی بیویوں سے جوازدواجی تعلقات قائم کرتے ہیں کیا اس پر بھی ہمیں اجر وثواب ملے گا؟ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہی کام تم کسی غلط طریقے سے کرتے تو تمہیں اس کی سزا ملتی یا نہ ملتی؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس پر سزا تو ملتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم صحیح اور جائز طریقے سے کر رہے ہو تو اس پر تمہیں اجر بھی ملے گا۔

اسلام‘ ایمان اور احسان

احسان کے حوالے سے حدیثِ جبریل کے ضمن میں‘ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو تین بنیادی اصطلاحات: اسلام‘ ایمان اور احسان حدیثِ جبریل میں آئی ہیں تو وہ ایک اعتبار سے نیچے سے اوپر کا درجہ ہے‘ بایں طور کہ اسلام سے اوپر ایمان کا درجہ ہے اور ایمان سے اوپر احسان کا۔ جبکہ ایک اعتبار سے وہ اوپر سے نیچے جا رہا ہے‘ یعنی اسلام میں ایمان ابھی صرف اقرار باللسان تک ہے۔ ایمان میں وہ گہرا ہو کر نیچے جا کر قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور احسان میں وہ یقین اتنا گہرا ہو جاتا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یقین کی گہرائی کہاں تک ہے‘ اس کے ضمن میں میں نے آپ کو پنجابی صوفی شاعر سلطان باہو کا ایک شعر سنایا تھا کہ ؂

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہو!

یہ دل جو ایک ’’مُضْغَة‘‘ یعنی گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں نظر آ رہا ہے‘ یہ تو جسمانی دل ہے جبکہ روحانی دل جو حقیقت میں روح کا مسکن ہے‘ اس کا تو آپ اور میں اندازہ بھی نہیں کر سکتے‘ اس لیے کہ اس دل میں اللہ سما جاتا ہے۔ ایک حدیث قدسی بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((لَمْ یَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَوَسِعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ)) (۱)

---

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی: ۱۸/۳۔

''میں نہ تو اپنی زمین میں سما سکتا ہوں اور نہ اپنے آسمان میں' لیکن میں اپنے بندۂ مؤمن کے دل میں سما جاتا ہوں۔''

چونکہ اس دل کا گہرا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے' لہٰذا اس کی گہرائی کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اس اعتبار سے ایمان گہرا سے گہرا ہو کر جب اس انتہا کو پہنچ جائے کہ ایمان بالغیب ایسے ہو جائے جیسے کسی شے کو اپنی آنکھوں کے دیکھنے سے ایمان و یقین پیدا ہوتا ہے' تو وہ احسان ہے۔

اب نماز کی مثال لیجیے۔ ایک مسلمان نماز پڑھ رہا ہے' اس نے جو رکوع و سجود کیا ہے اس کا بھی پورا حق ادا نہیں کیا ہے' لیکن بہر حال رکوع کیا ہے' قیام کیا ہے' سجدہ کیا ہے' جبکہ دل کسی اور دھندے میں مگن ہے' دماغ کی چکی کچھ اور ہی آٹا پیس رہی ہے تو فقہی اعتبار سے نماز ہو گئی اور اسلام کا تقاضا پورا گیا۔ لیکن اسی نماز میں اگر دل کے یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس میں خوبصورتی اور حسن پیدا ہو جائے گا اور یہ ''احسان الصلاۃ'' ہو جائے گا۔ یہ گویا نماز کو خوبصورت بنا دینا ہے۔ اور اگر معاملہ اس سے بھی اوپر چلا جائے' یعنی ایمان و یقین اتنا گہرا ہو جائے کہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے ((كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو یا کم سے کم تمہیں یہ یقین ہو کہ میں اللہ کے حضور میں ہوں اور اللہ مجھے دیکھ رہا ہے' پھر اُس وقت نماز کی کیفیت وہ ہوگی جسے ''اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ نماز تو اہلِ ایمان کے لیے معراج کے درجے میں ہے۔ یہ اصل میں نماز کے درجات ہیں۔ ظاہری شکل تو نماز کی وہی رہے گی' درجہ احسان تک نماز بھی وہی رہے گی' وہی قیام ہوگا' وہی رکوع ہوگا' وہی سجود ہوگا' وہی کچھ پڑھا جائے گا' لیکن اس ظاہری شکل میں یکسانیت کے باوجود یقین کی کیفیت کے درجات کی وجہ سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔

حسنِ تہذیب اور اس کی چند مثالیں

زیر مطالعہ حدیث کے ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ)) کہ اللہ تعالیٰ نے ہر معاملے میں خوبصورتی اور اچھا انداز

اختیار کرنا واجب قرار دیا ہے۔ یہ چیز اسلامی معاشرے میں ایک خاص قسم کی تہذیب سے پیدا ہوتی ہے اور یہ تہذیب ہے: ''تہذیبِ نفس'' یعنی ہر کام کو کرنے میں بہتر سے بہتر شکل اختیار کرنے کی کوشش کرنا۔ اسی سے معاشرے کے اندر خوبیاں پروان چڑھتی ہیں اور اسی سے بھلائیوں کی ترقی ہوتی ہے۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے احسان اور حسن تہذیب کی چند مثالیں بیان کرتے ہوئے فرمایا: ((فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ)) ''پس اگر تم کسی کو قتل کرو تو عمدگی کے ساتھ قتل کرو''۔ یہ نہ ہو کہ مارنا آپ نے کہیں تھا' مگر آپ کے اناڑی پن کی وجہ سے وار کہیں پڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلاد ایک پیشہ ہے اور یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ فرض کیجیے کسی شخص کو قصاص میں قتل کیا جانا ہے یا وہ مرتد ہو گیا اور اسے ارتداد کی سزا کے طور پر قتل کیا جانا ہے تو یہ قتل کرنا بھی ایسے ہو کہ ایک ہی وار میں گردن دھڑ سے الگ ہو جائے اور اس کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اس ضمن میں مجھے جگر کا شعر یاد آ گیا۔

میں چوٹ بھی کھاتا جاتا ہوں اور قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہ ہو!

ایک ہی وار میں گردن اڑا دینا' یہ ایک پروفیشنل آدمی ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی کو قتل بھی کرنا ہے تو عمدگی کے ساتھ کرو تاکہ مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس کو تکلیف بھی کم سے کم ہو' اس لیے کہ ان سزاؤں میں مجرم کو تکلیف دینا مقصود نہیں ہوتا۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے یہ سزائیں دنیا والوں کے لیے عبرت کے طور پر رکھی ہیں کہ کوئی شخص اگر قاتل ہے تو وہ اس طور سے سرِعام سب کے سامنے قتل ہو کہ بہت سے لوگ اُس کو دیکھ کر سبق اور عبرت حاصل کریں اور معاشرے سے ناحق قتل کا خاتمہ ہو جائے۔

دوسری مثال آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ)) ''اور جب (کسی جانور کو) ذبح کرنے لگو تو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذبح کرو''۔ آگے اس کی مزید وضاحت کر دی: ((وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ)) ''اور تم میں سے ایک شخص (جو ذبح کر رہا ہو) کو چاہیے کہ وہ اپنی چھری کو تیز کرے اور اپنے ذبیحہ

کو آرام پہنچائے''۔ یہ نہ ہو کہ کُند چُھری آپ کسی جانور کے گلے پر چلا رہے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ جانور کی بھی نفسیات ہے' اس کے بھی احساسات ہیں۔ آپ اگر اس کے ساتھ دھینگا مشتی کر رہے ہیں اور آپ کی چھری کاٹ ہی نہیں رہی تو یہ اس پر ظلم ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم فرمائی کہ جانور کو ذبح کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی چھری کو تیز کرے۔ بکری کا گوشت آپ نے کھانا ہے' وہ آپ کے لیے حلال اور جائز ہے' لیکن اس بکری کو ذبح کرتے ہوئے یہ دھیان رہے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔

حدیث کے راوی صحابہؓ کا تعارف

اب اٹھارہویں حدیث کی طرف آتے ہیں۔ یہ حدیث دو صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ ایک تو حضرت ابوذر غفاری ؓ ہیں۔ ان کے بارے میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ درویش صحابہ اور فقرائے صحابہ میں سے تھے اور ان کے فقر اور ان کی سچائی کی گواہی نبی اکرم ﷺ نے دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا أَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ وَلَا أَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ مِنْ ذِی لَهْجَةٍ أَصْدَقَ وَلَا أَوْفٰی مِنْ أَبِی ذَرٍّ شِبْهِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ))(۱)

''آسمان کے زیرِ سایہ اور روئے زمین پر کوئی شخص ابوذر سے زیادہ زبان کا سچا اور بات کا پکا نہیں ہے۔ ابوذر (اپنے زُہد اور دنیا سے بے رغبتی میں) حضرت عیسیٰ بن مریم کے مشابہ ہیں۔''

ایک موقع پر آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کے بارے میں فرمایا:

((مَنْ سَرَّهُ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی شَبِیْهِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ علیہ السلام خَلْقًا وَخُلُقًا فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ذَرٍّ))(۲)

''جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ وہ صورت و سیرت کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی شبیہہ کو دیکھے تو وہ ابوذرؓ کو دیکھ لے۔''

(۱) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب ابی ذر ؓ۔
(۲) مجمع الزوائد للھیثمی: ۳۳۳/۹' راوی: عبداللّٰہ بن مسعود ؓ۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی تَوَاضُعِ عِیْسٰی فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ذَرٍّ))(۱)

''جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد وتقویٰ دیکھے تو وہ ابوذر کو دیکھ لے۔''

آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا زُہد وتقویٰ انتہائی درجے کا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں خواہش ہو اور وہ یہ دیکھنا چاہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کتنے زاہد تھے تو وہ میرے اس ساتھی ابوذر کو دیکھے۔ یعنی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اندر بھی زہد اس درجے کا تھا جس درجے کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تھا۔

اس حدیث کے دوسرے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ بھی صحابہ کرامؓ میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کا شمار فقہائے صحابہؓ میں ہوتا ہے اور ان کے بارے میں حضور ﷺ کا قول افعل التفضیل (انتہائی مبالغہ) کے صیغے میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَعْلَمُھُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ))(۲) ''میرے صحابہ میں حلال اور حرام کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا معاذ بن جبل ہے۔''

جہاں کہیں بھی ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!

زیر مطالعہ حدیث دو عظیم المرتبت صحابہؓ سے مروی ہے' لہٰذا اس اعتبار سے اس حدیث کی اہمیت بھی زیادہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ)) ''جہاں کہیں بھی ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ ((وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا)) ''اور برائی کے بعد نیکی ضرور کرو تاکہ وہ برائی کو مٹا دے''۔ یعنی اگر تم سے کسی برائی کا صدور ہو جائے تو فوراً اس کے پیچھے کوئی نیکی کا کام کرو تاکہ وہ نیکی اس برائی کو محو کر دے اور تمہارے نامہ اعمال سے اس کو دھو دے۔ ((وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ)) ''اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آیا کرو''۔ یہ وہی تہذیب ہے جس کا میں نے

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی: ۸۷۴۸۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب معاذبن جبل ﷺ.....

ماقبل ذکر کیا تھا۔ یہ اصل میں اسلامی تہذیب وتمدن کے خدوخال کا حسن ہے جو اس قسم کی احادیث پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اب اس حدیث کے مندرجات کا ذرا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔ حدیث کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ)) کہ جہاں کہیں بھی ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اس سے پہلے تقویٰ کے حوالے سے وہ حدیث بھی میں آپ کو سنا چکا ہوں جس میں رسول اللہ ﷺ نے تین ''مُنْجِیَات'' (نجات دینے والی باتوں) میں سے آخری شے: ((خَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ)) فرمائی' یعنی ''اللہ کے خوف اور تقویٰ کو لازم پکڑو چاہے آپ خلوت میں ہوں یا جلوت میں''۔ چاہے آپ علی اعلان کوئی کام کر رہے ہیں جسے دنیا دیکھ رہی ہے یا آپ تنہائی میں کوئی کام کر رہے ہیں جہاں سوائے اللہ کے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں میں تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ مجمع میں کام کر رہے ہوں گے تو آپ کو یہ بھی خیال آئے گا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں' لہٰذا میں کام ٹھیک کروں۔ آپ کی نیت میں ریاکاری نہ بھی ہو تب بھی کسی نہ کسی درجے میں فطری طور پر یہ بات آپ کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے! لیکن آپ تنہائی میں ہیں اور وہاں اگر آپ بہترین انداز اختیار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعتاً تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی جڑیں آپ کی شخصیت کے اندر جمی ہوئی ہیں۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جہاں کہیں بھی ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اگر کوئی برائی ہو جائے تو فوراً اس کے بعد نیکی کرو جو اس کو مٹا دے گی۔

غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں پر عتاب

میں چاہتا ہوں کہ سورۃ التوبہ میں جو بات آئی ہے' اس کے حوالے سے اس کو سمجھ لیں۔ سورۃ التوبہ میں بیان ہوا ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد حضور ﷺ نے غزوہ میں پیچھے رہ جانے والوں سے جواب طلبی بھی کی اور بعض صحابہؓ کو سزا بھی دی جو بغیر کسی عذر کے نہیں گئے تھے۔ منافقین نے تو جھوٹے بہانے بنا لیے اور حضور ﷺ نے بھی گویا ان کو اہمیت نہیں دی اور آپؐ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے' یہ نہیں کہا

کہ تم جھوٹ بول رہے ہو! یہ حضورﷺ کی مروت تھی' شرافت تھی' آپؐ کا اخلاقِ حسنہ تھا۔ لیکن تین اصحاب (کعب بن مالک' ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم) ایسے تھے جنہوں نے مان لیا کہ ہمارا کوئی عذر نہیں تھا' بس ہمارے نفس نے ہمیں بہکایا اور ہم اس غزوہ میں نہ جا سکے۔

ان میں سے ایک صحابی حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جو کتب احادیث اور تفاسیر میں منقول ہے۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہﷺ! جس قدر میں خوشحال اور مالدار اس وقت تھا اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ یعنی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس زادِ راہ نہیں تھا یا میرے پاس سواری نہیں تھی۔ اسی طرح جتنا میں صحت منداس وقت تھا اتنا میں اس سے پہلے نہیں تھا۔ اس سب کچھ کے باوجود میرے نفس نے مجھے یہ کہا کہ رسول اللہﷺ تو ابھی روانہ ہو رہے ہیں اور تیس ہزار کا لشکر ساتھ ہے۔ لشکر تو آہستہ آہستہ چلے گا' جبکہ تمہاری اونٹنی بڑی تیز رفتار ہے اور تم ایک دو دن بعد بھی اگر روانہ ہو گے تب بھی تم حضورﷺ سے جا ملو گے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کا ارادہ نہ جانے کا تھا' بلکہ وہ جانا چاہتے تھے' بس نفس کے دھوکے میں آ کر انہوں نے ایک آدھ دن آرام کے بعد جانے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن نفس نے پھر یہی کہا کہ ابھی حضورﷺ کو وقت لگے گا' لہٰذا تم ایک دو دن اور آرام کر لو' بعد میں تنہا تیزی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو جانا۔ اگلے روز پھر یہی ہوا اور اس کشمکش میں کئی دن گزر گئے۔ چند دن کے بعد انہیں احساس ہوا کہ اب تو میں جتنا بھی تیز جاؤں حضورﷺ تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا آپؓ گھر بیٹھے رہے اور انہوں نے اپنی اس کوتاہی کو مان لیا۔ پھر بعد میں انہیں سزا بھی دی گئی۔☆

اہلِ ایمان کی درجہ بندی میں ''السابقون الاوّلون'' کا بلند مقام

سورۃ التوبہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اہل ایمان کی ایک تقسیم بھی

☆ محترم ڈاکٹر صاحب نے ان تینوں اصحاب کو ملنے والی سزا کا ذکر بیان القرآن' سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۶ کے ضمن میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: ⇐

مذکور ہے۔ سب سے اوپر ہیں: ﴿السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ یعنی مہاجرین اور انصار میں سے جو سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ اب انصار کے السابقون الاولون مہاجرین کے السابقون الاولون سے کم از کم دس پندرہ برس بعد کے لوگ ہیں' اس لیے کہ وہاں ایمان تو پہنچا ہی بہت دیر میں ہے۔ لیکن یہاں پہلے یا بعد میں آنے کا اعتبار زمانی لحاظ سے نہیں ہے' بلکہ اصل میں یہ ایک کیفیت ہوتی ہے کہ جیسے ہی بات سامنے آئے فوراً مان لینا۔ اسی کا نام صِدّیقیّت ہے۔ لہٰذا جس طرح مہاجرین میں صدیق صحابہ تھے اسی طرح سے انصار میں بھی صدیق صحابہ تھے' اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس کی بہت بڑی مثال ہیں۔ چنانچہ مہاجرین اور انصار السابقون الاولون کے درجے میں برابر ہو جائیں گے۔

پھر ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ ''اور وہ

⇐ ''ان تینوں حضرات کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص ان تینوں سے بات نہ کرے اور یوں ان کا مکمل طور پر معاشرتی مقاطعہ (social boycott) ہو گیا' جو پورے پچاس دن جاری رہا۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں اس دوران ایک دن انہوں نے اپنے چچازاد بھائی اور بچپن کے دوست سے بات کرنا چاہی تو اس نے بھی جواب نہ دیا۔ جب انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ کے بندے تمہیں تو معلوم ہے کہ میں منافق نہیں ہوں تو اس نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ چالیس دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر انہوں نے ابھی بیوی کو بھی علیحدہ کر دیا۔ اسی دوران والیٔ غسان کی طرف سے انہیں ایک خط بھی ملا' جس میں لکھا تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے ساتھی آپ پر ظلم ڈھا رہے ہیں' آپ باعزت آدمی ہیں' آپ ایسے نہیں ہیں کہ آپ کو ذلیل کیا جائے' لہٰذا آپ ہمارے پاس آ جائیں' ہم آپ کی قدر کریں گے اور اپنے ہاں اعلیٰ مراتب سے نوازیں گے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی آزمائش تھی' مگر انہوں نے وہ خط تنور میں جھونک کر شیطان کا یہ وار بھی ناکام بنا دیا۔ ان کی اس سزا کے پچاسویں دن ان کی معافی اور توبہ کی قبولیت کے بارے میں حکم نازل ہوا (آیت ۱۱۸) اور اس طرح اللہ نے انہیں اس آزمائش اور ابتلا میں سرخرو فرمایا۔ بائیکاٹ کے اختتام پر ہر فرد کی طرف سے ان حضرات کے لیے خلوص و محبت کے جذبات کا جس طرح سے اظہار ہوا اور پھر ان تینوں اصحابؓ نے اپنی آزمائش اور ابتلا کے دوران اخلاص و استقامت کی داستان جس خوبصورتی سے رقم کی' یہ ایک دینی جماعتی زندگی کی مثالی تصویر ہے۔''

لوگ جنہوں نے ان کی پیروی کی احسان کے ساتھ''۔ یعنی یہ لوگ فوری طور پر تو ایمان نہیں لائے' انہیں ایمان لاتے لاتے کچھ وقت تو لگ گیا' لیکن ان کا ایمان بھی خالص تھا اور وہ بڑے خلوص اور قلب و ذہن کی ہم آہنگی کے ساتھ ایمان لائے۔ اس اعتبار سے (۱) السابقون الاولون' اور (۲) متبعین باحسان تو سب سے اونچے مقام پر ہو گئے اور ان دونوں گروہوں کے لیے ہی اللہ ربّ العزت نے فرمایا:

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝۱۰۰﴾ (التوبۃ)

''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے' اور اس نے ان کے لیے وہ باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی' ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

سب سے نچلا طبقہ منافقین کا ہے!

اعلیٰ ترین مراتب والے اصحاب کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں بالکل نچلی سطح کے لوگوں کا تذکرہ ہو رہا ہے اور وہ درجہ ہے منافقین کا۔ ان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۭ﴾ ''اور تمہارے گرد و نواح کے بعض دیہاتی منافق بھی ہیں''۔۔۔۔ منافقین بعض اوقات یہ کرتے تھے کہ حضور ﷺ سے کہتے کہ ہم سے کوئی صدقہ وصول کر لیں یا ہم سے چندہ لے لیں اور ہمیں اس جہاد پر جانے سے مستثنیٰ کر دیں ۔۔۔۔ واضح رہے کہ غزوۂ تبوک سے پہلے کسی غزوہ کے لیے نفیر عام نہیں تھی' یعنی یہ نہیں تھا کہ ہر مسلمان لازمی نکلے' لہٰذا غزوۂ تبوک سے پہلے اگر ان منافقین کی طرف سے کوئی صدقہ یا کوئی نفقہ پیش کیا جاتا تو حضور اکرم ﷺ اسے قبول کر لیتے تھے' لیکن غزوۂ تبوک کے بعد حضور ﷺ کو ان منافقین کے صدقات قبول کرنے سے روک دیا گیا۔ فرمایا: ﴿قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۝۵۳﴾ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے چاہے دلی آمادگی کے ساتھ خرچ کرو یا مجبوری سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا' اس لیے کہ تم نافرمان لوگ ہو''۔۔۔۔ یعنی تمہارا جو طرزِ عمل ہے اس نے

ثابت کر دیا ہے اور اب اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی ہے کہ تم یقیناً سرکش' باغی اور فاسق لوگوں میں سے ہو۔ اس سے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اور نہیں روکا ہے کسی چیز نے ان کے صدقات ونفقات کو قبول کیے جانے سے' مگر اس لیے کہ حقیقت میں وہ کفر کر چکے ہیں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ۔''

میں بارہا مختلف مواقع پر تفصیل سے یہ بیان کر چکا ہوں کہ منافقین کے بارے میں تدریجاً معاملہ آگے بڑھا ہے--- ہم دیکھتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ میں لفظ منافق اور نفاق نہیں ہے' وہاں صرف مرض کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴿۱۰﴾﴾ ''ان کے دلوں میں (نفاق کا) مرض تھا' پس اللہ نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔ اب اُن کے جھوٹ بولنے کے سبب دُکھ دینے والا عذاب اُن کا مقدر ہے''۔ یعنی یہاں یہ بتا دیا کہ ان کے دلوں میں ایک روگ اور مرض ہے' لیکن واضح نہیں کیا کہ یہ منافقت ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ایک جگہ لفظ ''نفاق'' آ گیا' لیکن سورۃ النساء میں بڑی تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ وہاں یہ بھی فرما دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا کوئی عمل قابل قبول نہیں ہے' اس لیے کہ ان کا طرزِ عمل یہ ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴿۱۴۲﴾﴾ ''منافق (ان چالوں سے اپنے تئیں) اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور (یہ منافق اللہ کو کیا دھوکہ دیں گے' بلکہ) وہ انہی کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر (صرف) لوگوں کو دکھانے کو اور اللہ کی یاد نہیں کرتے مگر بہت کم''۔ یعنی ان لوگوں کا معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا دروازہ اگرچہ بالکل بند نہیں کیا گیا لیکن یہ بتا دیا گیا کہ اب معاملہ سخت ہو جائے گا۔ جبکہ سورۃ التوبہ میں آ کر کہہ دیا گیا کہ اب ان کے لیے توبہ کا دروازہ مکمل طور پر بند ہو چکا ہے اور اب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا استغفار بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ فرمایا:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۸۰) ''(اے نبی ﷺ! برابر ہے کہ) آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو منافقین کے حق میں استغفار کرنے سے روک دیا گیا۔ اس ضمن میں جہاں تک سورۃ التوبہ کا معاملہ ہے تو اس میں گویا مہر ثبت کر دی گئی کہ بظاہر یہ مسلمان بنے ہوئے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان کا پردہ چاک ہو چکا ہے اور یہ پکے منافق ہیں۔ لہٰذا اب ان سے کوئی صدقات اور نفقات قبول نہیں ہوں گے اور آخرت میں ان کا انجام بدترین ہوگا: ﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾﴾ ''ہم انہیں دوہرا عذاب دیں گے پھر وہ لوٹا دیے جائیں گے ایک بہت بڑے عذاب کی طرف۔''

درمیانی درجہ: ضعیف الایمان مسلمان

دیکھئے اہلِ ایمان کی درجہ بندی کے اعتبار سے السابقون الاولون اور متبعین احسان ٹاپ پر ہیں اور سب سے نیچے منافقین ہیں' جبکہ ان کے درمیان میں ایک درجہ ہے جنہیں ہم ''ضعیف الایمان'' کہہ سکتے ہیں۔ اب ایمان کا یہ ضعف مستقل بھی ہوسکتا ہے اور عارضی بھی۔ یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت کسی مسلمان کے ایمان میں ضعف پیدا ہو جائے' جیسے کہ میں نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کی روداد آپ کے سامنے بیان کر دی کہ نفس انہیں بہلاتا رہا کہ کوئی بات نہیں' ابھی دو تین دن اپنے نخلستان کی چھاؤں اور گھر کی آسائشوں سے فائدہ اٹھا لو' پھر تم تیزی کے ساتھ چلنا اور حضور ﷺ سے جا ملنا۔ ان کے اندر منافقت ہرگز نہیں تھی' لیکن ان کا ایمان تو کمزور ہوا ہے۔ وہ تین حضرات جنہوں نے مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے آ کر اپنا قصور مان لیا اور کہا کہ اگرچہ ہم بھی زبان رکھتے ہیں اور ہم بھی باتیں بنا سکتے ہیں ـــــ جیسے منافقین جھوٹے بہانے بنا بنا کر جا رہے تھے اور حضور ﷺ اُن کے جھوٹ کو جانتے ہوئے بھی اپنی شرافت اور مروّت کے تحت انہیں کچھ نہیں کہہ رہے تھے ـــــ یہ

سب ہم بھی کر سکتے ہیں' لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے' اس لیے کہ آج ہم آپ کو اگر کسی طریقے سے راضی کر بھی لیں گے تو کل اللہ کے سامنے کیا جواب دیں گے! تو ایسے ضعیف الایمان اشخاص کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ﴾ (آیت ۱۰۲) ''اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور انہوں نے اچھے اور برے اعمال کو گڈمڈ کر دیا ہے'' —— یوں سمجھئے کہ ہم میں سے بہترین لوگ بھی درحقیقت ضعیف الایمان والے درجے میں آئیں گے اور بہت ہی کم ہوں گے جو اس سے اوپر کے دو درجات یعنی السابقون الاولون اور متبعین احسان میں شامل ہوں۔ ہم میں سے اکثر کا شمار اسی درجے میں ہے' بایں طور کہ ہمیں اپنی غلطیوں' کوتاہیوں اور کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ پھر یہ کہ اگر کوئی برے کام ہم سے صادر ہوتے ہیں تو اچھے اور بھلے کاموں کی بھی اللہ توفیق دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔

آگے فرمایا: ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول فرمائے گا''۔ اس کا دوسرا ترجمہ یوں ہوگا: ''قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی کمال رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا'' —— توبہ کے لغوی معنی پلٹنے کے ہیں اور توبہ کا معاملہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ ایک تو بندہ اپنے گناہوں کی وجہ سے توبہ کرتا ہے۔ گویا اس نے اللہ کی طرف سے پیٹھ پھیر لی تھی اور دوسری طرف رخ کر لیا تھا۔ اب وہ توبہ کرتا ہے' پلٹتا ہے' استغفار کرتا ہے' معافی چاہتا ہے' اور اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ کی طرف دوبارہ اپنا رخ کرتا ہے۔ جب اُس نے اللہ تعالیٰ سے رخ موڑ لیا تھا تو اللہ نے بھی اپنی رحمت کا رخ موڑ دیا تھا' اب اس کی جانب رحمتِ الٰہی کا رخ نہیں رہا تھا۔ جب بندہ پھر اپنی توجہ اللہ کی طرف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا توبہ کا معاملہ یک طرفہ نہیں' بلکہ دوطرفہ ہے۔ چنانچہ ''تَوَّاب'' کا لفظ اللہ کے لیے بھی آیا ہے اور بندے کے لیے بھی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے: ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷﴾ (البقرۃ) ''یقیناً وہ تو بہت توبہ قبول کرنے والا' بہت رحم فرمانے

والا ہے''۔اسی طرح بندے کے لیے بھی ''تَوَّاب'' کا لفظ آیا ہے۔فرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴿۲۲۲﴾﴾(البقرۃ) ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور بہت زیادہ پاک بازی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے''۔ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ))[1] ''تمام بنی آدم انتہائی خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں''—— دیکھئے غلطیاں تو ہر ایک انسان سے ہوتی ہیں اور انسان کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ: اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِّنَ النِّسْيَانِ وَالْخَطَأِ۔یعنی بھول چوک اور خطا یہ دونوں چیزیں انسان کی سرشت کے اندر موجود ہیں' لیکن بہترین خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔

ضعیف الایمان مسلمانوں سے صدقہ قبول کرنے کا حکم

ضعیف الایمان مسلمانوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا:﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ......﴾(التوبۃ:۱۰۳) ''(اے نبی ﷺ!) ان کے اموال میں سے صدقہ قبول کر لیجیے......'' منافقین کے بارے میں تو رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اب ان کی طرف سے کوئی صدقہ' کوئی نفاق' کوئی چندہ قبول نہ کیجیے' اس لیے کہ اب طے ہو چکا ہے کہ ان کے اوپر اسلام کا صرف لیبل لگا ہوا ہے جبکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ لوگ کفر میں داخل ہو چکے ہیں۔لیکن یہ جو اہلِ ایمان اچھے کام بھی کرتے ہیں اور کچھ برے بھی تو آپؐ ان کے اموال میں سے صدقہ قبول کر لیجیے' اس لیے کہ یہ جو صدقہ دے رہے ہیں یہ خلوصِ دل کے ساتھ دے رہے ہیں۔آگے فرمایا:﴿تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ ''اس (صدقے) کے ذریعے سے آپ ان کو پاک کر دیں گے اور ان کا تزکیہ بھی کریں گے''۔ یعنی کسی غلطی اور کوتاہی کی وجہ سے جو بھی کدورت یا کوئی سیاہی آ گئی تھی یا دل پر کوئی داغ لگ گیا تھا تو وہ صاف ہو جائے گا' دھل جائے گا۔﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط﴾ ''اور ان کے لیے دعا بھی کیجیے (یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحمت بھی

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔وسنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب ذکر التوبۃ۔

طلب کیجیے اور استغفار بھی کیجیے)۔ یقیناً آپؐ کا دعا کرنا ان کے لیے تسکین کا موجب ہو گا"۔ یعنی جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ کے نبی نے ہمارے لیے دعا کی ہے تو یہ ان کے زخموں کے اوپر مرہم رکھنے کے مترادف ہو جائے گا۔

زیر مطالعہ حدیث میں بھی فرمایا گیا کہ جب بھی کبھی غلطی ہو جائے' خطا ہو جائے اور کوئی گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو فوری طور پر توبہ بھی کرو اور کسی نیک کام کا اہتمام بھی کرو —— اب یہ نیک کام صدقہ ہے' خیرات ہے' نوافل ہیں یا کسی اور طرح سے دین کی خدمت کے اندر وقت لگانے کا معاملہ ہے —— اس سے یہ ہوگا کہ جو بھی خرابی ہوئی ہے وہ محو ہو جائے گی۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا بہت امید افزا قول ہے :((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ))(۱) "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں"—— اسلام میں تو توبہ کا دروازہ اتنا کشادہ ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا اگر حقیقی مفہوم میں توبہ کر رہا ہے تو وہ بالکل ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں' بلکہ سورۃ الفرقان میں تو یہاں تک آتا ہے : ﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ (آیت ۷۰) کہ جو شخص صحیح معنی میں توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال سے گناہوں کی وجہ سے لگنے والے سیاہ دھبے دھو کر ان کی جگہ پر نیکیوں کا اندراج کر دیتا ہے۔

ہر ایک سے حسن اخلاق سے پیش آنا!

تیسری بات اس حدیث میں یہ بیان کی گئی : ((وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ)) "اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آیا کرو"۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے چند سوالات دریافت کیے۔ جب میں نے سوال کیا کہ سب سے افضل ایمان کون سا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:((خُلُقٌ حَسَنٌ))(۲) "(وہ ایمان سب سے افضل ہے) جس کے ساتھ اخلاقِ حسنہ (یعنی لوگوں کے ساتھ خوبصورتی کے ساتھ پیش آنا) شامل ہو"۔ حضرت

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الزهد' باب ذكر التوبة۔

(۲) مجمع الزوائد للهيثمي: ۵۹/۱ و ۶۶/۱۔

ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا شَیْءٌ اَثْقَلُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ))(۱) ''قیامت کے روز بندۂ مؤمن کے نامہ اعمال میں حسن اخلاق سے زیادہ کوئی عمل بھاری نہیں ہوگا''۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَبَسُّمُكَ فِیْ وَجْهِ اَخِیْكَ لَكَ صَدَقَةٌ))(۲) ''تمہارا اپنے بھائی کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملنا بھی تمہارے لیے صدقہ ہے''۔ یعنی اگر تم اپنے بھائی سے متبسم چہرے کے ساتھ گفتگو کرتے ہو یا کوئی شخص آیا ہے اور آپ نے تبسم کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس سے اس کا بھی دل کھل اٹھا تو یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ کسی کی آمد پر ''عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا'' بنے بیٹھے رہے اور اسے کوئی خوش آمدید اور اَھْلًا وَسَھْلًا بھی نہ کیا تو اسے بھی افسوس ہوگا کہ میں خواہ مخواہ ادھر آ گیا ہوں۔ اور اگر آپ تبسم کے ساتھ' خوشدلی کے ساتھ' اچھے انداز میں اسے خوش آمدید کہیں گے' اُس کا استقبال کریں گے تو یہ حسنِ اخلاق میں سے ہے اور اس پر آپ عنداللہ ماجور بھی ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اگر کوئی آپ ﷺ سے مصافحہ کرتا تھا تو آپ ﷺ اس کا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑے' اس لیے کہ ہاتھ کھینچ لینا مروت وشرافت کے خلاف ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص آپؐ کی طرف متوجہ ہوتا تھا یا آپؐ سے گفتگو کرتا تھا تو آپؐ پوری طرح مڑ کر اس کی بات سنتے تھے۔ یہ نہیں کہ بس ذرا سا رخ ادھر کر لیا' اس لیے کہ اس میں بھی ایک طرح کا تکبر مضمر ہوتا ہے۔

اخلاقِ حسنہ کی اہمیت

اسلامی تعلیمات میں اخلاقِ حسنہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ حضرت

(۱) سنن الترمذی' ابواب البر والصلة' باب ما جاء فی حسن الخلق۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب البر والصلة والآداب' باب ما جاء فی صنائع المعروف۔

عائشہؓ کے حجرے میں تھے کہ آپ کو بتایا گیا کہ فلاں شخص آیا ہے۔ آپؐ نے اس کو اندر بلا لیا—— ظاہر بات ہے وہ حجرہ تو ایک ہی ہوتا تھا' لہٰذا کسی ملاقاتی کے آنے پر حضورﷺ کی زوجہ محترمہ پیٹھ کر لیتی تھیں اور چادر اپنے اوپر لے لیتی تھیں—— حضورﷺ نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا اور اس سے بڑے اچھے طریقے سے گفتگو کی۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا: یارسول اللہ! آپ تو اس شخص کے بارے میں بہت بری باتیں بھی بتاتے رہے ہیں کہ اس میں یہ خرابی ہے' یہ خرابی ہے اور دوسری طرف آپؐ نے اس کا بہت اچھے طریقے سے استقبال کیا ہے' اس کے ساتھ بہت محبت سے گفتگو کی ہے اور اس کا عمدہ اکرام کیا ہے۔ اس پر آپﷺ نے فرمایا کہ اس کا جو بھی معاملہ ہے' اس کے جو بھی کرتوت ہیں' ان کی وجہ سے میں خوش اخلاقی کو کیوں ترک کر دوں؟

زیر مطالعہ حدیث میں بھی یہی فرمایا گیا: ((خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ)) کہ لوگوں کے ساتھ بہترین انداز میں رہو' اخلاقِ حسنہ اور شائستگی کا دامن ہمیشہ تھامے رکھو۔ یہ انداز ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے —— اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ حدیث ''حسن'' ہے اور بعض نسخوں میں آیا ہے کہ ''حسن صحیح'' ہے' یعنی حسن سے بھی اونچا درجہ ہو گیا۔ تو یہ حدیث بہت مستند احادیث میں سے ہے —— اللہ تعالیٰ ہمیں ان چیزوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو ان احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث (19)

استعانت باللہ

(صرف اللہ سے مدد مانگنا)

۲۸/فروری ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝٢ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝٣ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝٧ (الفاتحة)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝١١ (التغابن)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝٢٢ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝٢٣ (الحدید)

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝٦ (الانشراح)

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِیِّ ﷺ یَوْمًا، فَقَالَ:

((یَا غُلَامُ! اِنِّیْ اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: احْفَظِ اللّٰهَ یَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ، وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوْكَ بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْكَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ

كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) [1]

رواه الترمذی وقال حدیث حسن صحیح، وفی روایة غیر الترمذی:

((احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ اَمَامَكَ، تَعَرَّفْ اِلَى اللّٰهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ، وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ، وَمَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَاَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَاَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا))

سیدنا ابوالعباس' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک روز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا تو آپؐ نے فرمایا:

''اے لڑکے! میں تمہیں چند (مفید) باتیں بتاتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ (کے احکام) کی حفاظت کر (اس کے احکام کی پابندی کر) وہ تیری حفاظت کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ (کے احکام) کی حفاظت کر' تو اسے اپنے سامنے پائے گا۔ جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کر۔ جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگ۔ یاد رکھ! ساری دنیا جمع ہو کر تجھے کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ تجھے کسی بات کا فائدہ اور نفع نہیں دے سکتی سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدر کر رکھا ہے' اور اگر سارے لوگ مل کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس نقصان کے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر رکھا ہو۔ قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔'' (ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے)

ترمذی کے علاوہ دوسرے محدثین کی روایت میں یوں ہے:

''تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کر' تو اسے اپنے سامنے پائے گا۔ تو خوشحالی میں اس کی طرف رجوع کر' وہ تنگ دستی کے وقت تیری مدد فرمائے گا۔ یاد رکھو! جو چیز تمہیں نہیں ملی وہ تمہیں مل ہی نہیں سکتی تھی اور جو کچھ تجھے مل گیا اس سے تو محروم نہیں رہ سکتا تھا۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی مدد صبر سے وابستہ ہے۔ اور تکالیف و مصائب کے بعد کشادگی اور فراخی آتی ہے۔ اور تنگی کے بعد آسانی بھی ہوتی ہے۔''

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القيامة والرقائق والورع' باب منه۔

معزز سامعینِ کرام!

امام یحییٰ بن شرف الدین النووی ؒ کے شہرۂ آفاق مجموعۂ احادیث ''اربعین'' کے سلسلہ وار مطالعہ کے ضمن میں آج ہمارے زیر مطالعہ حدیث نمبر۱۹ ہے۔ یہ حدیث روحِ دین کے اعتبار سے ایک بہت ہی اہم سرے سے بحث کرتی ہے —— اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس ؓ ہیں' جن کی کنیت اَبُو الْعَبَّاس ہے۔ یعنی ان کے والد کا نام بھی عباس ہے اور ان کے بیٹے کا نام بھی عباس ہے —— اس حدیث کا لب لباب ہے: ''استعانت باللہ'' یعنی مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مانگو۔ یہ دین کی روح کا ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں نے اسی لیے شروع میں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کی تاکہ آپ کو اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے۔ سورۃ الفاتحہ جو ہماری نماز کا جزوِ لازم ہے' اس کے بارے میں حدیث نبوی ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) (۱)

''جس نے سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔''

چنانچہ ہم ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ فقہ حنفی کے مطابق نماز باجماعت میں صرف امام پڑھتا ہے اور امام کے پڑھنے سے گویا پوری جماعت کی طرف سے ادائیگی ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس پر اتفاق ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہی اصل نماز ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے مضامین کا تجزیہ

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں سورۃ الفاتحہ کے مضامین کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ حدیث قدسی ہے اور حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا ہے'' —— اس کے بعد ساری تفصیل سورۃ الفاتحہ کے مضامین کی ہے۔ ہم نماز میں سورۃ الفاتحہ بھی پڑھتے ہیں اور اس کے بعد قرآن مجید کی کچھ اور آیات بھی پڑھتے ہیں۔ پھر نماز میں قیام بھی ہے' رکوع بھی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی الصلاۃ...... وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ......

ہے‘ سجود بھی ہے اور قعدہ بھی ہے۔ یہ سب کچھ ہے‘ لیکن اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہے — چنانچہ اس حدیث میں اسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ:

((قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ‘ فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ‘ وَاِذَا قَالَ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ‘ وَاِذَا قَالَ ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ قَالَ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ — وَقَالَ مَرَّۃً: فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ — فَاِذَا قَالَ ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ قَالَ ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ‘ فَاِذَا قَالَ ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ قَالَ ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)) (۱)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف حصہ میرے بندے کے لیے ہے) اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اُس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے: ”اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ”مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ“ تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی — اور ایک مرتبہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ”میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا“ — جب بندہ کہتا ہے: ”اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اُس نے مانگا۔ جب بندہ کہتا ہے:

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الصلاۃ‘ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ.....

''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کُل) میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا۔''

سورۃ الفاتحہ کا مرکزی مضمون: عبادت اور استعانت باللہ

سورۃ الفاتحہ میں کل سات آیات ہیں اور عجیب ترتیب ہے کہ تین آیات پر ایک جملہ بنتا ہے۔ دیکھئے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝﴾ تین آیات ہیں اور یہ ایک جملہ ایک ہے۔ پھر آخری تین آیات ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝﴾ بھی ایک جملہ ہیں۔ ان دونوں جملوں کے وسط میں ایک آیت ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝﴾۔ یہ گویا ترازو کی ڈنڈی ہے اور درحقیقت یہ درمیانی آیت ہی سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت ہے اور اس ایک آیت میں دو مکمل جملے ہیں۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ بھی مکمل جملہ ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ بھی مکمل جملہ ہے اور درمیان میں ''واوَ'' گویا ترازو کی مٹھ کے مترادف ہے۔

اس مرکزی آیت میں دو اہم مضامین کا بیان ہے' ایک تو ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ''اے اللہ! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے''۔ یہ حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ دوسری اہم بات ہے: ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ''اے اللہ! ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔ گویا جو صلاۃ کا مرکزی نکتہ ہے وہی درحقیقت دین کا مرکزی نکتہ ہے۔ اربعین نووی کی حدیث ۳ کے مطالعہ کے دوران اس بات پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے کہ عبادت کا تصور کیا ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جنّوں اور انسانوں کو بس اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ اور تمام رسولوں کی دعوت کا مرکزی نکتہ بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت تھی اور ہر پیغمبر اپنی قوم کو یہی کہتا تھا: ﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ﴾ (ھود: ۲٦) ''کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو!'' شیخ

سعدی نے کہا تھا:

زندگی آمد برائے بندگی　　زندگی بے بندگی شرمندگی

پھر ہم نے اس میں کنفیوژن پیدا کر دیا کہ عبادت کو عبادات کے مترادف قرار دے دیا۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ عبادات ہیں' لیکن وہ ''عبادت'' جس کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا' وہ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ عبادت تو یہ ہے کہ پوری زندگی میں ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ جہت اللہ کی اطاعت کرنا' جبکہ نماز ہر وقت تو نہیں پڑھی جاتی اور روزہ ہر روز تو نہیں رکھا جاتا۔ لہٰذا عبادت سے مراد یہ عبادات نہیں ہو سکتیں۔ درحقیقت یہ عبادات اس عبادت کے لیے مددگار ہیں۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ عبادت چھت کی مانند ہے اور یہ چار عبادات چھت کو مدد دینے والے ستون ہیں۔ ستونوں کی معنویت تب ہی ہو سکتی ہے جب ان کے اوپر ایک عمارت استوار ہو' ورنہ بغیر چھت کے چار ستون کھڑے کر دینا چہ معنی دارد! اسی طرح شامیانے کو سہارا دینے کے لیے بانس کھڑے کیے جاتے ہیں اور اگر شامیانہ ہی نہیں ہے تو پھر بانس کس کام کے؟

دُنیوی معاملات میں کسی سے مدد مانگنا

سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت کا ایک مرکزی موضوع ''عبادت'' ہے' جبکہ اس کا دوسرا مرکزی موضوع ''استعانت باللہ'' ہے جو ہماری آج کی زیر مطالعہ حدیث میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس ضمن میں آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ سے مدد مانگنے کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایک ہے ''استعانت'' یہ لفظ اس حدیث میں بھی آیا ہے اور سورۃ الفاتحہ میں بھی۔ اسی طرح استمداد: مدد طلب کرنا' استنصار: نصرت مانگنا' استدعا: کسی کام کے لیے دعا کرنا' استغاثہ: کسی کی دہائی دینا۔ یہ تمام الفاظ ایک قبیل کے ہیں اور ان سب میں جامع لفظ ''استعانت'' ہے۔

استعانت ایک تو عام مادی دنیا کے امور کے اندر ہے' جیسے میں آپ سے کہوں: بھئی! مجھے پانی پلا دینا۔ اگرچہ یہ بھی ایک طرح کی استعانت ہی ہے کہ میں نے اپنی ایک ضرورت پورا کرنے کے لیے آپ سے مدد چاہی' لیکن اس میں کوئی شرک اور کوئی برائی

نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ آپؐ کبھی ایسے کام کے لیے بھی کسی کو نہیں کہتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر آپؐ سواری پر ہوتے اور آپؐ کا کوڑا نیچے گر جاتا تو آپؐ اپنی سواری کو بٹھا کر یا سواری سے نیچے اُتر کر خود کوڑا اٹھاتے تھے' کسی سے کہتے نہیں تھے کہ ذرا اٹھا دو۔ یہ تو بڑے اونچے درجے کی بات ہے' لیکن عام حالات میں' مادی قوانین کے تحت اگر ہم کسی سے کوئی مدد چاہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی شرک ہے۔ اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک اس کا بھی ایک درجہ ہے' وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

فرشتوں اور دیوی' دیوتاؤں سے مدد مانگنا

استعانت کے حوالے سے دوسری بات یہ ہے کہ ماورائی انداز میں کسی غیر مرئی حقیقی یا غیر مرئی موہومہ شخصیت سے مدد مانگنا صحیح نہیں ہے۔ غیر مرئی حقیقی سے مراد فرشتے اور غیر مرئی موہومہ سے مراد دیوی دیوتا (gods and godesses) ہیں جو لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ سب غیر مرئی ہیں اور لوگوں نے ان کو پوجنے کے لیے ان کی تصویریں بنالی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ جو تصویریں' مجسمے اور بت بنائے ہیں یہ صرف توجہ کے ارتکاز کے لیے ہیں تاکہ ہم یکسوئی سے مراقبہ کر سکیں' ہمیں بھی پتا ہے کہ ان بتوں میں کچھ نہیں ہے۔ ایک عام جاہل دیہاتی بے چارہ یہی سمجھتا ہوگا کہ ان بتوں میں ہی سب کچھ ہے' یہی ہمارے معبود ہیں' لیکن جو پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ ہندو ہیں اُن کا عقیدہ یہی ہے کہ یہ بت کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ہیں۔ بھارت کا سابقہ صدر ڈاکٹر رادھا کرشن جو بہت بڑا فلسفی تھا' اس کی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ''انڈین فلاسفی'' ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ ہم ان بتوں کو بااختیار نہیں سمجھتے' یہ تو صرف توجہ کو مرتکز کرنے (concentration) کے لیے ہم نے ان کو بنایا ہے تاکہ ان کے ساتھ ایک ذہنی اور روحانی رشتہ قائم کر کے گیان دھیان اور یک سوئی حاصل کر سکیں۔

بہرحال میں نے بتایا کہ غیر مرئی حقیقی اور غیر مرئی موہومہ سے مدد مانگنا صحیح نہیں ہے۔ غیر مرئی حقیقی میں فرشتے بھی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے ساتھ ہر وقت کراماً

کاتبین موجود ہیں' لیکن میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذرا میری یہ مشکل دور کر دو۔ یہ شرک ہو جائے گا۔ اسی طرح بہت سے فرشتے اس وقت ہمارے اس مجمع کو بھی گھیرے ہوئے ہیں۔ حضورﷺ کی حدیث ہے:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ تَعَالٰی یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ اِلاَّ نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جب بھی کچھ لوگ جمع ہوتے ہیں' قرآن کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کے لیے تو آسمان سے ان پر سکینت نازل ہوتی ہے' اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے' اور فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اُن (یعنی ملائکہ مقرّبین) سے کرتا ہے جو اُس کے پاس ہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ اے فرشتو! تم کہتے تھے نا کہ یہ آدم جس کو میں خلیفہ بنا رہا ہوں یہ دنیا میں فساد مچائے گا' دیکھو میرے بندے تو میرا ذکر کر رہے ہیں۔ بہرحال فرشتے موجود ہیں اور ان پر ہمارا ایمان بھی ہے' لیکن ان سے مدد نہیں مانگی جا سکتی۔

دیوی دیوتا: ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل

اس ضمن میں نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ اصل میں یہ جو دیوی دیوتا (gods and godesses) بنا لیے گئے ہیں یہ بھی ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ میں سے ہر ایک کو الگ الگ کام کے اوپر مامور کیا ہوا ہے۔ مثلاً کوئی پہاڑوں کا فرشتہ ہے' کوئی بارش کا فرشتہ ہے' مختلف فرشتوں کے ذمے مختلف کام ہیں۔ انہوں نے انہی فرشتوں کو اپنا دیوتا بنا لیا۔ اُن کو غلطی یہ لگی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ فرشتوں کو ان کاموں میں اختیار حاصل ہے' جبکہ ہمارا ایمان ہے کہ فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید واضح طور پر فرما دیا گیا ہے: ﴿......لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب فی ثواب قراءۃ القرآن۔

مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾(التحریم) ''...... (فرشتے) اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔ ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔ بس یہ باریک سا پردہ ہے جس سے صرفِ نظر کرنے سے ''ایمان بالملائکہ'' بگڑ کر دیویوں اور دیوتاؤں کی شکل اختیار کر گیا۔ عرب کے لوگوں نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنا ڈالا۔ ان کے نام پر انہوں نے لات' منات اور عُزیٰ بنا ڈالے۔ یہ سب مؤنث نام ہیں اور ان کے نزدیک یہ دیویاں اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

اولیاء اللہ سے مدد مانگنا

غیر مرئی حقیقی کے بارے میں جو بات میں نے آپ کے سامنے ابھی بیان کی وہ متفق علیہ ہے کہ فرشتے موجود ہیں' مگر ان سے مدد نہیں مانگی جاسکتی۔ اس بارے میں ایک بات مختلف فیہ ہے اور وہ یہ کہ غیر مرئی حقیقی میں فرشتوں کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ کی ارواح بھی شامل ہیں۔ اگر امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نہ ہوتا تو میں کبھی اس کو تسلیم نہ کرتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بڑے محبوب بندوں کے انتقال کے بعد ان کی ارواح کو بھی فرشتوں کے درجہ اسفل یعنی سب سے نچلے درجے کے فرشتوں میں شامل کر لیتا ہے اور پھر وہ ارواح بھی اللہ کے احکام کی تنفیذ فرشتوں کی طرح کرتی ہیں۔ اب یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے' سب کے نزدیک متفقہ نہیں ہے' کیونکہ اس کے لیے ہمیں قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ملتی۔ لیکن شاہ ولی اللہ کہہ رہے ہیں تو ہم اسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ اس اختلاف کے باوجود اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان کو بھی پکارا نہیں جائے گا اور ان سے مدد بھی طلب نہیں کی جائے گی۔ وہ بے شک اللہ کی سول سروس کے اندر بھرتی ہو گئے' لیکن وہ بااختیار نہیں ہیں—— ہمارے ہاں بھی سول سروس کے کیڈرز (cadres) ہیں' جیسے ریونیو کے محکمے میں آپ پٹواری سے چلیں گے تو گرداور' اس سے اوپر نائب تحصیل دار' پھر تحصیل دار اور پھر اس سے اوپر کے عہدے ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کے بھی درجے ہیں: طبقہ اسفل' طبقہ اعلیٰ—— اگر اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی ارواح کو بھی اپنی سول سروس میں شامل کر دے تو ہمیں کیا اعتراض ہے اور اس کو ماننے

سے کوئی شرک لازم نہیں آئے گا۔ البتہ اگر ہم انہیں پکاریں گے تو شرک لازم آ جائے گا۔
یہ بہت نازک سا فرق ہے کہ ہم فرشتوں کو مانتے ہیں' مگر انہیں پکار نہیں سکتے' ان سے مدد نہیں مانگ سکتے۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی ارواح کے بارے میں خواہ آپ مانتے بھی ہوں کہ اللہ نے ان کو ملائکہ کی آخری صف میں بھرتی کر لیا ہے ــــ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور دوسرے اولیاء اللہؒ کی ارواح اب بھی کہیں آ سکتی ہیں' روحِ محمدی (ﷺ) بھی آ سکتی ہے' لیکن ہم روحِ محمدی (ﷺ) یا اولیاء اللہؒ کی ارواح کو پکاریں گے نہیں۔ تو یہ ذرا باریک سا فرق ہے۔ ہمارے ہاں اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا تو بہت سے لوگ انکار کر دیتے ہیں کہ روح آ ہی نہیں سکتی' یا یہ کہ پھر ان سے دعائیں' استدعا' استغاثہ شروع کر دیتے ہیں۔ تو یہ دونوں انتہائیں ہو جاتی ہیں۔

دنیوی کام میں مسلسل مدد مانگنا

میں نے قبل ازیں یہ بتایا تھا کہ مادی قوانین کے تحت دنیوی کاموں میں ایک دوسرے سے مدد مانگی جا سکتی ہے' لیکن اس کا بھی ایک درجہ ہے۔ آپ نے دنیوی قوانین کے تحت کسی شخص سے ایک کام کہا۔ فرض کیجیے' آپ کسی سے کہتے ہیں کہ فلاں جگہ پر میری سفارش کر دیجیے۔ میرا یہ مسئلہ صد فیصد درست ہے' لیکن میرا مدعا علیہ یا میرا مدمقابل زیادہ چرب زبان ہے یا اس نے کوئی لمبی چوڑی سفارش فراہم کر لی ہے تو آپ بھی میری بات وہاں پر رکھ دیں ــــ اچھی شفاعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب رکھا ہے' سورۃ النساء میں آیا ہے: ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ﴾ (آیت ۸۵) ''جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا'' ــــ اب آپ کے ایک دفعہ کہنے پر اس نے آپ کا کام نہیں کیا' دوسری دفعہ کہنے پر بھی نہیں کیا' تیسری دفعہ آپ نے اسے پھر وہی کام کہا تو اس ضمن میں ایک بزرگ کا ایک قول میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اب یہ ایک درجے میں شرک ہو جائے گا۔ ایک دو دفعہ تو ٹھیک ہے' لیکن اس پر اصرار کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ یقین کر لیا ہے کہ آپ کی خیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور یہ شرک خفی ہو جائے گا۔ تو یہ باتیں بھی

سمجھنے کی ہیں۔ بعض اوقات آدمی کسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور مسلسل کہتا رہتا ہے' جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اس کی بھلائی اسی شخص کے ہاتھ میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی چند نصیحتیں

اس تمہید کے بعد اب ہم حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا ''ایک دن میں نبی اکرم ﷺ کے پیچھے تھا''۔ پیچھے ہونے سے کیا مراد ہے؟ گمانِ غالب ہے کہ سواری پر پیچھے بیٹھا تھا جس کو ردیف بھی کہتے ہیں' یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چلتے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہے ہوں۔ اس کیفیت میں حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: ((يَا غُلَامُ! إِنِّيْ أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ)) ''اے لڑکے! میں تمہیں چند کلمات کی تلقین کرتا ہوں (یعنی چند نصیحتیں کرتا ہوں)''۔ یہ حضور ﷺ کا طریقہ تربیت اور تعلیم وتزکیہ تھا۔ وہاں کوئی مدرسے نہیں تھے' وہاں کوئی درس وتدریس کی محفلیں نہیں ہوتی تھیں۔ محفل تو ہفتہ میں ایک ہی ہوتی تھی اور وہ جمعہ کا اجتماع ہوتا تھا۔ باقی حضور ﷺ کی صحبت ہے' فجر کی نماز کے بعد آپؐ بیٹھے ہیں تو صحابہ بھی بیٹھ گئے' کچھ گفتگو ہو رہی ہے۔ اسی میں تربیت' اسی میں تعلیم اور اسی میں تزکیہ ہوتا تھا۔ ضربیں مارنے کے لیے علیحدہ قسم کے حلقے نہیں ہوتے تھے۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ یہ بہت بعد کی ایجاد ہے' اس لیے یہ مسنون نہیں ہیں۔ بہرحال حضور ﷺ نے فرمایا: اے نوجوان' اے لڑکے' اے بیٹے! (حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی ہیں اور عمر میں بہت چھوٹے ہیں' اسی لیے آپؐ نے انہیں يَا غُلَامُ! سے خطاب فرمایا۔) میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں' توجہ اور غور سے سنو اور انہیں حرزِ جان بنا لو!

پہلی نصیحت: پہلی بات آپ ﷺ نے یہ فرمائی: ((اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ)) ''اللہ کی حفاظت کرو' وہ تمہاری حفاظت کرے گا''۔ اللہ کی حفاظت سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ کے احکام کی حفاظت کرو' بایں طور کہ اللہ کا کوئی حکم ٹوٹنے نہ

پائے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کو اپنے دل میں محفوظ رکھو یعنی اس کی یاد اور ذکر سے خانہ قلب کو خالی نہ ہونے دو تو اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہیں یاد رکھے گا۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (آیت ۱۵۲) ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ حدیث قدسی میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِيْ وَأَنَا مَعَهُ حِيْنَ يَذْكُرُنِيْ، فَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِي نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ، وَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ)) (۱)

''میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر جماعت کے سامنے اسے یاد کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کی محفل ملاءِ اعلیٰ میں ملائکہ مقربین کی ہے۔ امیر خسروؒ نے پتا نہیں کس کیفیت میں یہ شعر کہا ہے: ؎

خدا خود میرِ محفل بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

یعنی رات میں جہاں تھا وہ تو لامکاں کی محفل تھی اور اس محفل میں میرِ محفل اللہ تعالیٰ تھا اور شمعِ محفل محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ بہرحال اللہ کو تم اپنے دل میں مستحضر رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی یاد رکھے گا۔

ذکر اللہ کے معنی ہی **استحضار اللّٰہ فی القلب** (اللہ کو دل میں حاضر کرنا) ہیں اور جنہیں ہم ذکر سمجھ بیٹھے ہیں وہ تو ذکر کے ذریعے ہیں۔ جیسے نماز کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾﴾ (طٰہٰ) ''اور نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ چنانچہ

(۱) سنن الترمذی، ابواب الدعوات، باب فی حسن الظن باللہ عزوجل۔

نماز ذکرِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ نے عشاء کی سترہ رکعتیں بھی پڑھ لی ہوں اور رب کی یاد آپ کو پھر بھی نہ آئی ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ ایک مکینیکل انداز میں اُٹھک بیٹھک کر رہے ہیں اور آپ کی زبان سے (ٹیپ ریکارڈر کے انداز میں) نماز کے الفاظ نکل رہے ہیں' لیکن آپ کے شعور اور دل کی گہرائی سے ان کا کوئی رابطہ ہے ہی نہیں۔ وہ ذکر تو نہیں ہوا' ہاں نماز فرض تھی تو آپ کا فرض ادا ہو گیا۔ لہٰذا جنہیں ہم نے ذکر سمجھ لیا ہے وہ تو ذکر کے ذرائع ہیں۔ زبان سے اللہ اللہ' سبحان اللہ سبحان اللہ کرنا اس لیے ہے تاکہ اس کے نتیجے میں ذکر حاصل ہو جائے۔

دوسری نصیحت: رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو دوسری نصیحت یہ فرمائی:

((اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ تُجَاھَکَ)) ''اللہ کو یاد رکھو تو اُسے اپنے سامنے موجود پاؤ گے''۔

زیر مطالعہ حدیث کے حوالے سے یہ یاد رکھیے کہ اس حدیث کو بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے۔ یہ متن جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں یہ امام ترمذی کی نقل کردہ روایت کا ہے اور ان کا قول ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس متن کے علاوہ ایک اور متن بھی امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں درج کیا ہے اور اُس دوسرے متن میں بیان کی گئی پہلی بات وہی ہے جو یہاں بیان ہوئی ہے' بس ایک لفظ کا فرق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ اَمَامَکَ)) ''تو اللہ (کے احکام) کی حفاظت کر پس تو اسے اپنے سامنے پائے گا'' —— وہاں تُجَاھَکَ تھا' یہاں اَمَامَکَ ہے۔ مطلب ایک ہی ہے: ''اپنے سامنے'' —— یعنی وہ تو دل میں ہے' جب چاہو اس سے مخاطب ہو جاؤ' جب چاہو اس سے دعا کرو اور جب چاہو اُس سے مانگو۔ جیسے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی!

چنانچہ سورۂ قٓ میں فرمایا گیا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ یعنی اللہ تو تمہارے دل میں موجود ہے' لہٰذا تم اپنے دل میں اسے تلاش کرو۔ وہ جو بیدل نے کہا ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

یعنی بڑے ستم کی بات ہے کہ تم اپنی خواہش پوری کرنے کی خاطر باغیچے میں جاؤ اور پھولوں کی سیر کرو' یہ گلاب کا پھول ہے' یہ موتیا ہے۔ تم خود کسی غنچے سے کم باصلاحیت نہیں ہو' تم تو خود ایک پھول ہو' اللہ کا بنایا ہوا اشرف المخلوقات پھول۔ تم اپنے دل کا دروازہ کھولو اور اس کے اندر جو چمن آباد ہے اس کی سیر کرو! وہ کیا ہے؟ وہ روح ہے۔ قلب مسکن ہے روح کا!

تیسری نصیحت: رسول اللہ ﷺ نے تیسری بات یہ فرمائی: ((اِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ)) ''جب مانگو تو اللہ سے مانگو''۔ غیر اللہ کے سامنے دستِ سوال مت دراز کرو۔ دنیوی قواعد و قوانین کے تحت کسی سے مدد مانگنا یا مدد چاہنا حرام نہیں ہے' البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر آپ اس پر اصرار کریں گے تو اس میں شرک کی بدبو پیدا ہو جائے گی۔ لیکن عام حالات میں باہم سوال کرنے اور مدد کرنے پر دنیا قائم ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے ساتھ ہی یہ دنیا چل رہی ہے' لیکن اونچا مقام یہ ہے کہ سوائے اللہ کے کسی سے سوال مت کیا جائے۔ یہاں تک کہ جوتے باندھنے کا تسمہ بھی اگر آپ کو درکار ہے تو وہ بھی اللہ سے مانگو۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال دے اور وہ آ کر تمہیں تسمہ پیش کر دے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگا کر رکھنے والے ہیں ان کے ساتھ بسا اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ دل میں ایک بات آئی اور اسی وقت کسی شخص نے آ کر وہ بات پوری کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں' وہ جب چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو انسانی شکل میں بھیج دے جو آپ کی تکلیف کو رفع کر دے یا آپ کی ضرورت کو پورا کر دے۔ لہٰذا اُسی سے مانگو' کسی اور سے مت مانگو۔ یہی توحید کا لُبِ لُباب ہے۔

چوتھی نصیحت: اگلی بات آپ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ)) ''اور جب مدد مانگو تو صرف اللہ سے مانگو''۔ استعانت میں وہ سارے الفاظ

آ جائیں گے جو میں نے ابتدا میں بیان کیے۔ لہٰذا استمداد' استعانت' استدعا' استغاثہ' یہ سب صرف اور صرف اللہ سے ہو۔

اسلام کی جڑ ایمان ہے۔ یعنی اسلام کا جو خارجی نظامِ عمل ہے' چاہے انفرادی اعمال ہوں یا اجتماعی' ان سب کی روحِ رواں ایمان ہے' اور ایمان کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب ایمان باللہ ہے۔ ویسے تو ایمان میں ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ' ایمان بالملائکہ' ایمان بالرسل' ایمان بالکتب اور ایمان بالقدر شامل ہے' لیکن ایمان کا لُبِّ لُباب اور روح ''ایمان باللہ'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ایمانِ مجمل'' میں سوائے ایمان باللہ کے اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

یہ ''ایمانِ مجمل'' ہے' یعنی اجمالی طور پر ایمان اس کا نام ہے۔ ہاں ''ایمانِ مفصل'' یعنی تفصیلی طور پر ایمان یہ ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

الغرض اسلام کا سارا نظامِ عمل' چاہے انفرادی اعمال ہوں یا اجتماعی' ان سب کی روحِ رواں ایمان ہے اور ایمان کا خلاصہ ہے ایمان باللہ۔ اور پھر ایمان باللہ کا اصل حاصل وہ ہے جو زیر مطالعہ حدیث میں آ رہا ہے۔ یعنی ایمان باللہ کے دو تقاضے ہیں: (i) عبادت صرف اللہ کی' اور (ii) استعانت صرف اسی سے۔

پانچویں نصیحت: زیر مطالعہ حدیث کے دوسرے متن میں ان چار باتوں کے علاوہ ایک اور اہم بات کا تذکرہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَعَرَّفْ اِلَی اللّٰہِ فِی الرَّخَاءِ یَعْرِفْکَ فِی الشِّدَّۃِ)) ''کشادگی کے وقت میں تم اللہ کو یاد رکھو تو وہ تنگی کے وقت تمہیں یاد رکھے گا''۔ یعنی تمہاری کسمپرسی کی حالت میں تمہاری مدد فرمائے گا۔ ویسے تو ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھنا چاہیے' لیکن رسول اللہ ﷺ نے خصوصی طور پر کشادگی اور

خوشحالی کے اوقات میں اللہ کو یاد کرنے کی تلقین فرمائی۔ اس بارے میں بہادر شاہ ظفر کے اشعار میں سے بہت زبردست شعر ہے: ؎

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیے گا' ہو وہ کتنا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا!

لہٰذا کشادگی کی حالت میں اللہ کی طرف رجوع کیے رکھنا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب تمہیں کوئی تکلیف ہوگی تو وہ تکلیف کو تم پر آسان کر دے گا۔ اگر کوئی تکلیف تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو وہ آ کر رہے گی' لیکن اللہ تعالیٰ اس کی شدت کو کم کر دے گا۔ ایک ہی چیز ہے جس کو ایک انسان بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے اور دوسرا اس تکلیف کو اتنی شدت سے محسوس نہیں کر رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے شخص کے لیے اس تکلیف کی شدت میں کمی کر دی ہے۔

نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ ہے!

زیر مطالعہ حدیث کا آخری ٹکڑا تقدیر سے متعلق ہے' جبکہ تقدیر کا تفصیلی بیان حدیث۴ کے مطالعہ میں بھی گزر چکا ہے۔ حدیث۴ بہت عظیم حدیث ہے اور اس کے مطالعے میں ہم نے کئی خطاباتِ جمعہ صرف کیے تھے۔ اس حدیث کی ابتدا میں انسان کی حقیقت کا بیان ہے اور آخر میں ایمان بالقدر کا تذکرہ ہے۔ جبکہ زیر مطالعہ حدیث میں تقدیر کا موضوع دوبارہ آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا: اے میرے بیٹے' میرے بچے' اے عزیز! ((اِعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوْكَ بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ)) ''جان لو' اگر سب لوگ جمع ہو کر تمہیں کسی شے کا نفع اور فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ تمہیں کچھ نفع نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو تمہارے لیے اللہ نے لکھ دیا ہے''۔ جب اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ انسان کو اُس کی تقدیر کے مطابق ہی ملے گا تو پھر غیر اللہ سے مانگنا تو فعل عبث ہو گیا' اس لیے کہ ان کے ہاتھ میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا یہ جان لو' اس بات پر یقین کر لو کہ اگر دنیا کے سب لوگ مل کر یہ چاہیں کہ تمہیں کوئی نفع پہنچا دیں تو وہ تمہیں کسی طرح کا بھی نفع نہیں پہنچا سکتے سوائے اس

کے جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔

آپ اندازہ کیجیے کہ جس شخص کا یقین اس سطح کا ہو تو اس میں کتنا استغناء ہوگا۔ پھر وہ کسی کے سامنے پیشانی نہیں رگڑے گا' ہاتھ نہیں پھیلائے گا' اپنی عزتِ نفس کو ہتھیلی پر رکھ کر پیش نہیں کرے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر آپ نے کسی سے سوال کیا تو آپ نے اپنی عزتِ نفس اس کے سامنے پیش کر دی۔ اب وہ چاہے تو اس کا کچھ لحاظ کر لے' چاہے تو آپ کی عزتِ نفس کو ٹھوکر مار دے۔ لہٰذا جب بھی مانگو تو صرف اللہ سے مانگو اور مدد بھی صرف اسی سے طلب کرو' اس لیے کہ نفع پہنچانے کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے' جبکہ تمام لوگ مل کر بھی تمہیں وہ نفع نہیں پہنچا سکتے جو اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھا ہی نہیں۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْكَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْكَ اِلاَّ بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْكَ)) ''اور اگر سب مل کر چاہیں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیں تو وہ تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا ہی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے''۔ اگر انسان میں اس بات کا یقین پیدا ہو جائے تو پھر خوف کی جڑ کٹ جائے گی' اس لیے کہ یہ خوف اور حزن دونوں سے نجات دلانے والی شے ہے۔ جو حقیقی مؤمن ہے وہ اللہ کا ولی ہے اور اولیاء اللہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿٦٢﴾﴾ (یونس) ''سن رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔''

جان لیجیے کہ اولیاء اللہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے' ان کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ یہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں' لیکن عام لوگوں سے ان کا فرق یہ ہے کہ یہ حقیقی مؤمن ہوتے ہیں۔ ان اعتبارات سے' جو آج ہم پڑھ رہے ہیں' اگر کسی شخص کا ایمان اس درجے کو پہنچ گیا ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے اور اسے کسی بات کا خوف نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اسے یہ یقین ہوگا کہ کسی کے ہاتھ میں میرے نفع وضرر کا کوئی اختیار ہے ہی نہیں' اگر اللہ نے میرے لیے کچھ نقصان لکھ دیا ہے تو وہ ہو کر رہے گا۔ میں کسی کی لاکھ منت سماجت کروں' جو اللہ نے میرے لیے لکھ دیا ہے تو وہ آ کر رہے گا۔ لہٰذا کاہے کو میں کسی کے سامنے گڑگڑاؤں'

کاہے کو کسی کے سامنے جگ ہنسائی کراؤں۔ اسی طرح اگر کسی کے ہاتھ میں میرا خیر ہے ہی نہیں تو کاہے کو میں اس کی خوشامد کروں!

حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) ''(دیکھو نوجوان!) قلمیں اٹھالی گئی ہیں اور صحیفوں (کی سیاہی) خشک ہو چکی ہے''۔ یہ ہے اللہ کا وہ علم قدیم جس میں ہر شے لکھ دی گئی ہے اور اس کے قلم اٹھا لیے گئے ہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ تین گھنٹے کا امتحان ہوتا ہے اور وقت ختم ہوتے ہی امتحان گاہ میں ممتحن کی آواز گونجتی ہے: "stop writing!" تو اس پر قلم رک جاتے ہیں۔ اسی طرح تقدیر لکھنے والا قلم بھی اب اٹھالیا گیا ہے اور جن صحیفوں پر تقدیر لکھی گئی ہے وہ خشک بھی ہو گئے ہیں۔ اب ان میں کسی قسم کا کوئی ردّ و بدل نہیں ہوسکتا۔

ملے گا وہی جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے!

زیر مطالعہ حدیث کے دوسرے متن کے چند جملوں کا تذکرہ پہلے متن کے ضمن میں ہو چکا ہے' جبکہ باقی متن کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) ''اور جان لو کہ جو چیز تم سے چھوٹ گئی ہے وہ ہرگز تمہیں ملنے والی نہیں تھی''۔ مثلاً آپ نے کسی ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔ آپ نے اپنی سی محنت کر لی' لیکن وہ ملازمت آپ کو نہیں ملی۔ اب آپ افسوس' رنج اور غم میں بیٹھے ہوئے ہیں سوچ رہے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا تھا' فلاں بڑی تگڑی سفارش لے آیا تھا' فلاں نے رشوت دے دی تھی' وغیرہ وغیرہ۔ چھوڑو میاں! ان سب سوچوں کو' بس یہ یقین کر لو کہ وہ نوکری تمہارے لیے تھی ہی نہیں۔ کاہے کو اپنے ذہن کے اندر یہ کھچڑی پکا کر خواہ مخواہ سوءِ ظن میں مبتلا ہو رہے ہو؟ کسی نے رشوت نہ دی ہو اور آپ سمجھتے ہیں کہ اس نے رشوت دی ہے' تو یہ سوءِ ظن ہو گیا اور سورۃ الحجرات میں سوءِ ظن کو گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (آیت ۱۲)

''اے اہل ایمان! بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو' اس لیے کہ بعض گمان گناہ

ہوتے ہیں۔''

آگے آپﷺ نے فرمایا: ((وَمَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ)) ''اور جو تکلیف تم پر آ گئی ہے وہ کبھی بھی تم سے چوکنے والی نہیں تھی''۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ تم پر نہ آتی۔ انسان سوچتا ہے کہ میں یہ کر لیتا تو شاید ایسا ہو جاتا' میں نے ٹیکا پہلے لگوا لیا ہوتا تو بیماری اس انتہا تک نہ پہنچتی۔ بھئی جو ہونا تھا وہ ہونا ہی تھا۔ یہ وہ چیز ہے جس سے انسان میں تسلیم و رضا پیدا ہوتی ہے۔ ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی!

اے اللہ! جو تو نے چاہا وہ مجھے بہر صورت قبول ہے۔ اسی لیے میں نے شروع میں سورۃ التغابن کی یہ آیت تلاوت کی تھی:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ﴾

''کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے' اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔''

اس ہدایت سے مراد ہے تسلیم و رضا: ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

اے اللہ! تیری طرف سے آنے والی ہر مشکل مجھے قبول ہے۔ بظاہر اس سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے' لیکن یقیناً اس میں میری کوئی بھلائی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا گیا: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ (آلِ عمران: ٢٦) ''(اے اللہ!) تیرے ہاتھ میں تو خیر ہی خیر ہے۔''

یہ مضمون سورۃ الحدید (آیت ۲۲'۲۳) میں زیادہ بڑے پیمانے پر آیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ ''کوئی مصیبت نہیں آتی نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں''۔ مثلاً زمین میں زلزلہ آ جانا' سیلاب آ جانا' یا زمین کا دھنس جانا۔ اسی طرح کسی کو کوئی بخار ہو گیا' کوئی اور تکلیف ہو گئی' اچانک

معلوم ہوا کہ ان صاحب کو کینسر ہے اور کینسر بھی اب تیسری سٹیج پر پہنچ چکا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے علم قدیم میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ ﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ﴾ ''مگر ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے: ﴿لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو تم سے جاتا رہے''۔ کوئی عزیز فوت ہوگیا یا کوئی مالی نقصان ہوگیا تو اس پر افسوس مت کرو۔ ﴿وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ ؕ﴾ ''اور جو اللہ تمہیں دے دے اس پر مت اتراؤ''

صبر اور مدد' تنگی اور کشادگی' مشکل اور آسانی ساتھ ساتھ ہیں!

زیر مطالعہ حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے تین اہم حقیقتیں بیان فرمائیں۔ پہلی حقیقت آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاعۡلَمۡ اَنَّ النَّصۡرَ مَعَ الصَّبۡرِ)) ''اور جان لو! اللہ کی مدد صبر کے ساتھ آتی ہے''۔ جو بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف سے آئے اسے اس طور سے جھیلو کہ زبان پر کوئی بھی کلمۂ شکوہ و شکایت نہ آئے۔ مولانا محمد علی جوہر ایک مرتبہ جیل میں گئے تو اُن کی ایک بیٹی بیمار ہوئی اور فوت ہوگئی۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ جیل میں گئے تو دوسری بیٹی کو بھی وہی بیماری لگ گئی۔ جیل میں اطلاع ملی تو اشعار کی شکل میں خط لکھا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے:

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن
اُس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی نہیں منظور

یعنی اے بیٹی! ہم تو چاہتے ہیں کہ تجھے شفا ہو جائے' لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو ہمیں بھی منظور نہیں۔ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!''

دوسری حقیقت رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاَنَّ الۡفَرَجَ مَعَ الۡکَرۡبِ)) ''اور تکالیف و مصائب کے بعد کشادگی اور فراخی آتی ہے''۔ فرج کے معنی ہیں: کسی چیز کا کھل جانا' کشادگی ہو جانا۔ یہ کشادگی' کرب اور تکلیف کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی اللہ نے دنیا کا قانون بنایا ہے۔ آپ اندازہ کیجیے کہ بچے کی ولادت میں ماں کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے' لیکن جیسے ہی بچے کو لا کر ماں کے برابر لٹایا جاتا ہے تو ماں کی ساری تکلیف

ختم ہو جاتی ہے اور اُسے ایک عظیم راحت میسر آ جاتی ہے۔

تیسری حقیقت آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا)) ''اور مشکل کے بعد آسانی ہوتی ہے''۔ اسی لیے میں نے سورۃ الانشراح کی دو آیات بھی پڑھی تھیں: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۝﴾ ''(سن لو!) مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے (اور) بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے''۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنایا ہے کہ سختیاں جھیلنی ہی پڑتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ۝﴾(البلد) ''ہم نے انسان کو مشقت کے اندر پیدا کیا ہے''۔ لہٰذا مشقت تو کرنی پڑے گی' اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی کی جسمانی مشقت زیادہ ہے اور کسی کی ذہنی مشقت زیادہ ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث کے مندرجات پر اس کی روح کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
20
21

اسلام میں شرم وحیا اور استقامت کی اہمیت

۲۸/مارچ ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ؗ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (القصص)

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (التوبة)

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ عُقْبَةَ بْنِ عَمْرٍو الْاَنْصَارِیِّ الْبَدْرِیِّ ؓ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :

((اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)) (۱)

سیدنا ابومسعود عقبہ بن عمرو انصاری بدری ؓ سے روایت ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’سابقہ نبوت کے کلام میں سے لوگوں نے جو باتیں پائی ہیں‘ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب تم حیا چھوڑ دو تو جو دل چاہے کرو!‘‘

عَنْ اَبِیْ عَمْرٍو ‘ وَقِیْلَ اَبِیْ عَمْرَةَ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ ؓ ‘ قَالَ : قُلْتُ : یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! قُلْ لِّیْ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب اذا لم تستحی فاصنع ما شئت

فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا ' لَا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا غَیْرَكَ ' قَالَ :

((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) (۱)

سیدنا ابوعمرو (یا ابوعمرہ) سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' میں نے کہا: یارسول اللہ! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی واضح بات فرمائیں کہ اس کے متعلق مجھے آپ کے علاوہ کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم کہو میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا' اور پھر اس پر ثابت قدم رہو!''

معزز سامعین کرام!

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور مجموعہ احادیث ''اربعین نووی'' کے سلسلہ وار مطالعہ کے ضمن میں آج دو احادیث (حدیث ۲۰ اور ۲۱) ہمارے زیر مطالعہ آئیں گی۔ یہ دونوں احادیث انتہائی مختصر مگر اپنے موضوع کے حوالے سے جامع ترین ہیں۔ پہلی حدیث حضرت ابومسعود عقبہ بن انصاری بدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' جو بدری صحابی ہیں اور ان کا تعلق انصار سے ہے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں شامل کیا ہے۔

زیر مطالعہ حدیث اور اس کی تشریح

حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰى)) ''نبوتِ اولیٰ (یعنی پہلے انبیاء کرام علیہم السلام) کے کلام میں سے جو چیز لوگوں نے پائی ہے یا جو اُن کے پاس محفوظ ہے''—— ظاہر بات ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک سلسلۃ الذہب ہے اور ہم اللہ کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی تعلیمات میں کچھ تحریف بھی ہوئی' اور کچھ نسیان کا شکار بھی ہو گئیں کہ لوگوں نے اُن کی تعلیمات کو بھلا دیا۔ بہرحال ان کی تعلیمات کے کچھ نہ کچھ اثرات اُس وقت یعنی دورِ نبویؐ میں بھی موجود تھے اور وہ حکمت کے موتیوں کی طرح سے لوگوں کے اندر مشہور تھے۔ انہی میں سے ایک موتی وہ ہے جس کی نشاندہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ))

''جب تم حیا کا پردہ اٹھا دو تو پھر جو چاہو کرو!''

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب جامع الاوصاف الاسلام

خوف اور حیا کا مرکز: انسانی دماغ کا اعلیٰ ترین حصہ

زیر مطالعہ حدیث درحقیقت ایک بہت بڑی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے — حیا کے بارے میں ایک اور حدیث بہت مشہور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ))(۱) ''حیا ایمان کی ایک شاخ' ایک شعبہ ہے''۔ یعنی حیا ایمان کا حصہ ہے۔

میں اس کی مزید وضاحت کر رہا ہوں کہ حیا زندگی کا جزوِ لازم ہے' اس لیے کہ حیات اور حیا کا مادہ ایک ہی (ح ی ی) ہے۔ اصل میں ہمارا مرکزی اعصابی نظام (Central Nervous System) ہمارے دماغ (Brain) اور حرام مغز (Spinal Cord) پر مشتمل ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں چل رہا ہے۔ دماغ میں اعلیٰ ترین حصہ سیریبرم (cerebrum) ہے۔ یہ گرے میٹر (gray matter) کہلاتا ہے اور رنگ دار سا پیلا سا مادہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے نیچے ایک سفید حصہ ہوتا ہے۔ دماغ کے اندر جو مختلف ایریاز ہیں' وہ منقسم ہیں۔ دیکھنے (vision) کا ایریا ہماری پشت پر ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ دیکھنا آنکھ سے ہوتا ہے۔ آنکھ دیکھتی ضرور ہے' مگر سمجھ نہیں سکتی' تشریح (interpret) نہیں کر سکتی' اس لیے کہ یہ تو ایک کیمرے کی مانند ہے۔ اس کے لینز کے سامنے جو کچھ آیا اس نے اس کی تصویر اتار دی۔ اب اس تصویر کا سمجھنا' اس کی تشریح کرنا' اس کا تجزیہ کرنا اور پھر اس سے نتیجے نکالنا' یہ آنکھ کا کام نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے انسانی دماغ میں ایک خاص ایریا مختص ہے جو اس گرے میٹر کا پچھلا حصہ ہے۔ وہ تمام چیزیں جو ہماری آنکھ دیکھتی ہے وہاں جا کر' اس کمپیوٹر میں interpret ہوتی ہیں۔

اسی طرح میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ انسانی دماغ کے اندر ''سپیچ سنٹر'' سب سے بڑا اور اہم ایریا ہے۔ انسان حیوانِ ناطق ہے' اسے اللہ نے نطق کی صلاحیت دی ہے۔ انسان اظہار مافی الضمیر بھی کر سکتا ہے اور دوسرے انسان کی بات بھی سمجھ سکتا ہے۔ گویا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب امور الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان عدد شعب الایمان......

نطق وہ چیز ہے جو انسان کو حیوانات سے ممیّز کرتی ہے۔اس کے بھی انسانی دماغ میں دو علاقے ہیں' ایک بائیں جانب اور دوسرا دائیں جانب۔ایک کا کام یہ ہے کہ وہ کسی اور کے کلام کو سمجھتا ہے' اس کی تشریح و تجزیہ کرتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ نکالتا ہے' جبکہ دوسرے ایریا کا کام یہ ہے کہ وہ خود انسان کے اپنے مافی الضمیر کو واضح کرتا ہے' بیان کرتا ہے۔تو یہ دونوں حصے سپیچ سنٹر کے ہیں۔لیکن سیر یبرم کا جو سب سے اعلیٰ (highest) حصہ ہے وہ fear & shyness center ہے یعنی خوف اور حیا کا حصہ۔

حیا اور حیات کا خصوصی تعلق

اس ضمن میں نوٹ کیجیے کہ حیا کا حیات کے ساتھ خصوصی تعلق ہے' اس لیے کہ حفظِ ذات (preservation of the self) سب سے بڑا محرک (motive) ہے اور یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔اس کے بعد ہے اپنی نسل کو برقرار رکھنا (preservation of the species)۔اس کے لیے آدمی شادیاں کرتا ہے اور پھر اولاد اور اپنے کنبے کے سو جھمیلوں کو برداشت کرتا' اس کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔یہ سب اس لیے کرتا ہے کہ اپنی نسل کو برقرار رکھنا' اس کو بچانا اس کے فطری اور جبلی داعیات (instincts) میں سے ہے۔البتہ اپنے آپ کو بچانا یعنی حفظ ذات اہم ترین محرک ہے' اور اس کے یہ دو فنکشنز ہیں: خوف اور حیا (fear & shyness)۔یعنی خطرہ ہے تو اس سے اپنا بچاؤ کرنا' شیر آ رہا ہے تو بھاگو' دوڑو۔یہ خوف ہے۔اسی طرح حیا اور جھجک بھی درحقیقت انسان کے دماغ اور سیر یبرم کے اعلیٰ ترین حصے کا جزو ہے۔

شراب کا اوّلین اثر: حیا اور خوف کا خاتمہ

اس ضمن میں میں ایک اور حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں۔دیکھئے' شراب کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ انسانی دماغ کی تمام سطحوں (levels) کو رفتہ رفتہ ناک آؤٹ کرتی ہے' ایک دم سارے دماغ کو متاثر نہیں کرتی۔مثلاً آپ نے تھوڑی سی شراب پی لی ہے تو خوف اور جھجک (حیا) دونوں جاتے رہیں گے۔اس سے انسان میں جرأت و بہادری

(boldness) پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ شراب پی کر ایک مقرر بڑی عمدہ تقریر کرے گا' ورنہ مقرر کو احساس یا خدشہ ہوتا ہے کہ میری تقریر کا پتا نہیں لوگ کیا اثر لے رہے ہوں گے' دل میں اس کا کوئی مذاق اڑا رہا ہوگا' وغیرہ۔ یہ خدشات و احساسات ایک مقرر کو قدم قدم پر روکتے ہیں' لیکن جب جھجک ختم ہوگئی تو اب اس کے ذہن سے یہ سارے خدشات ختم ہوجائیں گے اور وہ بہت عمدہ تقریر کرے گا۔ اسی طرح اگر کوئی بہت بڑا وکیل ہے تو شراب پی کر جو وہ مقدمے کی پیروی کرے گا وہ بغیر شراب کے نہیں کر سکتا۔ اسی طور سے لڑائی کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ سب اُس وقت ہے جب شراب کی مقدار کم ہو۔ اور اگر شراب کی مقدار زیادہ ہوجائے گی تو پھر وہ نچلی سطحوں کو بھی متاثر کرے گی اور ڈپریشن پیدا کرے گی اور پھر یہ ڈپریشن دماغ کے ساری سطحوں کو نقصان پہنچاتا چلا جائے گا۔ البتہ شراب کا پہلا کام خوف اور حیا کو ختم کرنا ہے۔ اس سے مقرر اچھی تقریر کرے گا اور شاعر اچھے اشعار کہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے کے سارے بڑے شاعر' غالب ہو یا کوئی اور' اس لال پری سے جی بہلاتے تھے۔ اقبال بھی ابتدائی دور میں شراب پیتے تھے۔ جگر نے تو خود کہا ہے: ؎

سب کو مارا جگر کے شعروں نے اور جگر کو شراب نے مارا

اس لیے کہ شراب تو گویا ان کی گھٹی میں تھی' لیکن پھر ایک وقت آیا کہ جگر موت سے کافی پہلے تائب ہوئے اور توبہ کرنے کے بعد پھر جو شاعری انہوں نے کی ہے وہ بڑی نفیس اور بہت روحانی پہلو لیے ہوئے تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی جو غزلیں مشہور ہیں وہ تو اُسی شراب نوشی کے دور کی ہیں۔ الغرض' خوف اور حیا کے ختم ہونے سے مقرر اچھی تقریر کرے گا' وکیل اچھے دلائل دے گا اور شاعر اچھی شاعری کرے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ شراب کے زیر اثر انسان بالکل ہی نڈر اور بے حیا ہوجاتا ہے۔

اس اعتبار سے حیا (shyness) بہت اہم شے ہے' اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان کا حصہ ہے اور اس کی مزید تشریح میں' میں نے بتایا کہ درحقیقت یہ حیات کا جزوِ لازم ہے' بایں طور کہ انسان اپنی حیات کو بچانے کے لیے خوف اور حیا کے میکنزم کا استعمال کرتا ہے۔

عورت میں حیا کا مادہ زیادہ ہے!

یہ خالقِ کائنات کی حکمتِ تخلیق ہے کہ اُس کی طرف سے حیا کا مادہ مرد کی نسبت عورت میں زیادہ رکھا گیا ہے۔ مرد اپنی جسمانی ساخت' اپنی صلاحیتوں اور functions جو اسے دیے گئے ہیں' ان کی رو سے فعال اور متحرّک (active) ہوتا ہے' اقدام کرتا ہے' جبکہ عورت گریز کرتی ہے۔ عورت کے نسوانی حسن کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ گریز کرے' اور اگر عورت میں بھی اقدام آ جائے تو پھر اس کی وہ نسوانیت ختم ہوگئی اور وہ بھی مرد ہوگئی۔ اس لیے کہ عورت کی خلقت میں شرم و حیا اور گریز کا عنصر ہے۔ کوئی بھی معاملہ ہو' چاہے وہ عام طور پر جس کو ہم عشقِ مجازی کہتے ہیں' اس میں بھی اقدام مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ مرد طالب ہوتا ہے اور عورت مطلوب ہوتی ہے۔ تو یہ مادہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے اندر زیادہ رکھا ہے اور یہ عورت کے نسوانی حسن کا سب سے بڑا زیور اور سب سے بڑا حصہ ہے۔

سورۃ القصص میں اس کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے ــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے چل کر مدین تک پہنچے ہیں اور اس دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورا صحرائے سینا عبور کیا ہے۔ کوئی سواری کیا' کوئی شے پاس تھی ہی نہیں' اور یہ سانپوں سے بھرا ہوا صحرا تھا۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے محل میں کروائی تھی۔ وہ اس طرح کہ فرعون بے اولاد تھا' اور جب دریائے نیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ صندوقچہ برآمد ہوا جس میں ان کی والدہ نے اللہ کے حکم کے تحت انہیں ڈال کر اسے نیل کے اندر بہا دیا تھا تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے لگا تھا۔ اس لیے کہ وہ پہچان گیا تھا کہ یہ اسرائیلی ہے اور وہاں پر ہر اسرائیلی بچے کو مار دینے کا قانون رائج تھا۔ اس پر اُس کی بیوی آڑے آ گئی۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسی موہنی صورت دی تھی کہ جو دیکھتا تھا وہ آپ پر فریفتہ ہو جاتا تھا۔ اس بارے میں سورۂ طٰہٰ میں بڑے پیارے الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾ (آیت ۳۹) ''(اے موسیٰؑ) ہم نے آپ کے اوپر اپنی محبت کا ایک پرتو ڈال دیا تھا''۔ لہٰذا آپ کی موہنی صورت دیکھ کر اس کی اہلیہ حضرت آسیہ سلام علیہا جو بنی اسرائیل میں سے تھیں' حضرت

موسیٰ علیہ السلام پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئیں اور فرعون کو ان کے قتل کے ارادے سے باز رکھا ـــ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التحریم میں اہل ایمان عورتوں کے لیے حضرت آسیہ کی مثال دی ہے۔فرمایا:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١١﴾﴾

''اور مؤمنوں کے لیے (ایک) مثال (تو) فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی کہ اس نے اللہ سے التجا کی کہ اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشت مآل) سے نجات بخش اور ظالم لوگوں کے ہاتھ سے مجھ کو مخلصی عطا فرما۔''

چنانچہ حضرت آسیہ نے کہا: ﴿قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (القصص:۹) ''یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا' اس کو قتل نہ کرنا' شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں''۔فرعون اور آسیہ کے مابین بڑی موافقت اور اُلفت تھی' چنانچہ فرعون نے ان کی بات مان کر یہ بچہ انہیں گود لینے کی اجازت دے دی۔اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں محل میں پلے' بڑھے۔اس کے بعد فرعون کے ہاں بھی ایک لڑکا پیدا ہو گیا' اس طرح اب یہ گویا دو بھائی ہو گئے اور دونوں نے بھائیوں کی طرح پرورش پائی۔جب فرعون بڑھاپے کو پہنچا تو اُس نے تخت چھوڑ دیا اور اپنے سگے بیٹے کو اس کا وارث بنا دیا۔اس کے بعد کیا ہوا؟ اس حوالے سے قرآن مجید اور تورات کا بیان ذرا مختلف ہے۔

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک مخبر نے یہ خبر دی کہ اے موسیٰ! بادشاہ کے دربار میں تمہارے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' لہٰذا یہاں سے نکل بھاگو!
﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢٠﴾﴾ (القصص) ''اُس نے کہا: اے موسیٰ! (شہر کے) سردار تمہارے بارے میں صلاح مشورہ

کر رہے ہیں کہ تمہیں مار ڈالیں‘ سو تم یہاں سے نکل جاؤ‘ میں تمہارا خیر خواہ ہوں’’۔ اس مخبری پر حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً ہی مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا کی طرف چلے گئے اور پورا صحرائے سینا عبور کیا۔ اس ضمن میں تورات کا بیان ذرا مختلف ہے۔ یورپ میں ‘‘Ten Commandments’’ کے نام سے جو فلم بنی ہے وہ تورات کے بیان پر ہے‘ اس لیے کہ وہ تو تورات ہی کو مانتے ہیں۔ اس میں یہ ہے کہ اسی چھوٹے بھائی (فرعون) نے اپنی رتھ (chariot) پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سوار کرایا اور صحرا کے کنارے لا کر چھوڑ دیا‘ پھر بڑی نفرت کے ساتھ کہا: جاؤ‘ اب نبوت انسانوں پر نہیں صحرا کے اندر موجود سانپوں پر کرو!

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام سارے صحرا کو عبور کر کے تھکے ماندے‘ بھوکے پیاسے مدین پہنچے اور وہاں ایک پانی کے کنویں کے پاس جا کر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ دو لڑکیاں کنویں کے ایک طرف کھڑی ہیں اور اپنے ریوڑ کو پانی پینے سے روک رہی ہیں۔ بکریاں پانی کی طرف دوڑتی ہیں اور وہ انہیں روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ تم اپنے ریوڑ کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے والد بوڑھے ہیں اور یہ چرواہے بڑے سخت دل ہیں۔ لہٰذا جب تک یہ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر نہ چلے جائیں ہم اپنے ریوڑ کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلالی مزاج کے آدمی تھے‘ لہٰذا وہ کنویں کے پاس گئے اور چرواہوں اور ان کے جانوروں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر ان لڑکیوں کے ریوڑ کو پانی پلایا اور وہ اپنا ریوڑ لے کر چلی گئیں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور انہوں نے اس وقت یہ دعا مانگی: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ ‘‘اے میرے پروردگار! میں تو تیری ہر اُس خیر اور خیرات کا مستحق ہوں جو تُو میری جھولی میں ڈال دے’’۔ یہ فقر کی انتہا ہوتی ہے۔ ایک فقیر کہتا ہے کہ میں نے ایک روپیہ نہیں لینا‘ پانچ روپے لینے ہیں۔ یعنی وہ نخرہ کرتا ہے‘ جبکہ اس کے مقابلے میں ایک فقیر وہ ہے جو کہتا ہے کہ ایک دھیلا بھی اگر آپ میری جھولی میں ڈال دو تو میں اس کا بھی مستحق ہوں‘ اس لیے

کہ میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے رب! تو جو بھی خیر میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں' اس لیے کہ اس اجنبی جگہ پر میرا کوئی جاننے پہچاننے والا نہیں ہے' میرے پاس کوئی ذریعہ کوئی وسیلہ نہیں اور میں ہر شے کا فقیر ہوں۔

دوسری طرف اُن لڑکیوں نے گھر جا کر اپنے والد کو سارا واقعہ بتایا۔ اب ان میں سے ایک لڑکی اپنے والد کا پیغام لے کر جب آئی تو اس کی چال ڈھال کے لیے قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں' ان کے لیے میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سارا واقعہ آپ کو سنایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ﴾ ''پس آئی ان دونوں میں سے ایک لڑکی حیا کے ساتھ چلتی ہوئی''۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عورت کے چلنے میں بھی حیا ہے۔

مغرب عورت کی حیا کو ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے!

اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں جو بھی عناصر رکھے ہیں' ان میں مرد کے مقابلے میں حیا کا پہلو بہت قوی ہے' جس کو مغرب آج ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ مغرب حیا کے پردے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس وقت دنیا میں اس کے لیے جو عظیم تحریک چل رہی ہے' اس کو ''سوشل انجینئرنگ پروگرام'' کا دل فریب نام دیا گیا ہے۔ یعنی سوسائٹی اور معاشرہ کی تعمیر نو کرنی ہے' اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عورت میں سے حیا کو باہر نکال دو۔ مغرب میں عورت کی بے پردگی کا معاملہ کوئی بہت پرانا نہیں ہے' بلکہ زیادہ سے زیادہ سو' سوا سو سال پرانا ہے۔ امریکہ کی پرانی فلموں میں عورت مکمل لباس زیب تن کیے ہوتی تھی' یعنی گردن سے لے کر ٹخنے تک' سوائے چہرے کی ٹکیا کے اور سر پر ان کے یقیناً سکارف ہوتا تھا۔ یہ جو سکرٹس اور منی سکرٹس آنی شروع ہوئی ہیں ان کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔

۱۸۹۷ء میں ''پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زائن'' کی پہلی کانفرنس سوئٹزرلینڈ کے شہر Basel میں ہوئی تھی' جہاں ٹاپ کے یہودی جمع ہوئے تھے اور ان میں سے بیشتر یہودی بینکرز تھے۔ Zionist مومنٹ بھی یہودی بینکرز کی تحریک ہے اور وہ مذہبی

یہودی نہیں ہیں، بلکہ سیکولر ٹائپ کے یہودی ہیں۔ مذہبی یہودی وہ ہیں جو کبھی آپ نے کسی فلم یا اخبارات میں دیکھے ہوں گے یا آپ امریکہ گئے ہوں تو آپ نے وہاں دیکھا ہوگا کہ بروک لین کا علاقہ ان سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی چھلے دار زلفیں ہوتی ہیں۔ عام طور پر جہاں سے خط بنایا جاتا ہے وہاں سے وہ اپنے بالوں کو پھیلاتے ہیں اور بہت خوبصورت انداز میں چھلے دونوں طرف لٹکا لیتے ہیں۔ ان کی داڑھیاں لمبی ہوتی ہیں۔ سر ننگے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سر کے اوپر چھوٹی سی ٹوپی نہیں بلکہ پورا ہیٹ ہوتا ہے اور وہ بھی سیاہ رنگ کا۔ اسی طرح انہوں نے سیاہ اُچکن کی طرز کا لمبا کوٹ پہنا ہوتا ہے۔ یہ ہیں مذہبی یہودی۔ لیکن سوئٹزرلینڈ کے شہر Basel میں جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ سب سیکولر تھے اور بینکرز کے نمائندے تھے۔ نوعِ انسانی کے لیے انہوں نے جو چیزیں طے کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شرم و حیا کا جنازہ نکال دیا جائے تاکہ انسان حیوان بن جائے اور پھر ہم ان حیوانوں کو استعمال کر سکیں۔ یہ ان کا فلسفہ ہے کہ سوائے یہودیوں کے تمام بنی آدم انسان نما حیوان ہیں، یعنی شکل تو انسانوں کی سی ہے لیکن درحقیقت سب حیوان ہیں۔ چنانچہ غیر یہودی انسانوں کے لیے وہ goy`ims اور gentiles کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جیسے حیوان کو استعمال کرنا عام انسان کا حق ہے ـــــ گھوڑے کو تانگے میں اور بیل کو ہل میں جوتا جاتا ہے ـــــ اسی طرح ہمارا حق ہے کہ ہم انسان نما حیوانوں کو بھی اسی طرح استعمال کریں۔ اور یہ بات ان کی باقاعدہ مذہبی تعلیمات میں شامل ہے۔

یہودیوں کی مذہبی کتاب ''تالمود'' جو اصل میں فقہ کی کتاب ہے اور مذہبی اعتبار سے بہت اہم ہے، اس میں یہ مذکور ہے کہ غیر یہودیوں کو دھوکہ دینا، ان سے سود وصول کرنا، ان کے مال پر ڈاکہ ڈالنا، چوری کرنا وغیرہ جائز ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ بایں الفاظ موجود ہے: ﴿قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ (آل عمران: ۷۵) ''وہ کہتے ہیں کہ ان اُمیوں کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے''۔ چنانچہ آزادیٔ نسواں (Women Lib) کے نام پر شرم و حیا کو ختم کرنے کی ایک عظیم تحریک

اس وقت سے چل رہی ہے۔ لیکن ہم پاکستانیوں کے لیے انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ پرویز مشرف کی حکومت نے ساری دنیا سے آگے بڑھ کر اس تحریک کو لبیک کہا۔ اس لیے کہ تمام اداروں' یعنی سینٹ میں' پارلیمنٹ میں اور اس سے نیچے یونین کونسلوں میں ۳۳ فیصد عورتوں کی نمائندگی مقرر کر دینا' عورتوں کو گھر سے نکالنے کا اتنا بڑا کام پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں کہیں نہیں ہوا۔ آج تک امریکہ اور یورپ میں بھی ایسا نہیں ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں جمہوریت کا وجود ایک معجزہ ہے۔ معجزہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دنیا میں یہ مانا جاتا ہے کہ کم شرح خواندگی میں ڈیموکریسی نہیں چل سکتی۔ لوگوں کے اندر خواندگی ہونی چاہیے' تعلیم ہونی چاہیے' تب ڈیموکریسی چل سکتی ہے۔ جبکہ بھارت انتہائی کم شرح خواندگی کے ساتھ اس بہترین انداز سے جمہوریت چلا رہا ہے کہ دنیا دیکھ کر حیران ہو رہی ہے' لیکن ان کے ہاں بھی عورتوں کی نمائندگی کی شرح ۳۳ فیصد نہیں ہے' صرف چند عورتیں ہیں جو پارلیمنٹ میں آ جاتی ہیں۔ امریکہ کے اندر بھی گنی چنی عورتیں جنرل الیکشن جیت کر آ جاتی تھیں' جیسے ہمارے ہاں جنرل الیکشن جیت کر بے نظیر آ جاتی تھی اور اس طرح سے چند ایک اور عورتیں بھی آ جاتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں تھا کہ ۳۳ فیصد سیٹیں عورتوں کے لیے مختص کی جائیں اور خواتین سے ہی اُن کو پُر کرنے کو لازم قرار دے دیا جائے۔

اس وقت بے حیائی کی اشاعت یو این او کے ایجنڈے پر ہے۔ چنانچہ اس کے لیے پہلی کانفرنس قاہرہ میں ہوئی تھی۔ پانچ سال کے بعد بیجنگ کانفرنس اور پھر بیجنگ پلس فائیو کانفرنس ہوئی۔ یہ تمام کانفرنسیں اقوامِ متحدہ کے تحت ہوئی ہیں اور وہاں طے ہوا ہے کہ شرم وحیا جو عورت کا سب سے بڑا زیور ہے' اسے ختم کیا جائے۔ اس وقت مغرب کا معاشرہ اور مغرب کی ساری طاقت اسی پر لگی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں تو شرم وحیا ختم ہو چکی ہے اور بے حیائی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا سے بھی حیا کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسے اگر کسی بلی کی دم کٹ جائے تو وہ یہی چاہے گی کہ سب بلیوں کی دُمیں کٹ جائیں' ورنہ وہ تو تمام بلیوں کے اندر ''نکو'' بنی رہے گی۔ اسی طرح مغربی

ممالک بھی پوری نوعِ انسانی سے حیا کے زیور کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اصل میں یہ ایجنڈا یہودیوں کا ہے جس کے آلہ کار عیسائی بن رہے ہیں اور عیسائیوں میں سے بھی خاص طور پر White Anglo Saxon Protestants (WASP) فرقہ اس میں پیش پیش ہے۔ پھر اس فرقے کی بھی اعلیٰ سطح کی کلاس Evengelists (جن کو ''نیوکانز'' بھی کہا جاتا ہے) اسرائیل کے سب سے بڑے سپورٹر ہیں اور ان کے پروگرام کی تکمیل میں یہ سب سے بڑے آلہ کار ہیں۔ واضح رہے کہ wasp ''بِھڑ'' کو کہتے ہیں جس کے کاٹنے سے جسم سوج جاتا ہے۔

بچوں پر روک ٹوک لگانا از حد ضروری ہے

آج کل مغرب کے اثر کے تحت یہ سوچ عام ہوگئی ہے کہ بچوں پر کوئی روک ٹوک نہ لگاؤ' اس لیے کہ یہ بات ان کی نشوونما (development) میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ سوچ سراسر حماقت ہے اور یہ حضور اکرم ﷺ کی تعلیم کے برعکس ہے۔ ہمیں تو یہ تعلیم ملی ہے کہ اپنی چھڑی کو کبھی اٹھا کر نہ رکھ دینا' بلکہ اولاد کو سیدھا رکھنے کے لیے اس کو استعمال کرنا ہے۔ اولاد کو محبت بھی بھرپور دو' لیکن ساتھ ہی ان پر کڑی نظر رکھو۔ جیسے ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ ''کھلاؤ تو چُوری چُور کے اور دیکھو گھور کے''۔ بچوں کے اوپر جب تک بڑوں کا رعب نہ ہو' بڑوں کا خوف نہ ہو' بڑوں کی حیا نہ ہو کہ میرے اس کام پر والد کیا کہہ دیں گے تو ہمارے نزدیک ان کی صحیح انسانی نشوونما (human development) نہیں ہوتی۔ وہ بچے جنہیں آپ جری' بے شرم' بے حیا اور بے ادب بنا دیتے ہیں وہ پھر آپ کے سینے پر مونگ دلتے ہیں' آپ کے بڑھاپے کے اندر سوہانِ روح بنتے ہیں۔ ان کے اندر کہاں سے وہ آداب آ جائیں گے اور کہاں سے وہ تہذیب آ جائے گی جو بچپن میں اگر انہیں نہ سکھائی گئی ہو؟ اسی طرح نماز کے بارے میں حکم ہے کہ بچے کو سات سال کی عمر سے نماز کی تلقین شروع کر دو اور دس برس کے بعد بھی اگر بچہ نماز نہیں پڑھتا تو اس کو مارو۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ملاحظہ ہو:

((مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ

اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ)) (۱)

''اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جائیں' اور جب دس برس کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو۔ اور ان کے بستر بھی الگ کر دو۔''

لہٰذا جدید چلڈرن سائیکالوجی کی بڑی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ ہے کہ بچوں کو روک ٹوک کرنے سے ان کے اندر جو آزاد شخصیت کے پروان چڑھنے کا امکان ہوتا ہے' وہ ان میں کم ہو جاتی ہے تو انہیں روکو ٹوکو نہیں' وہ جو چاہے کریں۔ ایسی سوچ سراسر حماقت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

بہرحال زیر مطالعہ حدیث انتہائی اہمیت کے حامل ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے اندر یہ بات موجود تھی کہ جب تم نے حیا کا پردہ اٹھا دیا تو جو چاہو کرو۔ اس لیے کہ یہی تو بیریئر تھا' یہی تو روک ٹوک کی بات تھی۔ فارسی میں اس کا بہترین ترجمہ ہے: ''بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن!'' یعنی ایک دفعہ ذرا حیا کا پردہ اٹھا دو تو جو چاہو کرتے پھرو!

استقامت اور اس کے ثمرات

اب ہم اگلی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سیدنا ابوعمرو (یا ابوعمرہ) سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' میں نے کہا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قُلْ لِّيْ فِي الْاِسْلَامِ قَوْلًا ' لَا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا غَيْرَكَ ''اے اللہ کے رسولﷺ! مجھے اسلام کے بارے میں ایک بات ایسی بتا دیجیے کہ پھر مجھے کسی سے کچھ اور پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہے''۔ اس کا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے ایسی بات بتا دیجیے کہ اس کے بعد میں کسی سے کچھ اور نہ پوچھوں۔ لیکن میں ان الفاظ کی ترجمانی اس طرح کر رہا ہوں کہ مجھے ایسی جامع بات بتا دیجیے کہ پھر مجھے کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ''کہو میں ایمان لایا اللہ پر اور پھر جم جاؤ''۔ یعنی

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ۔

پھر اپنے اس قول پر جمے رہو' ثابت قدم رہو! یہ جم جانا' ڈٹ جانا اور استقامت' اس ایک لفظ کے اندر ایک قیامت مضمر ہے۔

استقامت کے پہلا داخلی ثمر: محبتِ الٰہی

ایمان اور اس پر استقامت کے کچھ ثمرات ہیں' ان ثمرات میں سے کچھ داخلی ہیں اور کچھ خارجی۔ ایمان ایک حقیقت ہے جو باطن اور قلب میں ہوتی ہے۔ اس کا ظہور ایسے ہوتا ہے جیسے ایک پودے میں پھول لگتے ہیں۔ ایمان ایسا پودا ہے جس کے کچھ پھول تو ظاہر میں ہوتے ہیں' یعنی خارج میں انسان کی شخصیت کے اندر' اور اس کے کچھ پھول وہ ہیں جو انسان کی شخصیت کے اندر لہلہاتے ہیں۔ یہ اندر کے پھول کون سے ہیں؟ ان میں سے اولین اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر شے سے بڑھ کر محبوب نہیں ہو گیا تو پھر ایمان پر استقامت نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ: ١٦٥) ''اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں''۔ اسی محبتِ خداوندی کے تابع اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کی محبت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں یہ ترتیب آئی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے' اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں (یا عورتوں کے لیے شوہر)' اور تمہارے اپنے عزیز و رشتہ دار' اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے جمع کیے ہیں' اور وہ کاروبار (جنہیں بڑی مشکل سے تم نے جمایا ہے اور) جن کے کساد کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے' اور وہ کوٹھیاں (جو تم نے بڑے شوق سے تعمیر کی ہیں اور) وہ تمہیں بڑی محبوب ہیں' اگر یہ چیزیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے' اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے تو

انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں' نا ہنجاروں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

الغرض ایمان کا صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے' بلکہ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ، لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ کی کیفیت اگر حقیقی معنوں میں نہیں ہے تو پھر ایمان بھی نہیں ہے!

استقامت کا دوسرا داخلی ثمر: رضا بر ضائے رب

استقامت کے داخلی ثمرات میں سے ایک اہم ثمر راضی برضائے رب رہنا ہے۔ یعنی جو رب کی طرف سے آ رہا ہے اس پر کوئی شکوہ زبان پر نہ آئے۔ ایک تو ہے اضطراری حرکت (reflex action)' جیسے کسی چیونٹی نے کاٹا ہے تو آپ کا ہاتھ یک دم ہل گیا۔ یہ بے اختیاری عمل ہے اور اس میں آپ کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیمؑ جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ننھے سے بچے تھے' دم توڑ رہے تھے تو حضور ﷺ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کے آنکھوں میں آنسو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو وہ رحمت ہے جو اللہ نے دلوں میں رکھی ہے۔ باقی ہم کہتے وہی ہیں جو اللہ کو پسند ہے اور ہم اللہ کی رضا پر مکمل راضی ہیں۔ لہٰذا ریفلکس ایکشن کے درجے میں کوئی ری ایکشن ہو جائے' کوئی آنسو آ جائیں' کوئی اور بات ہو جائے تو یہ الگ بات ہے' لیکن اللہ تعالیٰ سے کوئی مستقل شکایت پیدا ہو جائے تو اس سے ایمان کی نفی ہو جائے گی۔ اس حدیث کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ جو ہوتا ہے اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور اس کائنات کے اندر پتا نہیں ہل سکتا جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾﴾ (التوبۃ)

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ ہرگز کوئی مصیبت نہیں آ سکتی ہے سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے' وہ ہمارا آقا ہے' اور ایمان والوں کو تو اللہ

ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

یعنی اے منافقو! تم ہمیں رومیوں کی فوج سے اور وہاں کی سخت گرمی سے ڈرا رہے ہو' حالانکہ ہمارا تو اس بات پر پورا یقین ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آ سکتی سوائے اس کے جو ہمارے رب نے ہمارے لیے لکھ دی ہو' اور اس کی طرف سے جو بھی آئے وہ ہمیں قبول ہے ؏ ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!''

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی!

اس کو اکبرالٰہ آبادی نے بہت خوبصورت انداز میں کہا ہے:

رضائے حق پہ راضی رہ' یہ حرفِ آرزو کیسا
خدا خالق' خدا مالک' خدا کا حکم' تُو کیسا!

یعنی خدا کے خالق اور مالک ہونے کا یقین انسان کو ان وسوسوں سے نجات دلاتا ہے کہ یہ کیوں ہو گیا' یہ کیسے ہو گیا' یہ نہیں ہونا چاہیے تھا' اس نے میرا کام بگاڑ دیا۔ یہ ساری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں صرف اس یقین سے کہ جو آیا اللہ کے حکم سے آیا' اور جو درمیان میں ذریعہ بن گیا اُس نے اپنے لیے جو کمائی کرنی تھی' کر لی۔ میں نے آپ کو ایک درویش کا قصہ سنایا تھا جو یہ کہتے ہوئے جا رہا تھا ''جو رب کرے سو ہو' جو رب کرے سو ہو!'' ایک شخص نے اٹھا کر اسے پتھر دے مارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو جس نے پتھر مارا تھا وہ کہنے لگا: مجھے کیا دیکھتے ہو' جو رب کرے سو ہو! وہ کہنے لگے کہ مجھے پتھر تو اللہ کے اذن ہی سے لگا ہے' لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ بیچ میں منہ کس کا کالا ہوا ہے! ظاہر بات ہے کہ تم لاکھ مجھے پتھر مارنا چاہتے' اگر اللہ نہ چاہتا تو تم نہ مار پاتے۔ تمہارا نشانہ خطا ہو جاتا' تمہارا ہاتھ شل ہو جاتا۔ اقبال اس حوالے سے کہتا ہے:

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا

یعنی مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ایک ذریعے سے اس ہست و بود کے سارے چکروں

سے نکال لیا ہے اور مجھے تسلیم و رضا کا مقام حاصل ہو گیا ہے' بایں طور کہ اب جو بھی میرے رب کی طرف سے آئے' اس پر سرِ تسلیم خم ہے۔

استقامت کا تیسرا داخلی ثمر: توکّل علی اللہ

استقامت کا تیسرا داخلی پہلو ہے اللہ پر توکل کرنا۔ محنت کرو' بھاگو' دوڑو' کماؤ' جو بھی کرنا ہے کرو' مگر کبھی اپنی صلاحیت اور مادی وسائل پر توکل نہ کرنا۔ یہ تورات کی تعلیم کا بھی مرکزی نکتہ تھا' جو سورۂ بنی اسرائیل کی دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ میرے سوا کسی پر توکل نہ کرنا۔ چاہے سارے اسباب و وسائل آپ کو مہیا ہوں' لیکن کبھی یہ نہ کہنا کہ یہ کام میں کل ضرور کر دوں گا۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے: There is many a slip between the cup and the lip چاہے ہاتھ میں پیالہ ہے اور پیالے اور آپ کے ہونٹوں کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے' لیکن اگر اللہ کا اذن نہ ہو تو آپ وہ پیالہ منہ کو نہیں لگا سکتے۔ چنانچہ اللہ پر توکل ضروری ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ محنت نہ کرو۔ محنت بھرپور کرو! محنت نہیں کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم خود اللہ کی مشیت کو توڑ رہے ہو۔ لہٰذا محنت ضرور کرو' مگر یہ یقین بھی ہو کہ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔

سورۂ بنی اسرائیل کی دوسری آیت کے الفاظ ہیں: ﴿وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے رہنما مقرر کیا تھا'' ـــــ یہاں یہ نکتہ نوٹ کیجیے کہ تورات ''هُدًی لِلنَّاسِ'' نہیں ہے۔ ''هُدًی لِلنَّاسِ'' صرف قرآن ہے' جبکہ تورات ''هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ'' ہے۔ سورۃ السجدۃ میں بھی تورات کے لیے ''هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ'' آیا ہے ـــــ آگے فرمایا: ﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ۝۲﴾ ''(اس تاکید کے ساتھ) کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز مت سمجھنا''۔ یعنی میرے علاوہ نہ کسی ذات پر بھروسا کرنا اور نہ مادی اسباب پر توکل کرنا۔ مثلاً اگر آپ نے کل صبح کہیں جانا ہے اور آپ نے گاڑی کو ہر طرح سے چیک کر لیا ہے' گاڑی کی ٹیوننگ بھی کرا لی ہے' سروس بھی کرا لی ہے' آئل بھی چینج کر لیا ہے' پٹرول یا ڈیزل سے ٹینکی بھی بھری ہوئی ہے' سب کچھ

ہے کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن آپ اگر ان مادی وسائل پر بھروسا کرتے ہوئے یہ کہیں کہ کل صبح میں اُٹھوں گا اور چل دوں گا تو یہ توکّل علی اللہ کے منافی ہے۔

استقامت کے خارجی ثمرات

استقامت علی الایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان اور اس پر استقامت کے تین تقاضے ہیں یا یوں کہیے کہ تین داخلی کیفیات وثمرات ہیں: محبتِ الٰہی تسلیم ورضا اور صبر وتوکّل۔ یہ تین چیزیں وہ ہیں جو وجود کے اندر ہیں جبکہ اس استقامت کے کچھ خارجی ثمرات بھی ہیں اور ان میں سب سے پہلا یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اللہ کی مکمل عبادت۔ یعنی تمہارے وجود سے جو عمل بھی خارج ہو وہ اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھل کر آئے۔ فانی کا ایک شعر ہے جو شعر ہونے کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے:

فانی تمہارے عمل سراسر جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں!

یہ ان لوگوں کا قول ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اس کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اسلاف میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جن کو ''جبریہ'' کہا جاتا ہے اور فانی بھی ان میں سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ سب اللہ کے جبر کے تحت ہے لیکن ان کو اختیار کے سانچے میں بایں طور ڈھال دیا گیا ہے کہ تم محسوس کرتے ہو کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ بہرحال ہمارے وجود سے جو بھی صادر ہو چاہے ہاتھ سے ہو پاؤں سے ہو ناک سے ہو کان سے ہو وہ اطاعتِ خدا اور اطاعتِ رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھل کر آئے۔

استقامت کی دوسری خارجی کیفیت ہے جہاد وانفاق فی سبیل اللہ۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ استقامت کے دعوے اور دوسری طرف اللہ کے باغیوں سے دوستی یا اللہ کے غداروں کی غلامی پر راضی ہو جانا یہ کہاں کا ایمان ہے؟ یہ تو ایمان کے منافی ہے۔ مؤمن اگر ایسے باطل سے باغی نہیں ہے تو پھر وہ مؤمن کہاں ہوا؟ سورۃ البقرۃ میں جو آیا ہے: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ

لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ''جو شخص طاغوت کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں''۔ دیکھئے طاغوت کا کفر پہلے ہے اور ایمان باللہ بعد میں ہے۔ اور اگر طاغوت جو اللہ کے سرکش ہیں' ان سے وفاداری اور دوستیاں ہیں تو پھر ایمان نہیں ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

((اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ اِهْتَزَّ لِذٰلِكَ الْعَرْشُ وَغَضِبَ لَهُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى))(۱)

''جب کسی فاسق اور فاجر شخص کی مدح کی جاتی ہے تو عرشِ الٰہی کانپنے لگتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر بہت غضب ناک ہوتے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا بندہ ہونے کا مدعی ہو کر ایک فاسق وفاجر کی تعریف کر رہا ہے' اس کی شان میں لمبا چوڑا سپاس نامہ پیش کر رہا ہے' تو اس پر اللہ عزوجل کو اتنا غصہ آتا ہے کہ عرش لرز اٹھتا ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ وَقَّرَ فَاسِقًا فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ)) (۲)

''جس نے کسی فاسق کی توقیر کی تو اس نے اسلام کی جڑیں کھودنے میں مدد کی۔''

ہمارا جو مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ہے اس میں سورۃ التغابن اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے دروس میں استقامت اور اس کے داخلی وخارجی ثمرات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ زیر مطالعہ حدیث کے ضمن میں اِن دروس کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذات اور اپنی صفات پر یقین والا ایمانِ حقیقی عطا فرمائے اور اس کے جملہ داخلی اور خارجی تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

---

(۱) رواه ابن حبان' راوی : انس بن مالک ﷺ

(۲) طبقات الشافعية لابن السبكی:۳۱۳/۶۔ تخريج الاحياء للعراقی:۱۱۱/۲۔

حدیث
22
23

فرائض کا التزام اور رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں

۴/اپریل ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ○ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا :

اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اَرَاَيْتَ اِذَا صَلَّيْتُ الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوْبَاتِ، وَصُمْتُ رَمَضَانَ، وَاَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ، وَلَمْ اَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ شَيْئًا، اَاَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: ((نَعَمْ)) قَالَ: وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى ذٰلِكَ شَيْئًا (۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان الذی یدخل به الجنة۔

ابوعبداللہ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

''ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ذرا غور فرمایئے! اگر میں (صرف) فرض نمازیں ادا کروں' (صرف) رمضان کے روزے رکھوں' حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھوں اور اس پر کسی عمل کا اضافہ نہ کروں تو کیا میں جنت میں جاسکوں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں!'' اُس شخص نے کہا: اللہ کی قسم' میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔''

عَنْ اَبِیْ مَالِكِ الْحَارِثِ بْنِ عَاصِمِ الْاَشْعَرِیِّ رضی اللہ عنہ ' قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :

((اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَالصَّلَاةُ نُوْرٌ ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ ، وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ، فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ ، فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا)) (۱)

سیدنا ابومالک حارث بن عاصم اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پاکیزگی نصف ایمان ہے' الحمدللہ کا کلمہ ترازو کو بھر دے گا (یعنی نیکی کے پلڑے کو وزنی کرے گا)' سبحان اللہ اور الحمدللہ یہ دونوں کلمے زمین وآسمان کے مابین خلا کو پُر کر دیتے ہیں۔ نماز (نمازی کے لیے) نور ہے' صدقہ (صدقہ کرنے والے کے لیے ایمان کی) دلیل ہے' اور صبر (صبر کرنے والے کے لیے) روشنی ہے اور قرآن تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف دلیل ہوگا۔ ہر شخص روزانہ اپنا سودا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں یا تو خود کو (جہنم سے) آزاد کرا لیتا ہے یا خود کو تباہ کر بیٹھتا ہے۔''

معزز سامعین کرام!

احادیثِ نبویہؐ کے بارے میں' میں نے ایک بات اس سے پہلے بھی کہی تھی کہ اگر ہم اس بات کو پیشِ نظر نہ رکھیں کہ احادیث کس پس منظر میں اور کس سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہیں اور کسی ایک حدیث کے اوپر اپنی نگاہ جما کر سارے کا سارا دین اسی سے اخذ کرنے کی کوشش کریں تو معاملہ غلط ہو جائے گا اور بات گمراہی تک چلی جائے گی۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔

مثلاً ایمان اور اسلام کی بحث میں ہم یہ حدیث پڑھ چکے ہیں: ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ))(۱) ''جس نے لا اِلٰہ اِلا اللہ کہا پس وہ جنت میں داخل ہوگیا''۔اب اگر صرف اس ایک حدیث پر نظر مرکوز کرلیں تو پھر محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بھی ضروری نہ رہا اور کوئی عمل بھی ضروری نہ رہا' حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔اس حدیث کا مفہوم اور حاصل یہ ہے کہ جو شخص خلوصِ نیت اور مکمل قلبی یقین کے ساتھ لا اِلٰہ اِلا اللہ کہہ رہا ہے' اس کے سارے تقاضوں کو مانتا بھی ہے اور پورا بھی کرتا ہے تو جنت اُس کا ٹھکانا ہوگی۔

احادیث کے پس منظر اور مخاطبین کا جاننا ضروری ہے

آج ہمارے زیرِ مطالعہ اربعین نووی کی حدیث ۲۲ ہے اور اس کے مضمون سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص فرد ہے جو حضور اکرم ﷺ سے مخاطب ہے اور آپؐ اس کے احوال سے بھی بخوبی واقف ہیں —— آیئے اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما —— یہ دونوں باپ بیٹا چونکہ صحابی ہیں' اس لیے ہم ''رضی اللہ تعالیٰ عنہما'' کہیں گے—— بیان کرتے ہیں: اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: ''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتے ہوئے یہ عرض کیا: ''اَرَاَیْتَ اِذَا صَلَّیْتُ الصَّلَوَاتِ الْمَکْتُوْبَاتِ'' (اے نبی ﷺ!) دیکھئے جب میں فرض نمازیں ادا کردوں' 'وَصُمْتُ رَمَضَانَ'' اور رمضان المبارک کے (فرض) روزے رکھوں' 'وَاَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ'' اور حلال ہی پر قائم رہوں اور حرام سے مجتنب رہوں' 'وَلَمْ اَزِدْ عَلٰی ذٰلِکَ شَیْئًا'' اور اس پر میں کسی چیز کا اضافہ نہ کروں' 'اَاَدْخُلُ الْجَنَّۃَ؟'' تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟'' قَالَ: ((نَعَمْ)) حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' اس پر اُس شخص نے کہا: وَاللّٰہِ لَا اَزِیْدُ عَلٰی ذٰلِکَ شَیْئًا ''اللہ کی قسم! میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔''

اس حدیث میں نہ تو ایمان زیرِ بحث ہے' نہ جہاد فی سبیل اللہ کا تذکرہ ہے۔ان

(۱) صحیح ابن حبان' ح:۱۵۱' عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ' ح:۱۶۹'عن ابی ذر رضی اللہ عنہ۔ المعجم الاوسط للطبرانی:۳/۴۶و۳/۲۰۵ و ۲/۳۲۸۔

کے علاوہ عبادات میں سے زکوٰۃ اور حج بھی اس حدیث میں بیان نہیں ہوئے۔ اسی طرح اس میں شہادتین کا بھی ذکر نہیں اور یقین والے ایمان کی بھی تاکید نہیں۔ چنانچہ جیسا کہ میں قبل ازیں بتا چکا ہوں' اگر آپ صرف ایک حدیث پر نگاہ مرکوز کر کے اسے عمومی حیثیت دے دیں گے تو وہ گمراہی پر منتج ہو سکتی ہے۔ زیر مطالعہ حدیث کو یوں سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک معیّن فرد ہے' جو یہ سوال کر رہا ہے اور آپؐ جانتے ہیں کہ وہ صاحبِ ایمان ہے' اس کے دل میں بھی ایمان موجود ہے اور وہ کلمہ شہادت بھی ادا کرتا ہے ـــــ حضور ﷺ کی نگاہوں سے یہ معاملات پوشیدہ نہیں تھے' کسی کے باطن کی کیفیت بھی آپؐ پر عیاں ہو سکتی ہے ـــ پھر ہو سکتا ہے کہ وہ نادار شخص ہو جس کے لیے زکوٰۃ اور حج کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ صاحبِ نصاب نہیں ہے' اس لیے بالفعل اس کے اوپر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے لیے حج کا امکان ہے' اس لیے کہ وہ ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا﴾ کے ذیل میں نہیں آتا۔ اس کے پاس اخراجاتِ سفر اور زادِ راہ کے لیے کوئی روپیہ پیسہ نہیں ہے۔ ایسا شخص سوال کر کے سمجھنا یہ چاہتا ہے کہ عبادات کے ضمن میں آیا یہ فرائض کفایت کر جائیں گے یا ان کے اوپر نوافل کا اضافہ لازمی ہے؟

نفلی عبادات میں اعتدال لازم ہے

عام طور پر مذہبی مزاج کے لوگوں میں یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے' اس لیے کہ فرائض کی ادائیگی کو وہ کافی نہیں سمجھتے جب تک کہ ان فرائض کے ساتھ کوئی نوافل اور اضافی عبادات نہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض ایسے بھی تھے جو ساری ساری رات اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی مثال میں آپ کو کئی مرتبہ دے چکا ہوں۔

حضرت عبداللہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ساری رات نوافل پڑھتے اور روزانہ روزہ رکھتے تھے۔ ان کو نہ بیوی سے کوئی سروکار تھا اور نہ دنیا کے کسی اور معاملے سے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس معمول کا پتا چلا تو آپؐ نے انہیں بلا کر پوچھا: ((یَاعَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم

ہر روز روزہ رکھتے ہو اور پوری پوری رات (نفل میں) قیام کرتے ہو' ـــــ آپؓ نے عرض کیا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ''ایسا ہی ہے یارسول اللہ!'' آپؐ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ)) ''تو ایسا ہرگز مت کرو!'' ((صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ)) ''روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو' قیام بھی کرو اور نیند بھی کرو!'' ((فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱) ''اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔''

اس حوالے سے میں یہ واقعہ بھی آپ کو سنا چکا ہوں کہ تین صحابہؓ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ رات کو کتنی دیر جاگ کر نوافل پڑھتے ہیں اور کتنی دیر آرام فرماتے ہیں؟ اور مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہیں اور کتنے دن افطار کرتے ہیں؟ وغیرہ۔ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے ان صحابہ کو رسول اللہ ﷺ کے معمولات بتا دیے تو انہوں نے سوچا کہ یہ عبادات تو کم ہیں۔ گویا ان کا گمان یہ تھا کہ حضور ﷺ رات کو ایک لمحہ کے لیے بھی کمر بستر پر نہیں لگاتے ہوں گے اور آپؐ مسلسل روزے رکھتے ہوں گے' کبھی ناغہ نہیں کرتے ہوں گے۔ انہوں نے معمولاتِ رسول اللہ ﷺ کو قلیل سمجھا' مگر انہوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تھپکی دی کہ نبی اکرم ﷺ تو معصوم عن الخطا ہیں اور آپؐ سے نہ کبھی کوئی گناہ سرزد ہوا ہے اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے ـــــ اگر امکان ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی معاف کر چکا ہے: ﴿...... لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ (الفتح: ۲) ''......تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی اگلی اور پچھلی خطائیں بخش دے'' ـــــ جبکہ ہم تو گناہگار ہیں' اس لیے ہمارے لیے اتنی عبادت کافی نہیں ہے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نوافل ادا کروں گا' کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ساری عمر شادی بیاہ کے چکر میں نہیں پڑوں گا ـــــ ظاہر بات ہے کہ کنبہ اور خاندان اور پھر ان کے ساتھ سو طرح کے جھمیلے

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجك عليك حق۔

ہوتے ہیں‘ ان کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے لو لگانا مشکل ہو جاتا ہے ــــ
حضور اکرم ﷺ کو جب اس سارے معاملے کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ان کو بلا کر ڈانٹا اور آپؐ نے انتہائی غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے:

((اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاکُمْ لَهٗ ، لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۱)

''اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں‘ لیکن (جان لو) میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں‘ اور (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں‘ اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جس کو میری سنت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

فرائض اور نوافل میں نسبت وتناسب کو ملحوظ رکھنا

اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ دین اور عبادات کے معاملے میں دو چیزیں دیکھنی ضروری ہیں‘ جبکہ عام طور پر لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ صرف ایک چیز پر نگاہ ڈال لیتے ہیں کہ یہ چیز حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ کتنی ثابت ہے۔ یہ دوسری بات بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اُسوۂ رسول ﷺ کے مجموعی نقشہ میں اس نسبت وتناسب کی بہت اہمیت ہے کہ کس چیز کی کتنی اہمیت ہے اور کون سی چیز کس درجے میں مطلوب ہے۔ یہ چیز بھی حضور ﷺ سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے‘ لیکن اگر آپ نے تولے کی چیز کو سیر کر دیا یا سیر کو تولہ کر دیا تو معاملہ حقیقت کے برعکس ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک نسخے کے تین اجزاء ہیں‘ ایک ماشہ بھر ہے‘ ایک تولہ بھر ہے‘ ایک چھٹانک بھر ہے۔ اگر آپ نے اس تناسب کو الٹا کر دیا‘ بایں طور کہ ماشے والے کو تولہ کر دیا اور تولے کو چھٹانک کر دیا تو اب وہ نسخہ شفا نہیں رہے گا‘ بلکہ ہو سکتا ہے کہ نسخہ ہلاکت بن جائے۔

اس اعتبار سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ سنت رسولؐ اور اُسوۂ رسولؐ بحیثیت مجموعی کیا ہے اور پھر اس میں نسبت وتناسب کیا ہے۔ اول دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا وہ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب النکاح‘ باب الترغیب فی النکاح۔

حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے؟ اس لیے کہ اگر ثابت نہیں ہے تب تو وہ بدعت ہو جائے گی۔ اور دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ جو چیزیں آپ ﷺ سے ثابت ہیں وہ کتنی ثابت ہیں' اس کو سامنے رکھ کر انسان فیصلہ کرے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ فرض نماز اصل اہمیت کی حامل ہے' لیکن ہمارے ہاں عام طور پر مذہبی حلقوں میں اور خاص طور پر جو ذرا متصوفانہ انداز کے لوگ ہوتے ہیں' وہ فرض کو تو بس ایسے ادا کرتے ہیں جیسے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ بعض لوگ وہ بھی ہیں جن کا سارا زور فرضوں کے بجائے نوافل پر ہے۔ وہ فرض کے معاملے میں تو کوتاہی برتتے ہیں' مگر رات کی نماز میں تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ہم نے بالفعل ایسے لوگ دیکھے ہیں۔ یہ تمام چیزیں درحقیقت انسان کو راہِ نبوت سے ہٹا دینے والی ہیں۔

نوافل کے بارے میں شریعت سے ثابت ہے کہ یہ لازم نہیں ہیں۔ اسی طرح رات کا قیام یعنی تہجد بھی صرف حضور ﷺ کے لیے لازم تھی' جبکہ دوسرے لوگوں کے لیے لازم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ رمضان المبارک میں اس کی بہت تشویق و ترغیب دلائی گئی ہے۔ وہ خاص ایک مہینہ ہے جس میں دن کے اوقات میں کھانا پینا حرام کیا گیا ہے اور رات کو ـــــ دو تہائی رات' یا کم سے کم ایک تہائی رات ـــــ اللہ کی کتاب قرآن مجید کے ساتھ جاگنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ درحقیقت فرائض اور نوافل کے معاملے میں یہ توازن بہت ضروری ہے۔

فرائض کی اہمیت مسلّم ہے!

زیر مطالعہ حدیث میں بھی اُس شخص نے رسول اللہ ﷺ سے فرائض کی اہمیت کو جانتے ہوئے فرض نماز اور فرض روزے کا پوچھا تھا ـــــ فرض نماز کی اہمیت کے بارے میں مجھے ایک حدیث اور یاد آئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ نِصْفِ لَيْلَةٍ وَمَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ لَيْلَةٍ)) (۱)

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلوٰۃ' باب فی فضل صلاۃ الجماعۃ۔

''جس شخص نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی گویا اُس نے آدھی رات قیام کیا اور جس شخص نے عشاء کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی اور پھر فجر کی بھی تو اس کے لیے پوری رات کا قیام لکھ دیا جائے گا۔''

فرض کی یہ اہمیت ہے اور نجات کے لیے بھی بنیاد (base line) فرض عبادات ہیں۔ فرائض کی ادائیگی کے بعد آدمی سے جتنا اضافہ ہو سکے' کرے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ حالات کو بھی پیش نظر رکھے۔ اس لیے کہ بعض حالات ایسے ہوں گے جس میں اصل اہمیت جہاد و قتال کی ہو جائے گی۔ اب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام' اسلامی حکومت اور نظامِ خلافت قائم ہے تو قتال کا معاملہ حکومت کے ذمے ہوگا اور حکومت اس کا انتظام کرے گی۔ اگر کہیں دس ہزار آدمیوں کی ضرورت ہے اور دس ہزار آدمی جانے کے لیے نکل آئے ہیں تو باقی آرام سے گھر میں سوئیں یا رات کو جاگ کر نوافل پڑھیں۔ یہ تقرب بالنوافل کا موقع ہوگا' لیکن اگر اللہ کا دین مغلوب ہے' پامال ہے' اسے پاؤں تلے روندا جا رہا ہے' شریعت کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں' اوامر کا استہزاء ہو رہا ہے اور منکرات کی تبلیغ ہو رہی ہے تو اس صورتحال میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض ہو جائے گا۔ اگر اُس وقت لوگ اس فرض کو ترک کر کے نوافل میں لگیں گے تو یہ نوافل اُن کے منہ پر دے مارے جائیں گے۔

اس بات کو بہت زیادہ نمایاں کرنے کے لیے میں مثال دیتا ہوں۔ ذرا سوچیے' جب دامنِ اُحد میں معرکہ جاری تھا' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور حضور اکرم ﷺ کی جان پر بنی ہوئی تھی —— آپ کو معلوم ہے کہ غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ زخمی ہوئے اور آپؐ کا اتنا خون بہہ گیا کہ آپؐ بے ہوش ہو گئے اور یہ افواہ پھیل گئی کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں —— اُس وقت اگر کوئی شخص مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو' یا نوافل ادا کر رہا ہو' یا قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو تو اس کے بارے میں حکم لگایا جائے گا کہ وہ پکا منافق ہے۔ حالانکہ کام تو وہ اچھے کر رہا ہے۔ درود پڑھنے کی بہت فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے اور اسی طرح نوافل بھی تقرب الی اللہ کا بہت بڑا ذریعہ

ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت بھی اجر و ثواب کا خزانہ ہے کہ اس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیوں کا ثواب ہے اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ الٓمٓ کو ایک حرف نہ سمجھنا' بلکہ الف علیحدہ حرف ہے' لام علیحدہ ہے اور میم علیحدہ ہے۔ اس طرح الٓمٓ پڑھنے پر ۳۰ نیکیاں ہو گئیں۔ لیکن ہر حالت میں اور ہر وقت ایسا نہیں ہے۔ حالات کے مطابق جو چیز فرض ہو تو پہلے اس کی ادائیگی لازم ہے اور پھر نوافل کا درجہ آتا ہے۔ فرائض اور نوافل کے درجات کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے' ورنہ ان نوافل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

حلال کو حلال سمجھنا اور حرام سے اجتناب کرنا

فرض نماز اور روزے کے بعد اُس شخص نے کہا: وَاَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ ''اور میں حلال ہی پر قائم رہوں اور حرام سے مجتنب رہوں''۔ گویا حلال کو حلال سمجھتے ہوئے حلال پر قائم رہنا بھی ضروری ہے' خواہ مخواہ حلال کو اپنی شدتِ تقویٰ کی وجہ سے حرام نہیں کر لینا چاہیے۔ ہمارے ایک فوت شدہ بزرگ کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو ''تقویٰ کا ہیضہ'' ہو جاتا ہے اور وہ حلال چیزوں کو بھی چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حلال کو حلال سمجھنا اور ان کا استعمال کرنا چاہیے' جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں دو مقامات پر آیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖؗ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۶۸﴾﴾

''لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾﴾

''اے اہلِ ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں' ان کو کھاؤ اور اگر خدا ہی کے بندے ہو تو اس (کی نعمتوں) کا شکر بھی ادا کرو۔''

سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِیَ

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ کس نے حرام کر دی ہیں زینت (و آرائش) اور کھانے پینے کی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے (زمین سے) نکالی ہیں! کہہ دیجیے کہ یہ سب چیزیں دنیا میں بھی اصلاً اہلِ ایمان کے لیے ہیں (لیکن یہ کہ دنیا میں ہم کفار کو بھی دیتے ہیں جتنا چاہتے ہیں) اور قیامت کے دن تو یہ اہلِ ایمان کے لیے خالص ہو جائیں گی (پھر کفار کے لیے ان میں حصہ رہے گا ہی نہیں)۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی وضاحت کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

لہٰذا تقویٰ میں یہ بھی شامل ہے کہ جو حلال شے ہے اسے حلال سمجھو اور استعمال کرو' اور جو حرام شے ہے اسے حرام سمجھو اور اس سے اجتناب کرو۔

یہاں ایک مسئلہ یہ آ جاتا ہے' فرض کیجیے کہ کسی شخص کو بکری کا گوشت دیا گیا ہے' جبکہ اسے بتایا گیا کہ یہ سور کا گوشت ہے اور وہ اسے سور کا گوشت سمجھ کر کھا رہا ہے تو وہ سور ہی کھا رہا ہے۔ حرام کو حرام سمجھنا ضروری ہے' اس لیے اگر تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سور کا گوشت ہے تو اس سے اجتناب لازم ہے۔ البتہ اگر تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ یہ بات غلط کہی گئی ہے اور یہ تو بکری کا گوشت ہے تو پھر کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بغیر تحقیق کے کھاؤ گے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے حرام کھا رہے ہو۔

زیرِ مطالعہ حدیث کا آخری حصہ

اس شخص نے کہا کہ اگر میں فرض نماز پڑھوں اور فرض روزے رکھوں' حلال کو حلال جانوں اور حرام کو حرام سمجھوں' وَلَمْ اَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ شَيْئًا ''اور میں اس پر کسی عمل کا اضافہ نہ کروں'' اَاَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ ''تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((نَعَمْ)) ''ہاں!'' حضور اکرم ﷺ کی طرف سے ''ہاں'' سن کر اُس شخص نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا: وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى ذٰلِكَ شَيْئًا ''اللہ کی قسم! میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔''

اس حدیث سے اب یہ مطلب نکالنا کہ یہاں چونکہ زکوٰۃ اور حج کا ذکر نہیں ہے' لہٰذا زکوٰۃ اور حج لازم نہیں' غلط ہے۔ اسی طرح چونکہ یہاں ایمان کا ذکر نہیں' لہٰذا یہ کہنا کہ اگر کوئی شخص نیک اعمال کر رہا ہے' چاہے اس کے دل میں ایمان ہے یا نہ ہے وہ بہرحال جنت میں جائے گا' ایسے نتیجے اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ سارے غلط نتائج ہیں جو صرف اس لیے ذہن میں آتے ہیں کہ انسان حدیث کے پس منظر اور مخاطب کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ زیر مطالعہ حدیث ایک معین شخص کے احوال پر مبنی ہے (گویا ایک پی پی کال ہے) اور نبی اکرم ﷺ نے اس کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُسے صرف نماز' روزہ اور حلال وحرام کی تمیز پر جنت کا پروانہ تھما دیا ہے' لہٰذا حدیث کے پس منظر اور باقی حالات وواقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو سمجھنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اصل مضمون فرض اور نفل کا ہے۔ نماز فرض ہے پڑھو' روزہ فرض ہے رکھو' زکوٰۃ فرض ہے تو ادا کرو' حج فرض ہے تو اس کے لیے ضرور جاؤ۔ اس لیے کہ استطاعت کے ہوتے ہوئے بھی حج نہ کرنے کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴿۹۷﴾ ﴾ (آلِ عمران) ''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے' اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اہلِ عالَم سے بے نیاز ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں

اب آیئے اگلی حدیث کی طرف۔ دراصل حدیث ۲۳ جوامع الکلم کا گلدستہ ہے اور اس کے ہر جملے میں معانی کا اک جہاں پنہاں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضور ﷺ کا اپنا فرمان ہے: ((اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) (۱) ''مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' باب قول النبی بعثت بجوامع الکلم۔ وصحیح مسلم' کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ۔

جامع کلمات عطا ہوئے ہیں''۔ جوامع الکلم سے مراد ہے دو تین الفاظ میں بہت بڑی اور بہت ساری حقیقتوں کو سمو دینا۔ یہ حضورﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص عطیہ ہے۔ قرآن بھی جوامع الکلم ہے' مثلاً سورۃ العصر میں پورا قرآن مجید موجود ہے۔ سورۃ العصر کی صرف تین آیات ہیں اور امام شافعی ؒ اس کے بارے میں کہتے ہیں: لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ ''اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر غور و فکر کریں (اور اس کی گہرائی میں جائیں) تو یہ ان کی ہدایت کے لیے کافی ہو جائے گی''۔ مفتی محمد عبدہٗ نے آخری پارہ کی جو تفسیر لکھی ہے اس میں امام شافعی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ ''اگر قرآن مجید میں سوائے اس (ایک سورۃ یعنی سورۃ العصر) کے اور کچھ نازل نہ ہوتا تو لوگوں کی ہدایت کے لیے یہی کافی تھا''۔ سورۃ العصر کی اسی اہمیت کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سورۂ مبارکہ کے ساتھ بہت قلبی اُنس تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حضرت ابومزینہ دارمی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت طبرانی کی ''معجم الاوسط'' میں اور امام بیہقی کی ''شعب الایمان'' میں منقول ہے کہ:

كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَقْرَاَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْاٰخَرِ سُوْرَةَ الْعَصْرِ ثُمَّ يُسَلِّمُ اَحَدُهُمَا عَلَى الْاٰخَرِ

''نبی اکرمﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کوئی سے دو صحابہؓ جب بھی باہم ملاقات کرتے تھے تو وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے جب تک کہ ایک دوسرے کو سورۃ العصر سنا نہ لیں' اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے۔''

سورۃ العصر پھیلتی ہے' پھولتی ہے اور اس کے مضامین سے اس کی شاخیں بنتی ہیں۔ ﴿وَالْعَصْرِ﴾ میں زمانہ' تاریخ' تاریخی حالات و واقعات' انباء الرسل اور قصص النّبیین آ رہے ہیں۔ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں ایمان کے مباحث آ رہے ہیں۔ ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ میں اعمالِ صالحہ کی تشریح آ رہی ہے۔ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ میں اعمالِ صالحہ کے مدارج کا بیان ہے۔ گویا یہ سورۃ پورے قرآن کے مضامین کا انڈیکس ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سورۃ العصر ایک ایسے بیج کی مانند ہے جس میں قرآن مجید کا پورا

شجرۂ طیّبہ موجود ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی احادیث بھی جوامع الکلم ہیں۔ہم یہ حدیث بھی پڑھ چکے ہیں: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ))۔اب یہ دو لفظ ہیں‘ لیکن ان دو لفظوں میں گویا ہدایت کا ایک سمندر کوزے کے اندر بند کر دیا گیا ہے۔اسی طرح زیرِ مطالعہ حدیث بھی جوامع الکلم میں سے ایک ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس حدیث کے ہر ہر جملہ میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے ہدایت کا وافر ذخیرہ موجود ہے —— اب اس حدیث کا جملہ وار مطالعہ کرتے ہیں:

پاکیزگی نصف ایمان ہے!

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ)) ’’پاکی نصف ایمان ہے‘‘۔ پاکی نصف ایمان کیوں ہے؟ اس کے بارے میں نوٹ کر لیں کہ اس عالَم کے اندر نیکی کے داعی اور نیکی کی طرف لوگوں کو بلانے والے بھی موجود ہیں اور خود اپنی ذات میں نیکی کے نمونے بھی موجود ہیں۔ یعنی فرشتے اور داعیانِ دین ۔ اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا یہ قول ہم پڑھ چکے ہیں کہ اولیاء اللہ کی ارواح کو بھی ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں کے طبقہ اسفل میں شامل کر دیتے ہیں۔اب فرشتوں کے ساتھ روحانی طور پر قرب حاصل کرنے کے لیے پاکی شرط ہے‘ اس لیے کہ وہ ناپاکی کے قریب نہیں آتے ۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِکَۃُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ وَلَا صُوْرَۃُ تَمَاثِیْلَ)) (۱)

’’جس گھر میں کُتا ہو یا تصاویر ہوں تو اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔‘‘

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں سے نیکی کو اور اس لطافت کو مناسبت نہیں ہے۔اور اگر آپ اس طرح کا معاملہ کر رہے ہیں تو گویا فرشتوں کے قرب سے‘ ان کے لمس سے اور ان کے فیض سے آپ محروم رہ گئے۔لیکن اگر آپ پاک رہیں گے تو یہ سب حاصل ہوگا۔ لہٰذا پاکیزگی ہر حال میں ہونی چاہیے‘ جیسے کہ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الوحی‘ باب ذکر الملائکۃ۔وصحیح مسلم‘کتاب اللباس والزینۃ‘باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان......

پہلے وضو فرماتے تھے‘ تاکہ سوتے ہوئے انسان پاکی کی حالت میں رہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جو اچھے خواب ہوتے ہیں وہ فرشتوں کی طرف سے ہوتے ہیں اور جو برے خواب ہوتے ہیں وہ شیطان یا اپنے نفس کی طرف سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا نیک لوگوں اور فرشتوں کے قرب کے لیے پاکیزگی بے حد ضروری ہے۔

سبحان اللہ اور الحمد للہ کی فضیلت

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ)) ’’اور الحمد للہ سے میزان پُر ہو جاتی ہے‘‘۔ میزان سے مراد ’’میزانِ عمل‘‘ ہے یعنی جو اللہ کے ہاں انسان کے اعمال کو تولنے کے لیے ترازو ہے اس ترازو کے پلڑے کو الحمد للہ کا چھوٹا سا کلمہ بھر دے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے: ((اَلتَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ‘ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَؤُهُ))(۱) ’’سبحان اللہ کہنا نصف میزان ہے اور الحمد للہ اس کو بھر دیتا ہے‘‘۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے ’’سُبْحَانَ اللّٰهِ‘‘ —— یعنی یہ یقین رکھنا کہ اللہ کے علم میں‘ اُس کی قدرت میں‘ اُس کی صفات میں‘ اُس کے کمالات میں کہیں کوئی کمی نہیں ہے‘ کوئی نقص اور کسی عیب کا کیا سوال! یہ ہے سبحان اللہ کا مفہوم۔ اگر واقعتاً یہ قلب کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے تو اس کی تاثیر اس حدیث میں بتا دیگئی کہ یہ نصف میزان ہے۔ جبکہ اللہ کی معرفت کا دوسرا پہلو ہے: ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ‘‘ —— یعنی اللہ کی نعمتوں پر اُس کا شکر بجا لانا۔ اللہ نے جو جو نعمتیں ہمیں دی ہیں ان کا ذکر بھی کرنا ہے اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرنا ہے۔ جیسے سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور (لوگوں سے) اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ بھی کرتے رہا کریں (کہ یہ بھی شکر گزاری کا ایک طریقہ ہے)۔‘‘

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ قرآن مجید اللہ ربّ العزت کی بنی نوعِ انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ سورۃ الکہف کے آغاز میں فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ﴿۱﴾﴾ ’’کُل حمد و ثنا اور کُل شکر اللہ ہی

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الدعوات‘ باب منہ۔ ومسند احمد‘ ح: ۲۱۹۹۵۔

کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی''۔ اسی طرح سورۃ الفرقان کے آغاز میں فرمایا:﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱﴾ ''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر الفرقان اُتارا تاکہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کرنے والا بن جائے''۔ لہٰذا قرآن مجید کی اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکرادا کرنا ہم سب پر لازم ہے۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)) ''اور سبحان اللہ اور الحمد للہ (جب جمع ہو جائیں گے تو) وہ زمین اور آسمان کے درمیانی خلا کو بھر دیں گے''۔ یہ ان دو کلمات کی عظمت کے بیان کا ایک اسلوب ہے۔ اس کو ہم مادی اعتبار سے نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ صحیح بخاری کی آخری حدیث بھی ان کلمات کی عظمت کے بیان میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ، ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ، خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ :سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ))

''دو کلمات ہیں جو رحمان کو بہت پسند ہیں' میزان میں بہت بھاری ہیں اور زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ وہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ''۔

نماز نور ہے

''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کی عظمت کو بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالصَّلَاةُ نُوْرٌ)) ''اور نماز نور ہے''۔ نماز انسان کے اندر برائی سے رکنے اور اچھائی کے کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے بشرطیکہ وہ حقیقت میں نماز ہو۔ وہ نماز جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط﴾(العنکبوت:۴۵) ''یقیناً نماز فحش کاموں اور منکر سے روکنے والی ہے''۔ اور اگر صرف ایک جسمانی ورزش (physical exercise) ہو رہی ہے' اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا گیا' خشوع وخضوع کی کیفیت حاصل ہی نہیں ہوئی' حضورِ قلب کا معاملہ ہوا ہی نہیں' اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوئی تو پھر ٹھیک ہے کہ فرض

ادا ہو گیا۔ باقی اس کے اندر برائی و منکر سے روکنے کی تاثیر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح نماز انسان کے اندر باطنی بصیرت پیدا کرتی ہے۔ یہ وہ نور ہے جس سے اسے نظر آنے لگتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے' یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ یہ اصل میں انسان کی وہ بصیرت ہے جو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اور نماز اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

صدقہ دلیل ہے

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا: ((وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ)) ''اور صدقہ دلیل ہے''۔ یعنی صدقہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص واقعی صادق الایمان ہے۔ ''آیت البر'' میں آپ نے دیکھا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے بعد کس قدر شدومد کے ساتھ آیا ہے: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾۔ فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر' یوم آخرت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور نبیوں پر۔ اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں' مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کر لیں۔ اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔ اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

درحقیقت جب انسان اپنا مال صدقہ کے طور پر نکال کر دیتا ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان ہے۔ تبھی تو وہ دے رہا ہے' ورنہ کاہے کو دیتا ہے کوئی

شخص؟ ظاہر بات ہے ہر شخص اپنے مال سے نفع چاہتا ہے۔اب ایک مادی نفع ہے جو آپ کو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور ایک نفع وہ ہے جو آخرت میں حاصل ہوگا اور یہ سب سے بڑا نفع ہے۔لہٰذا جو شخص کسی مادی منفعت کے حصول کے لیے نہیں‘ صرف اللہ کی رضا جوئی کے مال دیتا ہے‘ صدقہ کرتا ہے یہ گویا اس کے ایمان کا ثبوت ہے۔

صبر روشنی ہے

زیر مطالعہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے جملوں کی ترتیب دیکھئے۔سب سے پہلے پاکیزگی کا بیان‘ پھر ذکر الٰہی کا‘ پھر نماز اور صدقہ کا اور اب صبر کا تذکرہ ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:((وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ))''اور صبر ایک روشنی ہے''۔جیسے روشنی میں آپ کو راستہ صحیح نظر آتا ہے‘ اسی طرح آپ میں اگر صبر کا مادہ ہے تو راستہ آپ کے لیے کھلتا چلا جائے گا۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ کئی مقامات پر آئے ہیں:﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''—— صبر کے بارے میں بارہا گفتگو ہو چکی ہے۔ایک صبر ہے:صبر عن المعصية یعنی معصیت سے اپنے آپ کو روکنا۔ایک ہے:صبر علی الطاعة یعنی اطاعت پر جمے رہنا۔ہوسکتا ہے کسی وقت انتہائی سرد موسم میں آپ کو غسل کی حاجت ہوگئی اور گرم پانی کا آپ کے پاس کوئی اہتمام نہیں ہے تو اُس وقت ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا اور اس کو برداشت کرنا یہ صبر علی الطاعۃ ہے۔اسی طرح ایک ہے: صبر علی الابتلاء یعنی اللہ کی طرف سے جو آزمائش یا مصیبت آجائے اس پر صبر کرنا‘ اس کو جھیلنا‘ اس کو برداشت کرنا۔اسی طریقے سے جہاد اور قتال کے اندر صبر کا معاملہ ہے۔صبر کی اقسام کے حوالے سے آیت البر میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿......وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

''......اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں‘ تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

قرآن حُجت ہے!

آگے زیر مطالعہ حدیث کا اہم ترین حصہ آ رہا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ)) ''اور قرآن تمہارے حق میں دلیل ہے یا تمہارے خلاف دلیل بنے گا''۔ قرآن کی ہدایت سے استفادہ کرو گے تو یہ دنیا میں تمہارے لیے دلیل ہے اور آخرت میں تمہارے لیے شافع بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ جیسے کہ ایک حدیث میں روزے اور قرآن کے حوالے سے آتا ہے' حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' يَقُوْلُ الصِّيَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ ' وَيَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ ' فَيُشَفَّعَانِ)) (۱)

''روزہ اور قرآن (قیامت کے روز) بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے ربّ! میں نے اس شخص کو دن میں کھانے پینے اور خواہشاتِ نفس سے روکے رکھا' تو اُس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! اور قرآن یہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکے رکھا' لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! چنانچہ (روزہ اور قرآن) دونوں کی شفاعت (بندے کے حق میں) قبول کی جائے گی۔''

اس لحاظ سے قرآن مجید دنیا میں بھی حجت ہے' بایں طور کہ صحیح اور سیدھے راستے کی طرف آپ کی رہنمائی کرتا ہے اور قیامت میں بھی آپ کے حق میں شافع بن کر کھڑا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر قرآن کو آپ نے رد کر دیا' اس کے احکام کو آپ نے توڑ دیا یا قرآن کی ہدایت کو قبول کرنے سے اعراض کیا تو اس صورت میں یہ آپ کے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہوگا اور کہے گا: اے اللہ! یہ کہتا تو تھا کہ مجھ (قرآن) پر ایمان رکھتا ہے' حالانکہ حقیقی معنوں میں اس کا مجھ پر ایمان نہیں تھا۔ یہ مجھے پڑھتا ہی نہیں تھا اور نہ اس نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس قرآن کو ہمارے حق میں حجت بنا دے' اسے ہمارا امام وراہنما بنا دے اور اسے ہمارے حق میں رحمت بنا دے۔ آمین یاربّ العالمین!

---

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔و مسند احمد' ح: ٦٣٣٧۔

انسان اور مشقت: لازم وملزوم

زیرِ مطالعہ حدیث کا آخری ٹکڑا بڑا حکیمانہ ہے۔فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ، فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ)) ''سب لوگ صبح کرتے ہیں اور پھر وہ (دن بھر) اپنی جان کو بیچتے ہیں''۔ جان کو بیچنا کیا ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ایک مزدور' مزدوری کر رہا ہے تو وہ اپنی توانائی کو' اپنی قوت کو استعمال کر رہا ہے' گویا وہ اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔اسی طرح ایک ڈاکٹر اپنا علم بیچ رہا ہے' بایں طور کہ وہ اپنے کلینک پر بیٹھا مریض کو دیکھتا ہے' نسخہ لکھ کے دیتا ہے اور پھر اپنی فیس لیتا ہے۔ گویا یہ بھی اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔ اسی طرح وکیل اپنے دماغ کو بیچتا ہے' عدالت میں جا کر دلائل دیتا ہے اور اس کے پیسے لیتا ہے۔ الغرض ہر شخص اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔کوئی بھی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص صبح کرتا ہے تو اس کے بعد وہ دن بھر اپنے آپ کو بیچتا رہتا ہے۔اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنی صلاحیتیں ـــــ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہوئی ہیں ـــــ ان سب کو بروئے کار لاتا ہے' لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

اس نتیجہ کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا)) ''پس وہ اپنے نفس کو جہنم کی آگ سے بچا کر لے آتا ہے یا خود کو تباہ و برباد کر بیٹھتا ہے''۔ یعنی اگر اُس نے کوئی حرام کام نہیں کیا' کوئی غلط کام نہیں کیا' جھوٹ نہیں بولا' خیانت نہیں کی تو وہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ اس نے مزدوری کا معاملہ طے کیا تھا کہ میں شام تک یہ محنت کروں گا اور سو روپے لوں گا تو پھر اُس نے کوئی وقت ضائع نہیں کیا۔ اُس نے یہ نہیں کیا کہ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تو میں آرام کر لوں' کیونکہ یہ خیانت ہے' اس لیے کہ اسے اس وقت محنت کرنی چاہیے۔اسی طرح اگر آپ سرکاری ملازم ہیں' آپ کو تنخواہ ملتی ہیں' آپ کے لیے مختلف سہولتیں اور مراعات ہیں' لیکن اگر آپ آفس جا کر خوش گپیاں کریں' چائے پئیں اور دوستوں کو entertain کریں' جبکہ دوسری طرف سائلین پریشان ہو رہے ہوں' ان کے کام نہ ہو رہے ہوں' فائلوں کے انبار میز پر لگ رہے ہوں تو یہ خیانت ہے' اس لیے کہ آپ نے اپنے فرائض ادا نہیں کیے۔ اس اعتبار سے گویا مشقت تو جھیلی ہے' محنت تو کی

ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ نے اپنے نفس کو جہنم میں ڈال دیا ہے۔ مشقت اور محنت اپنی جگہ' لیکن آپ اگر ایسا کر رہے ہیں تو آپ شام کو گناہوں کی گٹھڑی لے کر واپس آ رہے ہیں۔ جبکہ اس مشقت اور محنت کے حوالے سے قرآن مجید میں قسمیں کھا کر کہا گیا ہے: ﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝١ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝٢ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝٣ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝٤﴾ ''نہیں' مجھے قسم ہے اس شہر (مکہ) کی' جس میں (اے نبی ﷺ!) آپ کو حلال کر لیا گیا ہے۔ اور مجھے قسم ہے باپ (یعنی آدم) اور اُس کی اولاد کی' کہ ہم نے انسان کو مشقت (کی حالت) میں (رہنے والا) پیدا کیا۔''

مشقت ہر انسان کا مقدر ہے

یہ مشقت اور محنت ہر انسان کا مقدر ہے' صرف نوعیت کا فرق ہے۔ بعض لوگوں کی جسمانی مشقت زیادہ ہے اور بعض لوگوں کی ذہنی مشقت زیادہ ہے۔ بعض لوگوں کو روٹی کی پریشانی ہوتی ہے' جبکہ بعض لوگوں کو اپنے نقصان کی پریشانی ہوتی ہے۔ کروڑ پتی ہیں لیکن نقصان آ گیا تو اب پریشانی ہے' ایک رنج اور غم ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ دولت مندوں میں جس قدر دماغی امراض ہوتے ہیں وہ مزدوروں میں نہیں ہوتے۔ مزدور تو صبح سے شام تک محنت کر کے تھکے ہارے لیٹتے ہی سو جاتے ہیں اور پھر صبح ہی آنکھ کھلتی ہے۔ لیکن دولت مند لوگوں کو نیند کے لیے سکون آور دوائیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں ان کے بغیر نیند نہیں آتی۔

انسانی مشقت کے حوالے سے سورۃ الانشقاق میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝٦﴾ (الانشقاق) ''اے انسان! تو مشقت پر مشقت جھیلتے ہوئے آئے گا اور اپنے رب سے ملاقات کرے گا''۔ یعنی ایک کافر یا فاسق و فاجر شخص دنیا میں بھی مشقت جھیلتا ہے اور آخرت میں بھی ناکامی و بربادی سے دوچار ہوگا' جبکہ ایک بندۂ مؤمن جس نے دنیا میں مشقتیں اور مصیبتیں جھیلی ہیں اور اس پر صبر کیا ہے' اسی طرح اللہ کے دین کے لیے مشقت کی ہے' ایثار کیا ہے' بھاگ دوڑ کی ہے' اللہ کے دین کی دعوت اور اس کی اقامت کی جدّ وجُہد میں اپنی صلاحیتیں گھلائی ہیں تو ایسے

شخص کے لیے آخرت میں سکون و راحت ہو گی۔ سورۃ الواقعہ میں ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾﴾ ''پس اس کے لیے آرام و آرائش اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ ہیں''۔ان کے لیے وہاں کوئی مشقت نہیں ہے' وہاں تو بس آرام اور راحت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص کا مقدر ہے کہ وہ محنت کرتا ہے' مشقت کرتا ہے' تکلیفیں جھیلتا ہے' حتیٰ کہ آپ یوں سمجھئے کہ حیوانات کے مقابلے میں ایک اعتبار سے انسان کا معاملہ زیادہ خراب ہے۔اس لیے کہ حیوانات میں وہ احساسات نہیں ہوتے جو انسان میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کا جوان بیٹا آپ کے سامنے سینہ تان کر کہے: چھوڑیں' ابا جان! آپ تو دقیانوسی قسم کی باتیں کرتے ہیں اور میں آپ کی ان باتوں کو نہیں مانتا تو اس پر جو رنج و غم آپ کو ہوگا وہ کسی بیل گائے یا کسی اور حیوان کو کبھی نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ وہ ان احساسات سے عاری ہیں۔اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ سب سے زیادہ لاچار انسانی بچہ ہوتا ہے۔بکری کا بچہ پیدائش کے فوراً بعد کھڑا ہونا شروع کر دیتا ہے۔کچھ دیر اس کی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور اس کے بعد وہ صحیح طور سے کھڑا ہو جاتا ہے۔جبکہ انسان کے بچے کو کس قدر نگہداشت (care) اور محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے' کس قدر اس کے لیے راتوں کو اپنی نیندیں حرام کرنی پڑتی ہیں' کس طرح اس کے لیے پیٹ کاٹ کر سارا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔اس اعتبار سے انسان لدو اونٹ کی طرح ہے۔

تقسیمِ دولت کا غلط نظام: دودھاری تلوار

خاص طور پر جب کسی معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک طرف دولت کے انبار لگ جائیں گے اور دوسری طرف بھوک' احتیاج اور فاقہ ہوگا۔اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کہا ہے کہ تقسیم دولت کا یہ غلط نظام دو دھاری تلوار ہے' جو اِدھر بھی کاٹتی ہے' اُدھر بھی کاٹتی ہے۔ اِدھر دولت جمع ہو گئی ہے تو عیاشیاں ہوں گی' بدمعاشیاں ہوں گی' اللّے تللّے ہوں گے۔وہ بھی گویا انسان اپنی جان کو ہلاک کر رہا ہے۔اسی لیے فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ

الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ (بنی اسرائیل) ''یہ بے جا خرچ کرنے والے تو شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے''۔ یہ فضول خرچ اس لیے بن گئے ہیں کہ ان کے پاس دولت جمع ہو گئی ہے اور دولت اپنا ظہور چاہتی ہے۔ دولت والے دنیا پر اپنا رعب گانٹھنا چاہتے ہیں کہ ہماری دولت اور اس کے مظاہر دیکھو۔

دوسری طرف فقر و فاقہ ہے اور فقر کے حوالے سے یہ حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہیے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا)) (۱) ''فقر انسان کو کفر کے قریب لے جاتا ہے''۔ جب انسان کفر کے قریب آ گیا تو اب وہ ناشکرا بن کر اللہ سے شکایت کرے گا یا وہ حرام میں منہ مارے گا یا خودکشی کر کے حرام موت مر جائے گا۔ اس لحاظ سے دولت کی تقسیم کا غلط نظام واقعتاً دو دھاری تلوار ہے۔ لیکن ایک شخص فقر و فاقہ کے باوجود محنت کر کے حلال ذرائع سے اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا اہتمام کر رہا ہے تو ایسے شخص کو اللہ کا دوست کہا گیا ہے۔ ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے: ((اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ)) (۲) ''اکلِ حلال کے لیے محنت و مشقت کرنے والا اللہ کا دوست ہے''۔ دیکھئے لفظ ''حَبِیْب'' فعیل کے وزن پر ہے اور یہ فاعل اور مفعول دونوں کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ حَبِیْب کا معنی اللہ سے محبت کرنے والا بھی ہے اور اللہ کا محبوب بھی۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ)) (۳)

''امانت دار سچا تاجر (قیامت کے دن) انبیاء' صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَسِيْرًا

اس ضمن میں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ دنیا کی یہ محنت اور مشقت جھیل کر انسان آخرت کی کامیابیاں سمیٹتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾

(۱) مشکاة المصابیح' کتاب الآداب' ح: ۵۰۵۱۔ وضعیف الجامع الصغیر' ح: ۴۱۴۸' راوی: انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

(۲) یہ حدیث دستیاب ذخیرۂ حدیث میں نہیں مل سکی۔ (مرتب)

(۳) سنن الترمذی' ابواب البیوع' باب ما جاء فی التجار و تسمیة النبی ایاھم۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ⑧ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ⑨﴾(الانشقاق)
''تو جس کا اعمال نامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں دے دیا گیا تو اس کا حساب بہت آسان لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش لوٹ کر آئے گا''۔ آسان حساب کے بارے میں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کسی تفصیل میں جائے بغیر بس صرف سرسری دیکھ لینا ہے اور اس کے برعکس جس سے تفصیلی حساب لے لیا گیا گویا وہ ہلاک ہو گیا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَسِيْرًا))[1] ''اے اللہ! مجھ سے حساب لینا آسان حساب!'' ہمیں بھی اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اور خاص طور پر قرآن مجید کی وہ سورتیں جن کا اختتام حساب کتاب پر ہوتا ہے' ان کو پڑھ کر یہ دعا ضرور مانگنی چاہیے۔ مثلاً سورۃ الزلزال کے آخر میں حساب کتاب کا ذکر ہے' وہاں فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ⑧﴾
''تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ بھر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

اسی طرح سورۃ التکاثر کے آخر میں ہے: ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ⑧﴾ ''اُس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ تو ایسے مقامات کی تلاوت کے بعد کہنا چاہیے: اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَسِيْرًا!

فقر و فاقہ میں ملنے والے کھانے کا بھی حساب ہوگا

ایک حدیث میں یہ حساب کا معاملہ بڑے عجیب طریقے سے مذکور ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر کئی وقت کا فاقہ تھا۔ وہ گھر سے نکل کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی حال تھا کہ آپؐ خود بھی کئی دنوں کے فاقے سے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچان لیا کہ عمر اس وقت فاقے

(۱) رواہ احمد۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب احوال القیامۃ وبدء الخلق' باب الحساب والقصاص والمیزان۔

اور بھوک کی حالت میں ہیں اور میرے پاس اس لیے آئے ہیں کہ شاید یہاں کھانے کے لیے کچھ ہو۔ تھوڑی دیر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور ان کا بھی یہی حال تھا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاید اپنے لیے تو کچھ نہ کرتے' لیکن آپؐ اپنے ان دونوں ساتھیوں کو لے کر ایک انصاری صحابی ابوالهیثم بن تیهان رضی اللہ عنہ کے باغ میں پہنچے۔ ان کی تو گویا عید ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے اور ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) بھی۔ وہ دوڑ کر کچھ کھجوریں لے آئے ـــــ جسے عربی میں ''نُزُل'' کہتے ہیں' یعنی مہمان جیسے ہی آئے تو ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر فوری طور پر کچھ پیش کرنا۔ جیسے ہم مہمان کے آتے ہی اس سے پوچھتے ہیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟ اور پھر فوری طور پر وہ پیش کر دیتے ہیں ـــ اس کے بعد انصاری صحابیؓ نے چھری اُٹھائی تاکہ کسی جانور کو ذبح کریں اور گوشت پکائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی دودھ والے جانور کو ذبح نہ کرنا۔ انہوں نے ایک جانور ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دو اصحاب کے سامنے رکھا تو انہوں نے وہ تناول فرمایا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی کے اوپر کچھ بوٹیاں رکھ کر کہا: جاؤ عائشہ کو دے آؤ' اسے بھی کئی وقت کا فاقہ ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((هٰذَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مِنَ النَّعِیْمِ الَّذِیْ تُسْاَلُوْنَ عَنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ)) (۱)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' یاد رکھو کہ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں تم سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔''

دیکھئے' اس فقر وفاقے اور احتیاج میں یہ چند چیزیں ملی ہیں تو ان کا حساب بھی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ یومِ حشر کے حساب کو ہمارے لیے آسان کر دے اور ہمیں دنیا میں حق کے لیے' خیر کے لیے' اللہ کے دین کے لیے مشقت کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزهد' باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبی۔

حدیث
24

حرمتِ ظلم اور حقیقتِ توحید

۱۱/اپریل ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (لقمٰن)

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ (العنکبوت)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيْمَا يَرْوِيْهِ عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ : اَنَّهٗ قَالَ :

((يَا عِبَادِيْ! اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِيْ ، وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا ، فَلَا تَظَالَمُوْا ، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ ، فَاسْتَهْدُوْنِيْ اَهْدِكُمْ ، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهٗ ، فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ اُطْعِمْكُمْ ، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ كَسَوْتُهٗ ، فَاسْتَكْسُوْنِيْ اَكْسُكُمْ ، يَا عِبَادِيْ! اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ، وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ، فَاسْتَغْفِرُوْنِيْ اَغْفِرْ لَكُمْ ، يَا عِبَادِيْ! اِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ ، وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ ، يَا عِبَادِيْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ ، كَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْكُمْ ، مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا ، يَا عِبَادِيْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُّلْكِيْ شَيْئًا ، يَا عِبَادِيْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ

وَآخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلُوْنِيْ، فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَّسْاَلَتَهٗ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ، يَا عِبَادِيْ! اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ، ثُمَّ اُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا، فَمَنْ وَّجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَنْ وَّجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ))(۱)

سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث قدسی روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے کہ کسی پر ظلم کروں اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے' لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوائے اُس کے جسے میں ہدایت دوں' پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو تو میں تمہیں ضرور ہدایت دوں گا۔ میرے بندو! تم میں سے ہر ایک بھوکا ہے سوائے اُس کے جسے میں کھانا دوں' پس تم مجھ سے کھانا مانگو تو میں تمہیں ضرور کھانا دوں گا۔ میرے بندو! تم میں سے ہر ایک ننگا ہے سوائے اُس کے جسے میں لباس پہناؤں' پس تم مجھ سے لباس طلب کرو تو میں تمہیں لباس دوں گا۔ میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہ معاف کرنے والا ہوں' پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو تو میں تمہیں بخش دوں گا۔ میرے بندو! تم میرے نقصان کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور نہ تم میرے نفع کو پہنچ سکتے ہو کہ مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ میرے بندو! تم میں سے اگلے پچھلے انسان اور جن' اگر سب کے سب اپنے میں سے متقی ترین دل والے شخص کی مانند بن جائیں تو اس سے میری حکومت میں بالکل اضافہ نہ ہو گا۔ میرے بندو! اگر تم میں سے اگلے پچھلے انسان اور جن' سب کے سب اپنے میں سے فاجر ترین دل والے شخص کی مانند بن جائیں تو اس سے میری حکومت میں بالکل کمی نہیں آئے گی۔ میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے انسان اور جن' تمام کے تمام کھلے میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو اُس کے مانگنے کے مطابق دیتا جاؤں تو اس سے میرے خزانوں میں بس اتنی سی کمی آئے گی جتنی سمندر میں سوئی

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔

ڈبو کر نکالنے سے سمندر میں کمی آتی ہے۔ میرے بندو! یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے محفوظ کر رہا ہوں' پھر میں تمہیں ان ہی کی پوری پوری جزا دوں گا' پس جو شخص اچھا نتیجہ پائے وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور جسے اچھا نتیجہ نہ ملے تو وہ صرف اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔''

معزز سامعین کرام!

یہ جو طویل حدیث میں نے آپ کو سنائی ہے' یہ اربعین نووی کی حدیث ۲۴ ہے اور یہ حدیث قدسی ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ـــــ جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہم حدیث ۱۸ کے مطالعہ میں پڑھ چکے ہیں: ((مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰی تَوَاضُعِ عِيْسٰی فَلْيَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ذَرٍّ)) ''جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد و تقویٰ دیکھے تو وہ ابوذر کو دیکھ لے'' ـــــ اس حدیث قدسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے اس طویل حدیث قدسی کے الفاظ سے یہ کیفیت محسوس کی ہو گی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے خطاب کا بڑا ہی محبت بھرا اور بڑی ہی شفقت والا انداز ہے۔

اَللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ

زیر مطالعہ حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں یہ پوری حدیث اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مبارک ''اَلْغَنِیّ'' کی تشریح اور وضاحت پر مبنی ہے۔ غَنِی کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی اس کا ترجمہ بے پروا کیا جاتا ہے اور کبھی بے نیاز' یعنی اسے نہ کوئی بڑی احتیاج ہے اور نہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی احتیاج ہے۔ الغرض وہ ہر شے سے بے پروا اور بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ نام قرآن مجید میں بہت مرتبہ آیا ہے ـــــ ''غَنِیٌّ حَمِيْدٌ'' تین مرتبہ آیا ہے۔ ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾(لقمٰن) ''اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ غنی اور محمود ہے''۔ یعنی وہ بے پروا بھی ہے اور از خود محمود بھی ہے۔ کوئی اس کی حمد کرے نہ کرے' اس کی حمد پوری کائنات کر رہی ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ مِّنْ

شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ﴾(بنی اسرائیل:٤٤) ''اس کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح وتحمید نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے'' ـــــ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۳ میں ''غَنِیٌّ حَلِیْمٌ'' بھی آیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ﴾ ''اللہ تعالیٰ بہت بے نیاز اور بہت حلیم ہے''۔ یعنی وہ تمہارے گناہوں پر فوراً نہیں پکڑتا بلکہ تمہیں توبہ اور اصلاح کی مہلت دیتا ہے ـــــ اسی طرح سورۃ النحل میں ''غَنِیٌّ کَرِیْمٌ'' بھی آیا ہے: ﴿وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ﴾ ''اور جو کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بہت بے نیاز اور بہت ہی مہربان ہے۔''

''اَلْغَنِی'' کا لفظ قرآن مجید میں آٹھ مرتبہ آیا ہے اور جو آیات میں نے ابتدا میں تلاوت کیں اُن میں بھی یہ لفظ مذکور ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ پہلی آیت سورۂ لقمان کی ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰهِ﴾ ''اور ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی تھی کہ شکر کر اللہ کا''۔ یعنی دانائی اور حکمت کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر انسان میں پیدا ہو جائے ـــــ سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس ۳ ہے۔ یہ رکوع حکمت قرآنی' فلسفہ قرآنی اور خاص طور پر فلسفہ ایمان کے ضمن میں قرآن حکیم کا بہت جامع مقام ہے۔ زیر مطالعہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ہی لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی تھی تاکہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ﴾ ''اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ اپنے ہی بھلے کے لیے شکر کرتا ہے''۔ اس کے شکر کرنے میں اللہ کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس شکر سے وہ اللہ کی کوئی ضرورت پوری کر رہا ہے۔ لہٰذا اگر وہ شکر کر رہا ہے تو وہ اپنے بھلے اور اپنے فائدے کے لیے ہی کر رہا ہے' بایں طور کہ اگر انسان میں اللہ کے لیے شکر کا مادہ ہے تو اس کی اپنی شخصیت کا صحیح رخ پر اٹھان ہوگا اور درحقیقت یہ اُس کی اپنی صحتِ معنوی' صحتِ باطنی اور صحتِ روحانی کی دلیل ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ کَفَرَ......﴾ ''اور جو کفر کرے......'' یہاں کفر کے معنی ناشکری کرنے کے ہیں۔ ہم اردو میں بھی ''کفرانِ نعمت'' بولتے ہیں۔ اس لیے کہ لفظ کفر کا اصل

مفہوم ہے: کسی چیز کو چھپا دینا۔ ''کفّارہ'' کی وجہ تسمیہ بھی یہ ہے کہ آپ سے کوئی گناہ ہوگیا اور آپ نے کفارہ ادا کر دیا تو وہ کفارہ آپ کے گناہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اسی اعتبار سے کاشت کاروں کو بھی ''کُفّار'' کہا گیا ہے ـــــ قرآن مجید میں ہے: ﴿اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ (الحدید: ۲۰) ''بارش کی اپجائی ہوئی کھیتی کاشت کاروں کو بہت اچھی لگتی ہے'' ـــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی بیج کو زمین میں چھپاتا ہے اور پھر وہ پودا بن کر نکلتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اگر احساسِ شکر قلب میں پیدا ہو اور انسان اس کو دبا دے' زبان سے ادا نہ کرے تو یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی توحید اور اللہ تعالیٰ کے وجود کی گواہی انسان کے باطن میں سے اُبھرے' لیکن انسان اس کو دبا دے تو یہ کفر ہے۔ تو فرمایا: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴿۱۲﴾﴾ ''اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ غنی اور محمود ہے''۔ یعنی اللہ کو کسی کے شکر کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔ جبکہ ناشکرا شخص خود اپنا بیڑا غرق کر رہا ہے' اپنی تباہی مول لے رہا ہے اور اپنی عاقبت برباد کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تو از خود محمود ہے' چاہے کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

''حَمد'' کا اصل مفہوم

عام طور پر ہمارے ذہن میں حَمد کا مفہوم تعریف اور ثناء ہے' حالانکہ حمد کا اصل مفہوم ہے: شکر کرنا' تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا معنی ہوگا: کُل شکر' کُل ثناء اور کُل تعریف اللہ کے لیے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جو دعائیں ہمیں تلقین کی گئی ہیں ان میں شکر کے مقام پر لفظ حمد آتا ہے۔ مثلاً آپ بھوک اور نقاہت محسوس کر رہے تھے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو کھانا دیا۔ اب آپ کے اندر قوت اور طاقت لوٹ آئی تو آپ یہ دعا پڑھیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ''کُل شکر اُس اللہ کا ہے جس نے مجھے کھلایا' پلایا اور مجھے مسلمانوں میں سے بنایا''۔ اسی طرح جب صبح ہماری آنکھ کھلتی ہے تو ہم پڑھتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْر ''کُل شکر اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے دوبارہ زندگی عطا کی اس کے بعد کہ مجھ پر موت طاری ہوگئی تھی اور پھر واپس اسی کی طرف لوٹ جانا ہے''۔ نیند میں انسان کا شعور

جاتا رہتا ہے' جبکہ موت میں انسان کی جان چلی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور حضور اکرم ﷺ نے نیند اور موت کو ایک دوسرے کی بہنیں قرار دیا ہے' لہٰذا جب صبح ہماری آنکھ کھلتی ہے تو یہ دعا زبان پر آ جانی چاہیے۔

سیکولرازم' اللہ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت

دوسری آیت جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے تلاوت کی' وہ سورۃ العنکبوت کی آیت ٦ ہے۔ یہ آیت اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں دین کے دوسرے لیول کا ذکر ہے۔ ایک سطح تو یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر بجالائے' اللہ کے احکام پر چلے' نماز پڑھے' روزہ رکھے' صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرے اور صاحبِ استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرے۔ اسی طرح حرام سے بچے اور حلال پر اکتفا کرے۔ یہ ایک لیول ہے' جبکہ اس سے اوپر کا معاملہ ہے اللہ کے لیے جہاد کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت' اس کی کبریائی اور اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے تَن مَن دُھن لگا دینا۔ جیسے کہیں کسی بادشاہ کے خلاف بغاوت ہو جائے تو بادشاہ کے وفادار لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بادشاہ کی بادشاہت دوبارہ قائم (restore) ہو جائے۔ آج پوری دنیا میں اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں سیکولرازم کا اصول سب کے نزدیک مسلّم ہے اور یہ سب سے بڑی بغاوت ہے جو تاریخ انسانی میں اللہ تعالیٰ کے خلاف ہوئی ہے۔

پہلے تو صرف یہ ہوتا تھا کہ ایک بڑے خدا کے ساتھ کچھ چھوٹے چھوٹے خدا بھی نتھی کر دیے جاتے تھے' لیکن اس بڑے خدا کا انکار تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ہوا۔ اللہ کو بھی مانتے تھے اور آلہہ کو بھی مانتے تھے۔ ہندوستان میں ''مہادیو'' کو بھی مانتے تھے اور دیوی دیوتاؤں کو بھی۔ یورپ میں God (بڑے ''G'' کے ساتھ) ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور اس کی صفات مانی جاتی تھیں: خالقِ کُل (The Omnificent)' قادرِ مطلق (The Omnipotent)' ہر جگہ موجود' حاضر و ناظر (The Omnipresent)' ہر چیز کا جاننے والا' علام الغیوب (The Omniscient)۔ جبکہ اس بڑے خدا (God) کے ساتھ بہت سے دیوی دیوتا (gods & godesses) بھی مانے جاتے تھے۔

اب سب سے بڑی بغاوت یہ ہوئی کہ اللہ کو مہادیو کو یا جس کو بھی تم نے God سمجھا ہے اس کو انسان کی اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ جس طرح ہندوؤں نے مندر میں بت رکھا ہوا ہے کہ لوگ وہاں جاتے ہیں اس کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہیں ڈنڈوت کرتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں اسی طرح ہم نے بھی اللہ کو مسجدوں تک محدود کر دیا ہے۔ ہم مسجدوں میں آتے ہیں رکوع و سجود کر لیتے ہیں لیکن باہر جا کر تو ہم اللہ کو اللہ نہیں مانتے۔ ہماری پارلیمنٹ نہیں مانتی ہماری عدالتیں نہیں مانتیں۔ اللہ کا حکم ہے تو ہوا کرے ہم تو اس ملک کے دیوانی اور فوجداری قوانین کے مطابق فیصلے کریں گے۔ جبکہ بنیادی طور پر اس پورے قانون کا ڈھانچہ human law کے اوپر تیار ہوا ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جدّوجُہد سے بھی اللہ غنی ہے!

اجتماعی نظام سے اللہ کو بے دخل کیا جانا تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی بغاوت ہے جو اللہ اور اس کے نظام کے خلاف کی گئی ہے۔ اب اس کو restore کرنے اور اجتماعی نظام کو اللہ کی بادشاہت کے ماتحت کرنے کے لیے جو شخص جدوجہد کر رہا ہے تو یہ بہت ہی اونچا کام ہے۔ انسان کے جتنے بھی افعال ہیں ان میں سے جہاد سب سے اونچی شے ہے لیکن اس کے بارے میں بھی سورۃ العنکبوت کی زیرِ مطالعہ آیت میں فرما دیا گیا: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ''اور جو شخص جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تو سارے جہانوں سے بے پروا ہے''۔ یعنی جو کوئی ہماری راہ میں جان و مال کھپاتا ہے مشقتیں اور مصیبتیں برداشت کرتا ہے ـــــ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ﴾ ''اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہنے والے'' ـــــ اسے بھی کبھی یہ خیال نہ آ جائے کہ وہ ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے یا اس سے ہماری کوئی ضرورت پوری ہو رہی ہے یا معاذ اللہ! ہمارے کسی معاملے میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا جسے وہ درست کر رہا ہے۔ الغرض جو جہاد کر رہا ہے وہ اپنے بھلے کے لیے کر رہا ہے اور اس کا سارا اجر و ثواب اسی کو ملے گا اسی کی عاقبت سنورے گی اور اللہ تعالیٰ

کے ہاں اس کو بلند سے بلند تر مقامات جنت میں حاصل ہوں گے۔ گویا قرآن مجید ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کا تصور دیتا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی' کسی درجے میں بھی اور کسی اعتبار سے بھی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج ہے۔

معاملات کی اہمیت مسلّم ہے!

اب آیئے اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں سب سے پہلی بات انسانی معاملات کی درستگی سے متعلق آئی ہے' اس لیے کہ ہمارے دین میں عبادات اور معاملات دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ عام مذہبی ذہن عبادات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ نماز روزہ کے بارے میں ذرا کمی بیشی ہو جائے تو وہ بہت فکرمند ہوتے ہیں —— مثلاً جو رفع یدین کو ضروری سمجھتے ہیں وہ رفع یدین نہ کرنے والوں کی طرف سے بُعد محسوس کر رہے ہوتے ہیں' لیکن معاملات کے بارے میں وہ اتنے حساس نہیں ہوتے' حالانکہ دین کے اعتبار سے اہم تر چیز معاملات ہیں۔ اس لیے کہ تم نے اگر ایک دوسرے پر کوئی زیادتی کی ہے تو اس زیادتی کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا' بلکہ تمہیں ہی کسی نہ کسی حیثیت میں اس کی تلافی (compensation) کرنا پڑے گی۔ اگر تم نے دنیا میں ہی اس زیادتی کا بدلہ چکا دیا تو ٹھیک' ورنہ قیامت کے دن تمہاری نیکیاں اس کے حوالے کر دی جائیں گی جس کا حق تمہارے ذمہ ہے' اور اگر تمہاری نیکیاں کم ہوں گی تو پھر حق داروں کے گناہ تمہارے حساب میں درج ہوں گے۔ الغرض انسانی معاملات کے ضمن میں یہ ڈیبٹ کریڈٹ ہوتا رہے گا۔ البتہ عبادات کے معاملے میں اللہ غنی ہے اور عبادات میں کمی کوتاہی کو اللہ معاف فرماتا ہے۔ اگرچہ اسے اس کا پورا حق ہے' لیکن وہ بہت بلند و بالا ہے کہ اپنے حق کے بارے میں آپ سے جھگڑے۔ البتہ ایک دوسرے پر تم نے اگر کوئی تعدّی' کوئی ظلم' کوئی حق تلفی' کوئی زیادتی کی ہے تو اس کے بارے میں لازماً پکڑ ہو جائے گی۔

معاملات کی اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے زیر مطالعہ حدیث میں سب سے پہلی بات انسانی معاملات ہی سے متعلق آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((يَا عِبَادِيْ! اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ))

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا ہے۔''

ظلم یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کے اچھے عمل کا بدلہ نہ دیا جائے اور ظلم یہ بھی ہے کہ کسی کو ایسے جرم کی سزا دی جائے جو اُس نے کیا ہی نہیں ہے۔ دنیا میں تو ایسا ہوتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ظلم کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔

((وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا ، فَلَا تَظَالَمُوْا))

''اور میں نے تم پر بھی آپس میں ظلم کو حرام کر دیا ہے' پس تم بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔''

لہٰذا کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ جان لو کہ اگر کسی کے بارے میں سوئے ظن کر رہے ہو تو یہ بھی زیادتی کر رہے ہو جب تک کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہ ہو۔ کسی کی غیبت کر رہے ہو تو یہ بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ تمہارا یہ فعل ایسا ہی ہے گویا تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہو۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یہ تو تمہیں بہت ناگوار لگے گا (پس تم غیبت نہ کرو)''۔ اسی طرح تم نے کسی کا مال مار لیا ہے' کسی کو دھوکہ دے کر کوئی شے زیادہ دام میں فروخت کر دی ہے' کسی نے اپنی بہنوں کا وراثتی حصہ ہڑپ کر لیا ہے تو یہ ظلم ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنی ذات پر بھی ظلم کو حرام کیا ہے اور تمہارے مابین بھی ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے' لہٰذا تم بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا ظلم نہ کرو!

کُلّی اور جُزوی ہدایت

اس کے بعد فرمایا:

((يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ))

''تم میں سے ہر شخص گمراہ ہے سوائے اُس کے جس کو میں ہدایت دے دوں۔''

دیکھئے' ایک کلی ہدایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور ایمان کی طرف ہمیں ہدایت دے دی۔ پھر ایک جزوی ہدایت ہوتی ہے۔ ہر قدم پر اور ہر چوراہے پر یہ کشمکش آ جاتی ہے کہ

یہ کریں یا یہ کریں! تو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی محسوس ہو کہ ہدایت ملی ہے تو اللہ کے شکر کا کلمہ زبان سے نکلنا چاہیے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:٤٣) ''اور کہیں گے کہ کُل شکر اور کُل حمد وثناء اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی' اور ہم ہرگز ہدایت یافتہ نہ ہو سکتے تھے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا۔''

((فَاسْتَهْدُوْنِیْ اَهْدِكُمْ))

''پس مجھ سے ہدایت طلب کرتے رہا کرو' میں تمہیں ہدایت دوں گا۔''

اسی طلبِ ہدایت کا ذکر سورۃ الفاتحہ میں ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ ''(اے اللہ!) سیدھے راستے کی طرف ہماری راہنمائی فرما''۔ آپ کو معلوم ہے جو شخص یہ دعا مانگ رہا ہے وہ اللہ سے' اللہ کی توحید سے اور اس کی صفات سے واقف ہے۔ پھر وہ یومِ قیامت کو بھی مانتا ہے' اللہ کی رحمانیت' رحیمیت کو مانتا ہے اور اُس کے ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ ہونے کو بھی مانتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس بات کا بھی اقرار کر رہا ہے: ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ ''(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں'' — ان سب کے ہوتے ہوئے وہ کون سی ہدایت چاہتا ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ انسان ہر ہر قدم پر دوراہے پر آ جاتا ہے اور بسا اوقات دو چیزوں میں بہت باریک سا فرق ہوتا ہے' جیسے کہ تکبر اور عزتِ نفس میں بڑا باریک سا فرق ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص اپنی عزتِ نفس کے اعتبار سے کوئی طرزِ عمل اختیار کر رہا ہو' جبکہ دیکھنے والے سمجھیں گے کہ اس میں تکبر ہے۔ ایسے معاملات میں نیت کا اعتبار ہوگا اور انسان کا معاملہ اس کی نیت کے حوالے سے ہی اللہ کے ہاں آئے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے کلی ہدایت کے ساتھ ساتھ جزوی ہدایت بھی طلب کرنی چاہیے۔

اے میرے بندو! مجھ سے مانگو' میں تمہیں دوں گا

اس کے بعد وہ اصل معاملہ آ گیا جو میں نے کہا تھا کہ یہ حدیث اسم مبارک ''اَلْغَنِیّ'' کی تشریح پر مشتمل ہے۔ فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلاَّ مَنْ اَطْعَمْتُہٗ ، فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْکُمْ))

''اے میرے بندو! تم میں سے ہر شخص بھوکا ہے سوائے اُس کے جسے میں کھلاؤں' پس تم مجھ ہی سے کھانا مانگو' میں تمہیں کھانا ضرور دوں گا۔''

یعنی کھانے پینے اور رزق کی طلب مجھ سے کیا کرو' میں مزید دوں گا' اس لیے کہ میرے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔

((یَا عِبَادِیْ! کُلُّکُمْ عَارٍ اِلاَّ مَنْ کَسَوْتُہٗ ، فَاسْتَکْسُوْنِیْ اَکْسُکُمْ))

''اے میرے بندو! تم سب کے سب ننگے ہو' سوائے اُس کے جسے میں لباس عطا کروں' پس تم مجھ سے لباس طلب کرو۔''

((یَا عِبَادِیْ! اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْ لَکُمْ))

''اے میرے بندو! تم دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہوں۔ پس تم مجھ سے مغفرت چاہو' میں تمہیں (یعنی تمہارے سارے گناہوں کو) معاف کر دوں گا۔''

یعنی تم سے رات اور دن میں تقصیرات اور کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں' گناہ سرزد ہوتے ہیں' تو تم مجھ سے معافی مانگو' میں تمہاری معافی قبول کرنے والا ہوں۔ جیسے ایک حدیث میں آتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((کُلُّ بَنِیْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۱)

''تمام بنی آدم بہت خطا کار ہیں' لیکن ان خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔''

خَطَّاء 'فَعَّال کے وزن پر (قَھَّار کی طرح) مبالغے کا صیغہ ہے' لہٰذا اس کے معنی انتہائی خطا کار کے ہیں۔ یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سب کے سب انتہائی خطا کار ہو' بایں طور کہ تم دن رات خطائیں کرتے ہو' لیکن گناہوں کی کثرت کے باوجود اگر کوئی خطا کار توبہ کر لے تو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں اور اللہ ایسے لوگوں کے تمام گناہ

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔

معاف فرما دیتا ہے ـــــ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَاهْدِنَا وَارْزُقْنَا!

آگے فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ))

''اے میرے بندو! تم ہرگز میرے نقصان کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ۔''

تمہاری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچا سکو۔ تم اگر کفر کر رہے ہو تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے' اسی طرح اگر تم میری جناب میں گستاخیاں کر رہے ہو تو یہ گستاخیاں بھی میرے کسی نقصان کا باعث نہیں ہیں۔

((وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ))

''اور نہ ہی تم میرے نفع کو پہنچ سکتے ہو کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔''

یہ بات بھی اللہ کی اس صفت کا مظہر ہے کہ وہ الغنی ہے اور اسے کسی کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔

اللہ ربّ العزت کی شانِ بے نیازی

زیر مطالعہ حدیث میں آگے جو الفاظ آ رہے ہیں وہ اس حدیث کا ذروۂ سنام (climax) ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ ، وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ ، کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا))

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے' اور انسان اور جن' سب کے سب تم میں سے متقی ترین دل والے شخص کی مانند بن جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔''

گویا پوری نوعِ انسانی' پہلے بھی اور پچھلے بھی' اور جن اور انس بھی' سب کے سب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے بن جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا ـــــ آگے ربّ العزت نے فرمایا:

((یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ ، وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُّلْکِیْ شَیْئًا))

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے' اور انسان اور جن' سب کے سب تم میں سے فاجر ترین دل والے شخص کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

یعنی اگر سب کے سب ابو جہل بن جائیں یا شیطانِ لعین اور عزازیل بن جائیں' تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی ــــــ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((يَا عِبَادِيْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلُوْنِيْ، فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَّسْاَلَتَهٗ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ))

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے' اور انسان اور جن' سب کے سب ایک میدان میں جمع ہو کر اپنی پہنچ کے مطابق مجھ سے سوال کریں اور میں ان کے مانگنے کے مطابق انہیں دیتا جاؤں تو اس سے میرے خزانوں میں بس اتنی سی کمی واقع ہوگی جتنی سمندر میں سوئی ڈبو کر نکالنے سے سمندر میں کمی آتی ہے۔''

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ یہ حدیث اللہ ربّ العزت کی شانِ استغناء سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے بالکل بے نیاز ہے۔ اس کی کوئی احتیاج' چھوٹی سے چھوٹی' بڑی سے بڑی' کسی بھی مخلوق سے یعنی کسی انسان' کسی جن اور کسی فرشتے سے نہیں ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیث کا آخری حصہ

زیرِ مطالعہ حدیث کے آخری ٹکڑے میں قیامت کے دن ہونے والے حساب و کتاب اور جزا و سزا کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((يَا عِبَادِيْ! اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ، ثُمَّ اُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا))

''اے میرے بندو! یہ تو تمہارے اعمال ہیں جن کو میں محفوظ کر کے رکھ رہا ہوں' پھر میں تمہیں ان ہی کی پوری پوری جزا دوں گا۔''

مجھے کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ اسے اپنی دشمنی کی وجہ سے جہنم میں ڈالوں۔ مجھے کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ میں اس کو جہنم میں جھونک کر اپنے اس نقصان کی تلافی کروں۔ مجھے تو کوئی احتیاج نہیں' البتہ تمہارے اعمال میرے پاس محفوظ ہو رہے ہیں اور کل

قیامت کے دن میں تمہیں ان کا بدلہ ضرور دوں گا۔ اس ضمن میں سورۃ الزلزال میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ ''جس کسی نے ذرّے کے برابر بھی خیر کمایا ہوگا تو وہ اسے اپنے سامنے موجود پائے گا' اور جس کسی نے ذرّے کے برابر بھی برائی کمائی ہوگی تو وہ بھی اسے اپنے سامنے موجود پائے گا'' — ''ذرّہ'' کسے کہتے ہیں' اس کو بھی جان لیجیے۔ آج کل تو خیر ہمارے تصورات میں ایٹم وغیرہ بھی آ جاتا ہے' جبکہ پہلے زمانے میں سب سے چھوٹی چیز جو انسان اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا وہ چیونٹیوں کے نوزائیدہ بچے تھے اور ان کو ''ذرّات'' (واحد ''ذرّہ'') کہا جاتا ہے۔

آگے فرمایا:

((فَمَنْ وَّجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ))

''پس جو شخص (اپنے اعمال نامہ میں) کوئی خیر پائے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔''

اس لیے کہ بہرحال ہدایت اور نیکی کی توفیق تو اللہ نے ہی دی تھی تو پھر اس پر شکر بھی لازم ہے۔ جیسے کہ ابھی میں نے سورۃ الاعراف کی یہ آیت آپ کو سنائی: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾۔ یہ دراصل اہلِ جنت کا ترانۂ حمد ہے۔ اہلِ جنت' جب جنت میں داخل ہوں گے تو اُس وقت ان کے قلب کی گہرائیوں سے یہ ترانۂ حمد اُبھر کر آئے گا۔ اس لیے کہ اہل ایمان دنیا میں تو ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور کسی کو اپنے عمل پر کوئی غرور اور کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت آسان حساب کی دعا مانگتے رہتے ہیں' اس لیے کہ اگر کہیں تفصیل سے محاسبہ شروع ہو گیا تو پھر کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اللہ کے ہاں کامیاب ہو سکے۔

اس ضمن میں یہ حدیث بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) ''تم میں سے کسی شخص کا عمل اسے ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا (جب تک کہ اللہ کی رحمت اس کی دستگیری نہ فرمائے)''۔ اب کسی صحابی نے بڑی ہمت' حوصلے اور جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھ لیا: وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ

اللّٰہِ!'' یارسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ بھی؟ (اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتے)''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((لَا وَلَا اَنَا' اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَۃٍ))(۱) ''ہاں میں بھی' اِلا یہ کہ اللہ عزوجل اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت کی چادر سے مجھے ڈھانپ دے۔''

غلوِعقیدت اور غلوِمحبت سے احتراز لازم ہے!

دیکھئے' حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل و احسان اور اس کی رحمت کے بغیر میرا داخلہ بھی جنت میں نہیں ہو سکتا اور یہی ہمارے دین کی تعلیم ہے' جبکہ ہمارے ذہنوں میں انبیاء و رسل کی شانوں میں کس کس درجے کے مغالطے ہوتے ہیں۔ یہ غلوِعقیدت اور غلوِمحبت ہی تو ہے کہ جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا۔ یہ کسی بدنیتی کا نتیجہ نہیں ہے' بلکہ یہ محبت اور عقیدت کا غلو ہے۔ پھر اسی غلو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کا اوتار بنوا ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قیامت تک محفوظ رکھنا تھا' لہٰذا یہ گستاخی حضور ﷺ کی شان میں کسی نے نہیں کی کہ حضور ﷺ کو اللہ کا اوتار قرار دیا ہو۔ ویسے تو ایسے بے شمار اشعار ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے غلو سے کام لیا گیا ہے' مثلاً:

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر☆

(۱) صحیح البخاری' کتاب المرضیٰ' باب تمنی المریض الموت' ح: ۵۶۷۳ ۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بعمله......' ح:۲۸۱۸۔

☆اسی طرح ایک شعر کچھ یوں ہے:

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر بغیر عین کے اک عرب ہم نے دیکھا!

''عرب'' کے لفظ سے اگر ''ع'' کو ہٹا دیا جائے تو باقی ''رب'' بچتا ہے۔ ہمارے نعت خواں حضرات تو حضور ﷺ سے عشق و محبت کے اظہار میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کو ربّ کے برابر بٹھائے بغیر اپنے عشق و محبت کو مکمل ہی نہیں سمجھتے۔ (مرتب)

لیکن یہ صرف شاعری کا معاملہ ہے اور شعروں میں تو غلو ہوتا ہی ہے۔ اس سے تو کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس ضمن میں فرمایا گیا:
﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾﴾ ''اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں رہتے ہیں' اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں!''

حضور اکرم ﷺ کو شعروں میں تو خدا کے برابر بٹھا دیا گیا' مگر بالفعل کسی نے حضور کو اللہ کا اوتار قرار نہیں دیا' جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا ماننے والے پیدا ہوئے اور عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ فتنہ کھڑا کیا تھا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ شام اور لبنان کے اندر ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں جو علوی وغیرہ کہلاتے ہیں اور جن کا عقیدہ ہے کہ علی اللہ ہی کے اوتار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ میں صرف اس اعتبار سے بتا رہا ہوں کہ حضور ﷺ کے مقابلے میں حضرت علیؓ کی کیا حیثیت ہے! بہرحال حضور ﷺ کو اللہ نے محفوظ رکھا' اس لیے کہ سارے دین کا معاملہ آپ ﷺ کے ساتھ وابستہ ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

حضرت علیؓ حضور ﷺ کے صحابی ہیں' ان کی آپؐ نے تربیت فرمائی' تزکیہ فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی گود میں پلے ہیں۔ تو یہ گستاخی حضرت علیؓ کے ساتھ کی گئی ہے' لیکن اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اس سے بچایا ہے۔

''تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرو گے!''

عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دینا عقیدت و محبت کا غلو ہے۔ یہی غلو ہمارے ہاں بھی چلا آ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سرشت بدلتی نہیں ہے۔ پہلے والے انسان جس طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے تھے' ایسے ہی آج بھی ہو گئے ہیں۔ ایک حدیث میں تو رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا:

((لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ وَبَاعًا بِبَاعٍ

حَتّٰی لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ دَخَلَ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمْ وَحَتّٰی لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ جَامَعَ أُمَّهُ لَفَعَلْتُمْ)) (۱)

''تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرو گے بالشت در بالشت' ہاتھ در ہاتھ اور باع (دونوں ہاتھوں کی لمبائی) در باع' یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہو گا تو تم بھی ضرور گھسو گے۔ اور اگر ان میں سے کسی بد بخت نے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہو گی تو تم بھی ایسا ضرور کرو گے۔''

امام بخاری و مسلم کی نقل کردہ روایت کے آخر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ سوال بھی درج ہے کہ انہوں نے پوچھا: ((یَارَسُوْلَ اللّٰہِ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی؟)) ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ؟)) ''تو اور کون مراد ہیں؟'' یعنی تم سے پہلے کی اُمت یہود و نصاریٰ ہی تو ہیں۔ اور وہ اُمت مسلمہ بھی تھے۔ ہم اس زعم میں نہ رہیں کہ ہم ہی امت مسلمہ ہیں۔ وہ جو غالب نے کہا تھا کہ ؎

ریختہ کے تم ہی اُستاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا!

اسی طرح صرف ہم ہی اُمت مسلمہ نہیں ہیں' بلکہ ہم سے پہلے یہود بھی امت مسلمہ تھے۔ اور نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر ان ہی یہودیوں کے بارے میں آیا ہے کہ ہم نے انہیں تمام انسانوں پر فضیلت دی۔ دو مرتبہ سورۃ البقرۃ میں آیا ہے' چنانچہ سورۃ البقرۃ کے چھٹے رکوع کی پہلی آیت اور پندرہویں رکوع کی پہلی آیت کے الفاظ یکساں ہیں:

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ○﴾

''اے یعقوب کی اولاد! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی' لیکن ان میں گمراہیاں پیدا ہو گئیں اور ان کی ایک بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے تورات میں تحریفات کیں۔

(۱) السلسلة الصحيحة للالبانی' ح ۱۳۴۸۔ ومجمع الزوائد للهيثمی۔ راوی: عبداللہ بن عباسؓ۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ قرآن مجید کی حفاظت اپنے ذمے لے لی تو یہ اُمت اس گمراہی سے بچی ہوئی ہے' لیکن یہ حفاظت صرف متن قرآن کو حاصل ہے۔ ترجموں اور تفسیروں میں تحریفیں ہوئی ہیں اور ڈٹ کر ہوئی ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

البتہ قرآن مجید کے متن کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی حفاظت میں ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر) ''بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں''۔ ورنہ نوٹ کر لیجیے کہ اگر تورات اور انجیل کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ اپنے ذمے لے لیتا تو کیا ان میں کوئی تحریف ہو سکتی تھی؟ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حفاظت میں قرآن مجید کو نہ لے لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن میں تحریف سے باز رہتے؟

حرفِ آخر

ہم زیر مطالعہ حدیث قدسی کے آخری الفاظ پر گفتگو کر رہے تھے:

((يَا عِبَادِيْ! اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ، ثُمَّ اُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا))

''اے میرے بندو! یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے گن گن کر محفوظ کر رہا ہوں' پھر میں تمہیں ان کی پوری پوری جزا دوں گا''

وَفّٰى ، يُوَفِّي: پورا پورا دینا' پورے اہتمام سے دینا۔ اَوْفٰى يُوْفِي (باب افعال سے) کے معنی بھی یہی ہیں کہ پورا پورا دینا' لیکن باب افعال کے مقابلے میں باب تفعیل کے اندر بہت وزن ہوتا ہے اور اس کا معنی ہے: رفتہ رفتہ پورا پورا دینا۔ چنانچہ اُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا کا مطلب یہ ہوگا کہ میں قیامت کے دن تمہارے اعمال کا بدلہ پورے کا پورے' بلا کم و کاست تمہیں عطا کر دوں گا۔ ((فَمَنْ وَّجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ)) ''تو جو کوئی اپنے اعمال نامے میں خیر پائے تو وہ اللہ کی حمد کرے''۔ اس لیے کہ اللہ ہی نے توفیق دی تھی اور اللہ ہی کے فضل و کرم سے تم نے وہ نیکی کے کام کیے تھے۔ اگر اللہ تمہیں نیکی کی توفیق

نہ دیتا تو تم وہ کام کیسے کر سکتے تھے' لہٰذا اُس کا شکر لازم ہے۔ آگے فرمایا:

((وَمَنْ وَّجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ))

''اور جو کوئی اس کے سوا پائے (یعنی شر' بدی اور برائی پائے) تو وہ اپنے نفس کے علاوہ کسی کو ملامت نہ کرے۔''

اس لیے کہ اس کا کمانے والا وہ خود ہے' لہٰذا وہ کسی اور کے اوپر اس کا الزام نہ دھرے اور اس کی پوری ذمہ داری خود ہی قبول کرے۔

زیر مطالعہ طویل حدیث قدسی میں ''يَا عِبَادِيْ'' (اے میرے بندو!) کی تکرار جس کیفیت سے ہوئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر شفقت کا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ﴾ (النساء:١٤٧) ''اللہ کو کیا لینا ہے تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کی روش اختیار کرو اور (صدقِ دل سے) ایمان لے آؤ''۔ تو اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ کسی کو تکلیف دے کر اسے کوئی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ یہ تو تمہارے اپنے اعمال ہیں جو ہم نے حفاظت کے ساتھ گن گن کر رکھے ہوئے تھے۔ آج ہم نے وہ اعمال تمہارے سامنے حاضر کر دیے ہیں تو جو ان میں خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے' اللہ کا شکر ادا کرے' اور جو اس میں شر پائے تو وہ سوائے اپنے نفس کے کسی کو ملامت نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث کے مندرجات کو سمجھنے اور اس پر صحیح معنوں میں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث 25 26 27

صدقے کا حقیقی مفہوم اور نیکی اور گناہ کی پہچان

۱۸/اپریل ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ﴿۱۸﴾ (الحدید)

وَیَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ:۲۱۹)

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴿۱۷۷﴾ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ اَنَّ نَاسًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِیِّ ﷺ:

یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْاُجُوْرِ، یُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّیْ، وَیَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَیَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ اَمْوَالِهِمْ، قَالَ: ((اَوَ لَیْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مَا تَصَدَّقُوْنَ بِهٖ؟ اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِیْحَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ

تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ ، وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ ، وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ ، وَنَهْيٌ عَنْ مُّنْكَرٍ صَدَقَةٌ ، وَفِيْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ)) قَالُوْا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيَاْتِيْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ؟ قَالَ : ((أَرَاَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ، أَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ اَجْرٌ)) (۱)

سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اہل ثروت تو اجر وثواب میں سبقت لے گئے' کیونکہ وہ ہماری طرح نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں اور اپنے زائد مال میں سے صدقہ (بھی) کرتے ہیں (مال نہ ہونے کے سبب ہم صدقہ کرنے سے قاصر ہیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی صدقے کا سامان مہیا نہیں کیا؟ تمہارا ایک دفعہ 'سبحان اللہ' کہنا صدقہ ہے' تمہارا ایک دفعہ 'اللہ اکبر' کہنا صدقہ ہے' ایک دفعہ 'الحمد للہ' کہنا صدقہ ہے' ایک دفعہ 'لا الہ الا اللہ' کہنا صدقہ ہے' نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صدقہ ہے' اور ہم بستری کرنے میں بھی صدقہ کا ثواب ہے''۔ صحابہؓ نے کہا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرے تو اسے بھی ثواب ملتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا خیال ہے' اگر وہ اسے حرام جگہ استعمال کرے تو اسے گناہ نہ ہوگا؟ ایسے ہی حلال مقام پر استعمال کرنے پر اجر بھی ملے گا۔''

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم :

((كُلُّ سُلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ ، كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ)) قَالَ: ((تَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ ، وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَابَّتِهٖ فَتَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا' اَوْ تَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ ، صَدَقَةٌ)) قَالَ : ((وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ وَكُلُّ خُطْوَةٍ تَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ وَتُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ))(۲)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزکوۃ' باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب من اخذ بالرکاب ونحوہ۔ صحیح مسلم' کتاب الزکوۃ' باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انسان پر ہر جوڑ کی طرف سے روزانہ صدقہ کرنا ضروری ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے' سواری کے بارے میں کسی سے تعاون کرنا یعنی سواری پر سوار کرنا یا کسی کا سامان لاد کر اس کی مدد کرنا صدقہ ہے' اچھی بات صدقہ ہے' نماز کے لیے اُٹھنے والا ہر قدم صدقہ ہے' راستہ سے ایذا اور تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا بھی صدقہ ہے۔''

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رضی اللہ عنہ ' عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ :

((اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ ' وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (۱)

سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اصل نیکی 'حسن اخلاق' ہے' اور 'گناہ' وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو چاہتا ہو کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو۔''

وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ:

((جِئْتَ تَسْاَلُ عَنِ الْبِرِّ؟)) قُلْتُ : نَعَمْ ' قَالَ : ((اسْتَفْتِ قَلْبَكَ' الْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ ' وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ' وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ))(۲)

اور حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

''تم نیکی کے متعلق پوچھنے آئے ہو (کہ نیکی کیا ہے)؟'' میں نے کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے دل سے پوچھ لو! جس کام پر انسان کا دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے اور جو چیز دل میں کھٹکے اور اس کے متعلق سینہ میں تردد ہو' وہ گناہ ہے۔ خواہ لوگ تمہیں اس کے جواز کا بار بار فتویٰ ہی کیوں نہ دیں!''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تفسیر البر والاثم۔

(۲) سنن الدارمی' کتاب البیوع' باب دع ما یریبك الی ما لا یریبك ۔و مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث وابصة بن معبد الاسدی نزل الرقة' ح ۱۷۳۲۰۔

معزز سامعین کرام!

اسلام کو دینِ توحید کہا جاتا ہے اور اس کی توحیدی شان کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس میں دین اور دنیا میں کوئی جدائی نہیں ہے۔ اگر آدمی صرف دنیا کو دین کے تابع کر لے تو یہ ایک ہی وحدت بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر وہ کام جسے ہم دنیاداری یا خالص جسمانی اور حیوانی تقاضے سمجھتے ہیں' وہ سبھی دینداری میں شمار ہوں گے۔ یہ بات عبادت کے تصور سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾ ''میں نے جِنّوں اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں''۔ اب اگر اس عبادت سے نماز' روزہ مراد ہے تو پھر چوبیس گھنٹے نماز پڑھنی چاہیے اور ہر روز روزہ رکھنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا ممکن نہیں' تو یہاں عبادت سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی پوری زندگی کو اللہ کے تابع کر دو تو پھر رزقِ حلال کے حصول کے لیے تمہارا جدوجہد کرنا' تمہارا کمانا' اپنے اہل وعیال کے لیے تمہارا خرچ کرنا' یہاں تک کہ اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا بھی عبادت شمار ہوگا۔ یہ تصور آپ کو دینِ اسلام کے علاوہ دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ —— آج جو تین احادیث (۲۵'۲۶'۲۷) ہمارے زیر مطالعہ آئیں گی' وہ اس موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

راویٔ حدیث: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا تعارف

پہلی حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور میں نے کئی مرتبہ ان کا تعارف بیان کیا ہے کہ یہ فقرائے صحابہؓ میں سے تھے۔ ان کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا اور ان کے زہد کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہم پڑھ چکے ہیں کہ:

((مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَنْظُرَ اِلٰى تَوَاضُعِ عِيْسٰى فَلْيَنْظُرْ اِلٰى اَبِيْ ذَرٍّ))

''اگر کسی شخص کو اس سے خوشی ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زہد و تقویٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے تو (وہ میرے اس ساتھی اور دوست) ابوذر کو دیکھ لے''۔

البتہ ایک بات واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک وصف کسی شخص میں اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے تو دوسرے اعتبارات سے بھی اس کے اندر صلاحیت اسی درجے کی

ہو۔ حضرت ابوذرؓ سے ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کہ مجھے بھی آپ کہیں گورنر اور والی لگا دیں، تو آپؐ نے فرمایا:

((يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا)) (۱)

''اے ابوذر! تم کمزور ہو اور یہ امارت ایک امانت (اور بہت بڑی ذمہ داری) ہے۔ یہ قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہے، سوائے اُس کے جس نے اس کے حقوق پورے کیے اور اس بارے میں جو اس کی ذمہ داری تھی، اس کو ادا کیا۔''

یعنی درویشی اور زہد ایک الگ چیز ہے، جبکہ انتظامی صلاحیت کا ہونا بالکل دوسری بات ہے اور اس اعتبار سے تم کمزور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو مال و دولت جمع کرنے کے حوالے سے ایک مغالطہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ سورۃ التوبہ کی آیات ۳۴، ۳۵ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۴ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵﴾

''اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں اپنے پاس سونا اور چاندی اور خرچ نہیں کرتے اس کو اللہ کی راہ میں، تو ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔ جس دن ان (سونے اور چاندی) کو تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں اور پھر داغا جائے گا ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو۔ (اور ساتھ کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے اکٹھا کیا تھا، تو اب چکھو مزا اس کا جو کچھ تم جمع کرتے تھے۔''

اسی حوالے سے سورۃ البقرۃ میں دوسرا حکم یہ آیا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب کراھۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ۔

کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ جو بھی ضرورت سے زائد ہے!''

قرآن مجید کی ان آیات کی روشنی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک درہم اور ایک دینار بھی اپنے پاس جمع رکھنا حرام ہے۔ یہ عدمِ توازن تھا' جبکہ شریعت تو توازن چاہتی ہے۔ آپ کام کریں' محنت کریں' مشقت کریں' کاروبار کریں۔ آپ کو جو ملا ہے وہ اگر ایک خاص حد (فقہی اصطلاح میں جس کو ''نصاب'' سے تعبیر کیا گیا ہے) سے آگے بڑھ گیا ہے تو زکوٰۃ دیں۔ باقی کو آپ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں' لیکن یہ رکھنا لازم نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ چاہیں تو سارے کا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ بھی کر سکتے ہیں' لیکن یہ سارا خرچ کرنا بھی لازم نہیں ہے۔ اگر آپ سارا اللہ کی راہ میں دے دیں گے تو بہت اونچا مقام حاصل کر لیں گے' لیکن بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع بھی فرمایا ہے۔ ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ میں اپنی ساری دولت اللہ کی راہ میں دے دینا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ اچھی بات نہیں کہ تم اپنی اولاد کو فقیر کر کے چھوڑ جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ پھر آدھا دے دیتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں' آدھا بھی بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ایک تہائی حصہ۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک تہائی ٹھیک ہے اور یہ بھی بہت ہے' کم نہیں ہے۔

حدیث کا مطالعہ

زیر مطالعہ حدیث نمبر ۲۵ اصل میں احکام' ہدایات اور تعلیمات کا ایک عجیب گلدستہ ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ بہت متوازن ہیں' لیکن بسا اوقات آدمی اپنی کسی انتہا پسندی کی وجہ سے خود غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: اَنَّ نَاسًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالُوْا لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:'' يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْاُجُوْرِ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دولت مند لوگ تو اجر و ثواب میں آگے نکل گئے''۔ یعنی دولت مند اپنی دولت کو اللہ میں راہ میں خرچ کر کے ہم سے اجر و ثواب میں بازی لے گئے اور ہم ان سے پیچھے رہ گئے۔ آگے خود ہی اس کی وضاحت بھی بیان کر دی

کہ: يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ، وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ ''وہ نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں' اور وہ روزے بھی رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں'' وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ اَمْوَالِهِمْ ''اور وہ صدقہ کرتے ہیں اپنے زائد اموال میں سے''۔ اس میں یہ سوال مضمر ہے کہ ہمارے پاس مال ہے نہیں' تو ہم صدقہ نہیں کر سکتے اور اس اعتبار سے ہم ان سے پیچھے رہ گئے۔

انسانوں میں امیر غریب کی تقسیم کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مابین امیر غریب کی جو تقسیم رکھی ہے یہ اُس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس سے مقصود آزمائش ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے کون ہیں جو ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرتے ہیں! دیکھئے' اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مابین ایک تقسیم تو فطری طور پر رکھی ہے کہ کوئی شخص پیدائشی طور پر زیادہ ذہین ہے اور کوئی کند ذہن ہے۔ آپ کو آپ کے والدین کی طرف سے کچھ اور قسم کے جینز ملے ہیں' جبکہ مجھے کچھ اور قسم کے جینز ملے ہیں۔ یہ تو اللہ کی تقدیر ہے اور ایمان بالقدر کے بارے میں ہم ''اربعین نووی'' کی چوتھی حدیث کے ذیل میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ تو یہ فرق دنیا میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک شخص میں فطری طور پر محنت کا مادہ زیادہ ہے تو وہ زیادہ کما رہا ہے جبکہ ایک میں کم ہے تو وہ کم کما رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر غریبی اور امیری کے فرق کا سبب ہمارے نظام میں کوئی خرابی ہے تو اس خرابی کو درست کرنا چاہیے اور نظام میں مواقع سب کے لیے برابر ہونے چاہئیں۔ بدقسمتی سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ نام نہاد اسلامی ممالک میں ایسا نظام نہیں ہے' لیکن دنیا نے یہ کر کے دکھایا ہے۔ امیر کا بچہ ہو یا غریب کا' تعلیم دونوں کو ایک ہی ملے گی' ورنہ اگر مواقع برابر نہ ملیں تو امیر کا بچہ آگے نکل جائے گا اور غریب کا بچہ پیچھے رہ جائے گا' چاہے وہ امیر کے بچے سے ذہین تر ہے اور اگر اسے مواقع ملتے تو شاید وہ امیر کے بچے سے آگے نکل جاتا۔ اسی طرح علاج بھی سب کا ایک جیسا ہونا چاہیے۔ یہ دنیا نے کر کے دکھایا ہے' وہ تو کمیونزم میں معاملہ ایک انتہا کو چلا گیا تھا' لیکن بعد میں کمیونزم اور سرمایہ داری (Capitalism) کے درمیان ایک synthesis ہوا ہے۔

انسان جب سوچتا ہے تو ایک نظام اپنے ذہن سے اختراع کرتا ہے' یہ گویا ایک دعویٰ (thesis) ہوتا ہے۔ لیکن جب اس نظام پر چلتا ہے تو اس کی خرابیاں ظاہر ہوتی ہیں اور ردِعمل کے طور پر ایک جواب دعویٰ (anti-thesis) وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ thesis اور anti-thesis آپس میں ٹکراتے ہیں' لیکن بالآخر ان میں صلح ہو جاتی ہے اور یہ مل جاتے ہیں۔ پھر کوشش کی جاتی ہے کہ ان دونوں کی بھلائیاں جمع کر لی جائیں۔ دیکھئے' شہنشاہیت اور جاگیرداری کا ختم ہونا نوعِ انسانی کا ترقی کی طرف ایک قدم تھا۔ پہلے یوں تھا کہ یہ بادشاہ ہیں' ان کے محل ہیں' ان کی عیاشیاں ہیں۔ انہوں نے فوجیں کھڑی کر رکھی ہیں' کوئی ذرا بولے تو سہی' کوئی ذرا لگان دینے سے انکار تو کرے' اُس کا گھر بار جلا کے راکھ کر دیں گے۔ وہ نظام ختم ہوا تو جمہوریت آ گئی' جسے دنیا میں سمجھا جاتا ہے کہ بہت اعلیٰ شے آ گئی ہے' لیکن اس میں بھی دولت کا نظام جوں کا توں رہا۔ پھر اس جمہوریت سے سرمایہ داری نظام وجود میں آ گیا۔ پہلے جاگیردار لوگوں کی گردنوں پر سوار تھا اب سرمایہ دار سوار ہو گیا۔ سرمایہ دار کا کارخانہ ہے' ہزاروں مزدور کام کر رہے ہیں' ان کی محنت سے جو حاصل ہو رہا ہے اس کا سب سے بڑا حصہ (lion's share) سرمایہ دار لے جا رہا ہے اور مزدوروں کو بس اس قدر تنخواہ دی جا رہی ہے جس سے ان کے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔ اگر مزدور کہتے ہیں کہ ہم کام نہیں کریں گے تو سرمایہ دار کہتا ہے: نہ کرو' بھاڑ میں جاؤ' زیادہ احتجاج کیا تو میں کارخانہ بند کر دوں گا۔ اسے پتا ہے کہ اس کا کارخانہ ایک مہینہ بھی بند رہے گا تو اس کے بچوں کو فاقہ نہیں آئے گا' جبکہ مزدور جانتا ہے کہ اگر اسے دو دن دیہاڑی نہ ملے گی تو اس کے گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑا جائے گا۔ تو سرمایہ دار مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جب لیبر یونینز کا نظام آیا تو اس کا کچھ علاج کرنے کی کوشش کی گئی' بایں طور کہ ان کی ایک bargaining value بن جائے اور وہ قوت کے ساتھ جمع ہو کر اپنے حق کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ بہرحال سرمایہ داری کے ردِعمل میں کمیونزم آیا۔ اب یہ کمیونزم بھی چونکہ انسانی ذہن کی پیداوار تھی اس لیے اس کے اندر بھی ایک بے اعتدالی

آ گئی اور وہ تھی ذاتی ملکیت کی مطلق نفی‘ جو ایک احمقانہ بات ہے۔ پہلے تو یہ اس انتہا پر تھے کہ آپ کا گھر اور اس کا سامان‘ حتیٰ کہ آپ کے زیر استعمال سائیکل تک بھی آپ کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ کوئی چیز ذاتی ہے ہی نہیں‘ سب قومی ملکیت ہیں۔ سب کام کریں اور اجرت حاصل کر کے کھائیں پئیں۔ ہاں انہوں نے یہ ضرور کیا تھا کہ اُجرتوں (wages) کے اندر بہت زیادہ فرق و تفاوت نہیں رکھا‘ بس ایک سے تین کی نسبت تھی۔

زیر مطالعہ حدیث میں فقراء صحابہؓ نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ ناانصافی ہے‘ کہ ہمارے پاس دولت نہیں ہے اور ان کے پاس دولت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان حضرات کے پاس جو زائد مال ہے اس کو وہ صدقہ کرتے ہیں۔ یہاں فُضُول کا لفظ آیا ہے اور عربی میں فضول کا مطلب اردو کی طرح بے کار شے نہیں ہے‘ بلکہ یہ فَضْل سے ہے اور فضل کہتے ہیں بلا استحقاق ضرورت سے زائد ملنی والی چیز کو۔ مثلاً آپ نے چند مزدور سو روپے دیہاڑی پر رکھے اور آپ نے دیکھا کہ ایک مزدور دن بھر بڑی تندہی کے ساتھ کام کرتا رہا ہے‘ اسے آپ نے شام کو سو کے بجائے ایک سو دس روپے دے دیے تو یہ فضل ہے۔ وہ دس روپے اس کا استحقاق نہیں ہے اور وہ مانگ بھی نہیں سکتا‘ بلکہ یہ فَضْل ہے۔

صدقہ کی وسعت

اب حضور اکرم ﷺ کا جواب سنیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((أَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مَا تَصَدَّقُوْنَ بِهٖ؟)) ''کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے صدقے کا سامان مہیا نہیں کیا ہے؟'' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھی صدقے کے راستے کھول رکھے ہیں۔ ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً)) ''تمہارا ہر دفعہ سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے''۔ ((وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً)) ''اور تمہارا ہر مرتبہ اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے''۔ ((وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً)) ''اور تمہارا ہر مرتبہ الحمد للہ کہنا صدقہ ہے''۔ ((وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً)) ''اور تمہارا ہر مرتبہ لا اِلٰہ اِلا اللہ کہنا صدقہ ہے''۔ یعنی تم جتنی مرتبہ سبحان اللہ‘ الحمد للہ‘ اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کہو گے‘ اتنا

ہی صدقہ شمار ہوگا۔

((وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ)) ''تمہارا کسی کو نیکی کا مشورہ دینا (یا نیکی کا حکم دینا) بھی صدقہ ہے''۔ آپ کی حیثیت کے مطابق وہ مشورہ بھی ہو سکتا ہے اور حکم بھی۔ جہاں آپ کے پاس اختیار ہے وہاں حکم دینا ہوگا۔ آپ اپنے گھر کے اندر طاقت کے ساتھ نیکی کا نفاذ کر سکتے ہیں' چنانچہ آپ کے گھر میں ایک بچہ نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو اسے آپ سزا دے سکتے ہیں۔ یہاں وہ مغربی تصور نہیں ہے کہ بچے کو ہاتھ نہ لگاؤ' بچے کو روک ٹوک نہ کرو۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ بچے میں اگر شرم و حیا اور جھجک ہے تو وہ اس کی شخصیت کے صحت مند ارتقاء پانے کا ذریعہ بنے گا۔ لہٰذا اگر آپ کا کہیں اختیار اور طاقت ہے تو نیکی کا حکم دیں اور اگر اختیار نہیں ہے تو مشورۃً اور نصیحتاً نیکی کی بات بتائیں۔ ((وَنَهْيٌ عَنْ مُّنْكَرٍ صَدَقَةٌ)) ''اور کسی کو برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے''۔ برائی سے روکنے کے تین ذرائع احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ))(۱)

یعنی تم میں سے جو کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ بزورِ بازو اس کو روکے! اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ زبانوں پر بھی پہرے بٹھا دیے گئے ہوں اور حق بات کہنے پر زبانیں کھینچی جا رہی ہوں' تو کم سے کم دل میں اس برائی کے خلاف نفرت رکھیں۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اگر آپ بدی کو دیکھتے ہیں اور آپ کو کوئی احساس ہی نہیں ہوتا' دل میں اس کے خلاف کوئی نفرت بھی پیدا نہیں ہوتی' طبیعت میں کوئی گھٹن بھی محسوس نہیں ہوتی تو پھر آپ کا دل ایمان سے خالی ہے۔ اس لیے کہ دل میں برائی کے خلاف نفرت پیدا ہونا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے' اور جب یہ بھی نہیں ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ایمان بھی نہیں ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان......

حقوقِ زوجیت ادا کرنا بھی صدقہ ہے

آگے صدقہ کی وسعت کا معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَفِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ)) ''تمہارا اپنی بیوی سے ہم بستری کرنا بھی صدقہ ہے''۔ یہ بات آپ کو دنیا جہان کی مذہبی و اخلاقی تعلیمات میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ تو خالص حیوانی اور نفسانی تقاضا ہے اور اس کو بھی صدقہ قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اَیَاْتِیْ اَحَدُنَا شَھْوَتَہٗ وَیَکُوْنُ لَہٗ فِیْھَا اَجْرٌ؟ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم میں سے ایک شخص جو اپنی شہوت کا تقاضا پورا کر رہا ہے' کیا اس پر بھی اسے اجر ملے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَرَاَیْتُمْ لَوْ وَضَعَھَا فِیْ حَرَامٍ' أَکَانَ عَلَیْہِ وِزْرٌ؟)) ''(تم نے کبھی سوچا ہے کہ) اگر وہ یہی کام حرام راستے سے کرتا تو اس پر گناہ ملتا کہ نہیں؟'' ظاہری بات ہے کہ اگر کوئی حرام ذریعے سے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرتا ہے تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ قابل سزا جرم بھی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَکَذٰلِکَ اِذَا وَضَعَھَا فِی الْحَلَالِ کَانَ لَہٗ اَجْرٌ)) ''اس طرح وہ یہ کام حلال طریقے سے کر رہا ہے تو اس کو اجر بھی ملے گا۔''

یہ وہی بات ہے جو میں نے شروع میں کہی تھی کہ دنیا کو دین کے تابع کر دو تو آپ کی پوری دنیاداری دینداری بن جائے گی۔ آپ کا کسب معاش کی جدوجہد کرنا' بیوی کا حق ادا کرنا' اپنے نفس کا حق ادا کرنا' ملاقات کے لیے آنے والے کا حق ادا کرنا سب عبادت شمار ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((فَاِنَّ لِأَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِضَیْفِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))(۱) ''پس یقیناً تجھ پر تیری بیوی کا بھی حق ہے' تیرے مہمان کا بھی حق ہے اور تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے''۔ اب ان حقوق کو دین کے تابع رہتے ہوئے پورے کرو گے تو یہ عبادت اور باعث ثواب ہے۔

ہر نیکی صدقہ ہے!

اب ہم حدیث ۲۶ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصلاۃ۔

مروی ہے اور اس میں بھی صدقہ کے مفہوم اور وسعت کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت دین ایک حقیقت واحدہ کا نام ہے۔ اس کو اِدھر سے دیکھ لیں یا اُدھر سے' وہ حقیقت میں ایک ہی ہے۔ جیسے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ہے' آپ جس بازار سے بھی جائیں گے گھنٹہ گھر پہنچ جائیں گے۔ اسی طرح دین اسلام بھی ایک حقیقت واحدہ ہے۔ عبادت میں بھی پورا دین موجود ہے' اسی طرح اقامت دین اور شہادت علی الناس میں بھی پورا دین موجود ہے۔ یعنی پورے دین کی تعبیر ایک زاویہ سے ہو سکتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كُلُّ سُلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ)) ''انسانوں کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہے' ہر روز جس میں سورج طلوع ہوتا ہے''۔ آپ کے جسم کے بے شمار جوڑ ہیں' ان میں سے اگر کوئی ایک جوڑ بھی لاک ہو جائے اور اس میں حرکت نہ رہے تو آپ بے بس اور لاچار ہو سکتے ہیں۔ بڑے جوڑوں کا معاملہ بڑا ہے' لیکن چھوٹے جوڑوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اگر آپ کا ہر جوڑ صحیح سالم کام کر رہا ہے تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اور اس شکر کی بہترین صورت صدقہ ہے۔

صدقہ کی تفصیل حدیث ۲۵ میں بیان ہوگئی ہے کہ صدقہ صرف مالی خیرات کا نام نہیں ہے' بلکہ سبحان اللہ بھی صدقہ ہے' الحمد للہ بھی صدقہ ہے' اللہ اکبر بھی صدقہ ہے' لا الٰہ الا اللہ بھی صدقہ ہے' کسی سے نیکی کی بات کہنا اور کسی کو بدی سے باز رہنے کی تلقین کرنا بھی صدقہ ہے' یہاں تک کہ بیوی سے ہم بستری بھی صدقہ ہے۔ جبکہ زیر مطالعہ حدیث میں صدقہ کی وسعت کے حوالے سے ایک اور پہلو سے بات آ رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((تَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ)) ''دو افراد کے درمیان انصاف کرنا بھی صدقہ ہے''۔ اگر دو افراد کے مابین کوئی جھگڑا یا کوئی اختلاف ہے اور تمہیں ثالث بنایا گیا ہے یا تم ایسی حیثیت پر فائز ہو کہ تم ان کے درمیان صحیح فیصلہ کر سکتے ہو تو تمہارا ان اشخاص کے درمیان عدل و انصاف کا معاملہ کرنا بھی صدقہ ہے۔ ((وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَابَّتِهٖ فَتَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا ' اَوْ تَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ ' صَدَقَةٌ)) ''اور تمہارا سواری کے

بارے میں کسی سے تعاون کرنا یعنی سواری پر سوار کرانا یا کسی کا سامان سواری پر لاد دینا بھی صدقہ ہے''۔ یعنی کوئی شخص گھوڑے پر چڑھنا چاہ رہا ہے اور وہ ایسا ماہر گھڑ سوار نہیں ہے کہ جو چھلانگ مار کر سوار ہو جاتے ہیں' اور اسے تھوڑا سا سہارا مطلوب ہے تو آپ اس کو سہارا دے کر سواری پر سوار کرا دیتے ہیں یا وہ سواری پر سوار تو ہو گیا ہے' لیکن اس کا سامان نیچے پڑا ہوا ہے اور آپ وہ سامان اسے پکڑا دیتے ہیں' تو یہ بھی صدقہ ہے۔

اچھی بات کہنا اور راستے سے اذیت بخش چیز ہٹا دینا بھی صدقہ ہے

مزید آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ)) ''اور اچھی بات بھی صدقہ ہے''۔ اصطلاحی معنی میں تو ''کلمہ طیبہ'' کلمہ توحید (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه) کو کہتے ہیں' لیکن یہاں عموم ہے اور یہ ہر اچھی اور بھلی بات' نیکی کی بات' ادائیگی حقوق کی تلقین وغیرہ سب کو شامل ہے اور یہ سب عند اللہ صدقہ شمار ہوں گے۔ قرآن مجید میں ''کلمہ طیبہ'' کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴿۲۴﴾﴾ (ابراھیم) ''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی ہے کلمہ طیبہ کی! (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک پاکیزہ درخت' اس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں۔''

مزید آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَكُلُّ خُطْوَةٍ تَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ)) ''ہر قدم جو تم نماز کے لیے اٹھاتے ہو وہ صدقہ ہے''۔ اسی طرح ((وَتُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ)) ''اور تمہارا راستے سے کسی اذیت بخش چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے''۔ راستے پر چلتے ہوئے آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی اینٹ پڑی ہے اور اس سے کوئی ٹھوکر کھا کر گر جائے گا تو آپ اس کو ایک طرف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی اور موذی شے یا کاٹنے والی کوئی چیز راستے میں پڑی ہوئی ہے تو اس کا ہٹانا بھی صدقہ ہے۔

صدقہ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ملاحظہ کیجیے: ((تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ))(۱) ''تمہارا اپنے بھائی کو مسکرا کر ملنا بھی تمہارے لیے

(۱) سنن الترمذی' ابواب البر والصلة والآداب' باب ماجاء فی صنائع المعروف۔ ◄◄◄

صدقہ ہے''۔ تمہارا کوئی عزیز' دوست یا بھائی تم سے ملنے آیا ہے اور تم متبسّم چہرے کے ساتھ اگر اس کا استقبال کرتے ہو تو اس کے دل کی کلی کھل اٹھے گی اور اگر آپ نے ''عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا'' کی حیثیت سے آنے والے سے ہاتھ ہی ایسے ملایا ہے کہ بس چھو کے گزر گیا تو اس سے انقباض پیدا ہوگا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو تبسّم کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہے۔

زیرِ مطالعہ دونوں احادیث میں ہم نے دیکھا کہ ایک لفظ ''صدقہ'' میں پورے دین کی تعبیر آ گئی ہے۔ اسی طرح ایک لفظ ''عبادت'' میں پورے دین کی تعبیر ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ (البقرة) ''اے لوگو! اپنے اُس رب کی عبادت اختیار کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی' تاکہ تم (اللہ کے عذاب سے) بچ جاؤ''۔ اسی طرح ایک لفظ ''اسلام'' اور ایک لفظ ''ایمان'' میں بھی پوری بات آ جائے گی۔ ایمان میں عمل بھی شامل ہے' بایں طور کہ برا عمل انسان کے ایمان کی نفی کرتا ہے اور اچھا عمل ایمان کا ثمرہ اور اس کا پھل ہے۔

نیکی کی پہچان

اب ہم اگلی حدیث (۲۷) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بھی اُن احادیث میں سے ایک ہے جنہیں حضور ﷺ نے جوامع الکلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ حدیث حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْبِرُّ حُسْنُ

◄◄◄ اس روایت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل کاموں کو بھی صدقہ قرار دیا ہے:

((وَإِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِي أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَبَصَرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدِيءِ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَإِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَةَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِي دَلْوِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ))

''تمہارا کسی بھولے بھٹکے کو راستہ بتانا' نابینے کے ساتھ چلنا' راستے سے پتھر' کانٹا یا ہڈی وغیرہ ہٹا دینا اور اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا بھی تمہارے لیے صدقہ ہے۔'' (مرتب)

الْخُلُقِ)) ''اصل نیکی حسن اخلاق ہے''۔۔۔۔۔ ''نیکی کی حقیقت'' کے عنوان سے ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب'' کا ایک اہم درس سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ پر مشتمل ہے' جسے ''آیت البرّ'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس کا رواں ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

> ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخر پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔''

اس ایک آیت کے اندر پوری انسانی شخصیت کا ہیولیٰ اور مکمل کردار موجود ہے۔انسان کے اندر اگر ان مختلف پہلوؤں سے یہ کیفیات موجود ہیں تو پھر وہ واقعی سچا اور نیکوکار ہے اور ایسے ہی لوگوں کو متقی کہا جاتا ہے۔ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کے بھی کچھ اور ہی معیارات ہیں۔کچھ لوگ ظواہر اور کچھ وضع قطع کے حوالے سے لوگوں کا تقویٰ ناپتے ہیں' لیکن تقویٰ درحقیقت اس متوازن شخصیت کا نام ہے جس کا ذکر آیت البر میں کیا گیا ہے۔

گناہ کی پہچان

نیکی کی تعریف کے بعد آگے گناہ کی پہچان کے حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ)) ''اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے جی میں تشویش پیدا ہو جائے''۔اس کو یوں سمجھئے' جیسے tip of the iceberg کے نیچے بہت بڑا برف کا تودا پوشیدہ ہوتا ہے' اسی طرح حضور ﷺ کے اس ایک جملہ کے پیچھے بھی پورا ایک فلسفہ مخفی ہے۔وہ یہ کہ انسان میں نیکی جبلی طور پر موجود ہے۔اس لیے کہ وہ صرف حیوان نہیں ہے' بلکہ اس میں روحِ ربانی بھی مستور ہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (صٓ)

''پھر جب میں اس کو درست کرلوں اوراس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''

روح کو نیکی سے فرحت ہوتی ہےاور بدی سے ایک ضیق (تنگی) اورتشویش کا احساس ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب کے اس سوال پر کہ ''ایمان کیا ہے؟'' ارشادفرمایا:

((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۱)

''اگر تمہیں نیکی کر کے خوشی ہواورکوئی برا کام کر کے تمہیں دکھ کا احساس ہوتو تم مؤمن ہو۔''

اگر آپ کے دل میں ایمان موجود ہےتو وہ نیکی کی تائیداورتصدیق کرتا ہے' بلکہ نیکی کے کام کرنے سے ایمان بڑھ جاتا ہےاور برے کام سے ایمان میں کمی آتی ہےاورایمان کا نور مدھم پڑ جاتا ہے۔

زیر مطالعہ حدیث کے الفاظ ہیں: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) ''اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے دل میں تشویش اورخلجان پیدا ہوجائے اورتمہیں یہ پسند نہ ہوکہ وہ لوگوں کومعلوم ہو''۔اس میں ایک اوراعتماد کی حالت کا بیان ہے۔انفرادی طور پر انسان کی فطرت کے بارے میں اعتماد کی حالت (mode of confidence) یہ ہے کہ گناہ کرنے پرتشویش ہو'اورایک اعتماد کی حالت پوری نوع انسانی کے بارے میں ہے کہ انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی حکم لگاتا ہے کہ یہ نیکی ہےاور یہ بدی ہے۔ایک انفرادی تحت الشعور ہرانسان کاہےاورایک پوری نوعِ انسانی کا مجموعی تحت الشعور ہے' جس کو جدید اصطلاح میں collective subconscious mind کہا جاتا ہے۔نوعِ انسانی کا یہ مجموعی تحت الشعور نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرتا ہے۔جب آپ یہ نہیں چاہتے کہ یہ بات کسی کے علم میں آئے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ خراب ہے۔یہ بھی درحقیقت فطرتِ انسانی پر بحیثیت مجموعی ایک اعتماد ہے۔

---

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی' ح ۶۷۷۔ السلسلة الصحيحة للالبانی: ۹۱/۲

نیکی اور گناہ کے بارے میں اپنے دل سے فتویٰ حاصل کرو!

متذکرہ بالا روایت امام مسلم کی نقل کردہ ہے' جبکہ مسند احمد اور سنن دارمی میں یہ روایت حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے ذرا مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا:((جِئْتَ تَسْاَلُ عَنِ الْبِرِّ؟)) ''تم نیکی کے متعلق پوچھنے آئے ہو (کہ نیکی کیا ہے)؟''— دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جان گئے کہ وابصہ کیا پوچھنے آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات بعض معاملات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیبی طور پر مطلع ہو جاتے تھے۔ ویسے تو کچھ اندازہ صاحبِ نظر اہلِ ایمان کو بھی ہو جاتا ہے' اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))(۱) ''مؤمن کی فراست سے ہوشیار رہا کرو' اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''۔ تمہارے دل میں کیا ہے' اسے کچھ نہ کچھ نظر آجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے وابصہ! تم مجھ سے نیکی کے بارے میں پوچھنے کے لیے آئے ہو؟'' قُلْتُ نَعَمْ! ''میں نے عرض کیا: جی ہاں!'' میں یہی دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ)) ''تم اپنے دل سے پوچھ لیا کرو!'' انسانی وجود کی تین سطحیں (levels) ہیں' سب سے نیچے نفس' سب سے اوپر روح اور درمیان میں قلب۔ اگر اس قلب کا میلان نفس کی طرف ہو گیا تو پورے وجود کے اندر نفسانیت' ظلمانیت اور تاریکی سرایت کر جائے گی اور اگر اس کا رخ روح کی طرف ہو گیا تو پورے وجود کے اندر نورانیت پھیل جائے گی۔ یوں سمجھئے کہ قلب ایک آئینہ ہے جو اپنے میلان کو منعکس (reflect) کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اوّلاً نور پیدا کیا اور پھر نور سے سب سے پہلے روحِ محمدی کو پیدا کیا۔ نور ہی سے فرشتے اور ارواحِ انسانیہ پیدا کی گئیں۔ تمام انسان جو اب تک دنیا میں آچکے ہیں یا جو بھی قیامت تک آنے والے ہیں' سب کی ارواح بیک وقت پیدا کر دی گئی تھیں اور پھر ان سب سے اللہ تعالیٰ نے عہدِ الست لیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾

(۱) سنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن' باب و من سورۃ الحجر۔

(الاعراف:۱۷۲) ''کیا میں ہی نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا تھا: کیوں نہیں (آپ ہی ہمارے رب ہیں)''۔ یہ عہدِ الست ہے جو ہم لے کر دنیا میں آئے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ اے کے بروہی صاحب نے کسی فلسفی کا ایک بہت گہرا جملہ سنایا تھا:

Had you not possesed me in the begining, you would never have searched for me.

لوگ خدا کی تلاش میں غاروں' پہاڑوں' جنگلوں اور صحراؤں میں جاتے ہیں' رہبانیت اختیار کرتے ہیں' اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس جملہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ اگر ابتدا میں ہی تمہارا خدا کے ساتھ تعارف نہ ہوا ہوتا تو تم کبھی خدا کو تلاش نہ کرتے۔ وہ تو اصل میں خدا کی واقفیت اور روح کی اطاعت کا تعلق تو اس وقت سے ہے۔ اب وہ روح اللہ کا قرب چاہتی ہے اور اس مادی دنیا کا پردہ روح پر بہت شاق گزرتا ہے۔ بقول مولانا روم ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند!

جس طرح بانسری بانس سے جدا ہونے پر گریہ کناں ہے اسی طرح یہ روح فراق کی شکایت کر رہی ہے۔ اسی لیے موت کو ہمارے ہاں وصال کہا جاتا ہے۔

آگے آپ ﷺ نے نیکی کی پہچان کے حوالے سے وہی بات فرمائی جو ماقبل ہم نے پڑھی: ((اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ)) ''نیکی وہی ہے جس سے تمہارے جی کو اطمینان حاصل ہو اور اس کی طرف سے تمہارا دل مطمئن ہو جائے''۔ نیکی کی کیفیت میں روح' قلب اور نفس ایک وحدت بن جاتے ہیں اور اس وحدت کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں ''نفس مطمئنہ'' ہے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝٢٧ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝٢٨ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝٢٩ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝٣٠﴾ (الفجر) ''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل' تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پس تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا!'' جب قلب کا رُخ نفس کی طرف ہو جائے اور پورا وجود قلب کے تابع

ہوتے ہوئے نفس کی اطاعت پر آمادہ ہو جائے تو اس کیفیت کو "نفس امارہ" سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) "یہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے"۔ ایک کیفیت ڈانواڈول کی سی ہوتی ہے کہ قلب کبھی اِدھر' کبھی اُدھر۔ اس کیفیت کو "نفس لوّامہ" سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾ (القیامۃ) "اور میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی"۔ اکثر انسانوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے۔ بُرے سے بُرے انسان میں بھی کبھی کوئی نیکی کا جذبہ ابھر آتا ہے اور اچھے سے اچھے انسان سے بھی بدی سرزد ہو جاتی ہے۔

آگے گناہ کی پہچان کے حوالے سے وہی بات آ رہی ہے جس کا ذکر پہلی روایت میں تھا: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ)) "اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے جی میں ایک تشویش اور سینے کے اندر ایک تردّد پیدا ہو جائے"۔ یعنی یہ تردّد اور خلجان پیدا ہو جائے کہ یہ میں نے کیا کیا' کیوں کیا! یہ انسان کی باطنی کیفیت ہے اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ تم نے غلط کام کیا۔

دل کے فتویٰ کو ترجیح دو!

آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ)) "چاہے لوگ تمہیں اس کے جواز کا بار بار فتویٰ کیوں نہ دیں"۔ اگرچہ مفتی حضرات کہہ دیں کہ اس کا جواز ہے' لیکن اگر تمہارا دل کہہ رہا ہے کہ غلط ہے تو غلط ہے۔ اس لیے کہ فتویٰ تو "کتاب الحیل" کی رو سے بھی دے دیا جاتا ہے کہ کس طریقے' کس حیلے بہانے سے کوئی راستہ نکالا جائے۔ لیکن تمہارے اندر کا جو مفتی ہے' یہ جو روحِ ربانی تمہارے اندر ہے' اس کا تعلق براہِ راست خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ اس لیے اگر تمہارا دل مطمئن نہیں ہے تو وہ کام مت کرو!

اس کی مثال میں نے عرض کی تھی کہ نور الدین زنگی کا بیٹا شدید بیمار ہو گیا۔ ہر طرح کے علاج معالجے آزمائے گئے مگر بے سود۔ آخر اطباء نے کہا کہ اس کی جان بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ یہ شراب پی لے۔ سلطان نے کہا: معاذ اللہ! میں اپنے بیٹے کو حرام

چیز استعمال کراؤں! اطباء نے بتایا کہ اس پر علماء کا فتویٰ ہے کہ جان بچانے کے لیے حرام چیز استعمال کی جا سکتی ہے۔ سلطان کو تسلی نہ ہوئی اور اس اللہ کے بندے نے فرداً فرداً چاروں مکاتب فکر کے علماء سے فتویٰ لیا تو سب نے یہی کہا کہ جان بچانے کے لیے جان بچانے کی مقدار تک حرام شے استعمال کر لینا جائز ہے۔ لیکن نورالدین زنگی کے دل کو تسلی نہ ہوئی، دل میں خلش اور کھٹک باقی رہی۔ اُس نے مفتیانِ کرام کو اپنے دربار میں بلایا اور کہا: اللہ کی مشیت کے مطابق اگر میرے بیٹے کی موت کا وقت آ ہی گیا ہے تو کیا یہ شراب اسے بچا لے گی؟ انہوں نے کہا: نہیں! اُس نے پوچھا: اگر اللہ اسے صحت دینا چاہے تو کیا وہ شراب کا محتاج ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! اس پر سلطان نے کہا: تو اپنے یہ فتوے اپنے پاس رکھو!

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ لوگوں کے ایمان اور تقویٰ کے اعتبار سے فرق و تفاوت تو رہے گا۔ جتنا آپ کا اندر خالص ہے اتنے ہی خالص فتوے آپ کو وہاں سے ملیں گے ——— اللہ تعالیٰ ہمیں ان احادیث کے مندرجات پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
28

وجوبِ التزامِ سُنّت
(سُنّت کولازم پکڑنا)

۲۵/اپریل اور۲/مئی ۲۰۰۸ءکے خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ (النساء)

عَنْ اَبِیْ نَجِیْحٍ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ :

وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَوْعِظَۃً وَّجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ، وَذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ، فَقُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! کَاَنَّھَا مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ، وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ، فَاِنَّہٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا، فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ، تَمَسَّکُوْا بِھَا، وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ، وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ)) (۱)

(۱) سنن ابی داوٗد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ۔ وسنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع۔ وقال : حدیث حسن صحیح

سیدنا ابونجیح عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک وعظ فرمایا جس سے دل کانپ اٹھے اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ہم نے کہا: یارسول اللہ! یہ تو گویا الوداع کہنے والے (یعنی چھوڑ کر جانے والے) کا سا وعظ ہے۔ آپ ہمیں مزید وصیت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور وصیت کرتا ہوں کہ (اپنے حکام و امراء کے) احکام سننا اور اطاعت کرنا' خواہ تم پر کوئی حبشی غلام ہی حاکم بن جائے۔ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ یقیناً بہت سے اختلافات دیکھے گا' پس (ان حالات میں) تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑنا اور اسے داڑھوں سے قابو کرنا۔ دین میں نئے نئے کاموں کے ایجاد کرنے سے بچ کر رہنا' کیونکہ دین میں ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

معزز سامعین کرام!

آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی حدیث نمبر ۲۸ ہے۔ گویا آج اس کتاب کا دو تہائی حصہ مکمل ہو جائے گا ــــ اس مجموعہ احادیث کا نام اگرچہ اربعین ہے لیکن اس میں کُل ۴۲ احادیث ہیں' جس کا دو تہائی ۲۸ احادیث بنتی ہیں ــــ اس حدیث کے راوی عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ حدیث سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی دونوں میں موجود ہے' اور امام ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث ''حسن صحیح'' ہے' یعنی سند کے اعتبار سے بہت ہی پختہ ہے۔ اس میں متعدد باتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کو جوامع الکلم میں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا نظامِ اطاعت

اس حدیث میں چند اہم امور کا حکم دیا گیا ہے' جن میں سے ایک سمع و طاعت ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک نظامِ اطاعت تھا جو پہلے مسلمانوں میں بحیثیت جماعت اور پھر اسلامی حکومت میں رائج ہوا۔ اس نظامِ اطاعت کی تشریح کے لیے میں نے ابتدا میں سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کی تلاوت کی

ہے۔ یہ آیت اس اعتبار سے قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ہے کہ اس میں اسلامی ریاست کے دستور کا ایک اہم اور بنیادی اصول بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٥٩﴾﴾

''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی بہت مفید ہے۔''

دیکھئے' یہاں بہت عجیب اسلوب ہے کہ تین ہستیوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے: اللہ کی' رسول کی اور اولوالامر کی' لیکن پہلے دو کے لیے ''اَطِيْعُوْا'' کا لفظ آیا ہے' جبکہ تیسرے کے لیے نہیں آیا ـــــ ایک اسلوب تو یہ ہو سکتا تھا کہ ''اَطِيْعُوْا'' ایک مرتبہ آ جاتا اور اس کا اطلاق تینوں پر ہو جاتا' جیسے الجبرا میں بریکٹ کے باہر جو شے ہو وہ بریکٹ کے اندر موجود ہر شے سے ضرور ضرب کھائے گی۔ دوسرا اسلوب یہ ہو سکتا تھا کہ ''اَطِيْعُوْا'' تیسری مرتبہ بھی آتا' لیکن قرآن نے یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ ''اَطِيْعُوْا'' پہلے دو کے ساتھ ہے' تیسرے کے ساتھ نہیں ہے۔ اصل میں اس اسلوب سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق' دائم' غیر مشروط اور غیر محدود ہے' یعنی اللہ اور رسول (ﷺ) کا ہر حکم بلا کم و کاست اور بلا چون و چرا ماننا ہر مسلمان پر لازم ہے' لیکن صاحبِ امر کی اطاعت مطلق نہیں ہے' بلکہ اس کی اطاعت اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہو گی۔

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت مطلق' دائمی اور مستقل ہے!

مذکورہ آیت کے اسلوب سے یہ واضح ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق' دائمی اور مستقل ہے' جبکہ ہمارے ہاں بہت عرصے سے ایک فتنہ اٹھا ہے اور یہ لوگ رسول

اللہ ﷺ کی اطاعت کو دائمی اور مستقل ماننے کو تیار نہیں ہیں۔اس فتنے کوشروع کرنے والے سرسید احمد خان تھے جو قومی اعتبار سے تو ہمارے ہیروز میں شمار ہوتے ہیں‘ لیکن دینی اعتبار سے انہوں نے بہت سی گمراہیوں کا آغاز کیا ہے‘ جن میں سے ایک ’’استخفافِ حدیث‘‘ بھی ہے‘یعنی حدیث کوخفیف سمجھنا اور حدیث کی قدر ومنزلت کوکم سمجھنا۔اس کے بعد سے یہ فتنہ بڑھتا چلا گیا اور ہمارے ہاں باقاعدہ ’’اہلِ قرآن‘‘ کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا‘ جنہوں نے کہا کہ ہم تو صرف قرآن کو مانیں گے‘ قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز واجب التعمیل نہیں ہے۔

یہ لوگ درحقیقت ’’منکرین حدیث‘‘ ہیں اور ان میں ایک بہت بڑا شخص غلام احمد پرویز تھا جو پاکستان میں فوت ہوا ہے۔غلام احمد پرویز اچھا انشاء پرداز تھا اور گفتگو بھی اچھی کر لیتا تھا۔ظاہر بات ہے کہ فتنہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس میں کوئی صلاحیت ہو۔بغیر صلاحیت کے نہ کوئی نیکی کا کام ہوسکتا ہے اور نہ بدی کا۔بدی کا کام کرنے کے لیے بھی صلاحیت چاہیے‘ قوت چاہیے‘ لہٰذا اس میں صلاحیتیں تھیں تو اس نے انکارِ حدیث کا فتنہ پھیلایا۔البتہ لوگوں کودھوکہ دینے کے لیے وہ اپنے رسالے ’’طلوعِ اسلام‘‘ کے سرورق پر ہمیشہ ایک حدیث شائع کرتا۔وہ احادیث جو اخلاقی نوعیت کی ہوں یا جن میں کچھ فضائل اعمال کا ذکر ہو یا جن میں برے اخلاق کی نفی کی گئی ہو۔ظاہر بات ہے ان حدیثوں پر کوئی فقہی احکام مرتب نہیں ہوتے۔یہ تو اخلاقی تعلیمات ہیں یا ایمانیات کا معاملہ ہے‘ لیکن وہ احادیث جن سے احکام کا استنباط ہوتا ہے‘ ان کے بارے میں اس کے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔اس لیے کہ اس شخص کے اثرات ہمارے معاشرے میں کافی پھیلے ہوئے ہیں اور آج اسی کی باقیات ہمارے ہاں خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا پر بہت نمایاں ہیں۔

ان کا اصول یہ ہے کہ ’’اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ‘‘یعنی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا معاملہ صرف دورِ نبویؐ کے لیے تھا‘ کیونکہ اُس وقت آپؐ مسلمانوں کے امیر بھی تھے‘ تو بحیثیت امیر المسلمین اور امیر المؤمنین آپؐ کا حکم ماننا لازمی تھا‘ لیکن آپؐ کی اطاعت ہمیشہ کے لیے لازم نہیں ہے۔یہ بات بہت بڑی گمراہی ہے۔اسی لیے میں نے عرض

کیا کہ اطاعتِ خداوندی (اطاعتِ قرآن) اور اطاعتِ رسول (صحیح حدیث کی اطاعت) دونوں مستقل‘ دائمی اور غیر مشروط ہیں۔ ان میں کوئی بات خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے‘ ان پر عمل کرنا ہر حال میں لازم ہے۔

صاحبِ امر کی اطاعت مقید اور مشروط ہے!

زیرِ مطالعہ آیت میں صاحبِ امر کے حوالے سے ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' کے الفاظ آئے ہیں‘ یعنی تم (مسلمانوں) میں سے جو صاحبِ امر ہو اُس کی اطاعت لازم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ پر حاکم بن گیا تو اس کی اطاعت آپ پر فرض نہیں ہے‘ بلکہ آگے بڑھ کر پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی حکومت کو ختم کیا جائے‘ اس سے نجات حاصل کی جائے‘ اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں میں سے جو بھی تمہارا امیر ہے اس کی اطاعت تم پر لازم ہے‘ البتہ یہ اطاعت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے۔ اگر تو وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق حکم دے تو اسے ماننا لازم ہے اور اگر خلافِ شریعت کوئی حکم دے تو نہ ماننا لازم ہے۔

صاحبِ امر حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ہوتے تھے۔ حضور ﷺ تو اللہ کے رسول بھی تھے اور مسلمانوں کے امیر اور سپہ سالار بھی‘ لیکن آپ ﷺ کی امارت کے تحت چھوٹی امارتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے کوئی لشکر بھیجا جس کے ساتھ آپؐ خود نہیں گئے —— جنہیں ہم سرایا کہتے ہیں —— ظاہر بات ہے اس میں کسی کو تو امیر بنایا گیا۔ اب اس امیر کی اطاعت بھی ضروری ہے‘ لیکن اس کی اطاعت معروف میں ہے۔ اس کو اختیار نہیں ہے کہ وہ جو چاہے حکم دے۔ چنانچہ دورِ نبویؐ میں بالفعل اسی طرح کا ایک واقعہ بھی پیش آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت روانہ کی اور اس میں ایک صاحب کو امیر بنایا۔ وہ امیر صاحب ذرا جلالی مزاج کے تھے‘ کسی بات پر وہ اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو گئے تو انہوں نے ایک بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ نے گڑھا کھود دیا‘ اس لیے کہ اس میں تو کوئی خلافِ شریعت بات نہیں تھی۔ پھر امیر نے حکم دیا کہ اس میں لکڑیاں لا کر ڈال دو‘ ڈال دی گئیں۔ حکم دیا ان میں آگ لگا دو‘ لگا دی گئی۔ اس کے بعد

اس نے حکم دیا کہ اس میں کود جاؤ۔ اس پر صحابہؓ نے کہا کہ اسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کا دامن تھاما تھا اور آپ ہمیں اسی میں کودنے کا حکم دے رہے ہیں' تو لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ یعنی ہم آپ کا یہ حکم نہیں مانیں گے۔ جب یہ بات حضور ﷺ کے علم میں لائی گئی تو آپ ﷺ نے توثیق فرمائی کہ انہوں نے صحیح کیا۔ مزید آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اُس آگ میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی اس میں سے نہ نکل پاتے۔ لہٰذا حضور ﷺ کے بعد کسی امیر کا حکم مطلق نہیں ہے' چاہے وہ امیر صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ صحابی کا حکم بھی مطلق نہیں ہے' بلکہ اسے بھی اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اگر اس کے اوپر پورا اترتا ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ورنہ اسے رد کر دیا جائے گا۔

ائمہ فقہ کی اطاعت بھی اللہ اور رسولؐ کے تابع ہے

ائمہ فقہ کی اطاعت کا معاملہ بھی امیر کی اطاعت کی طرح مقید اور مشروط ہے' بایں طور کہ ان کی اطاعت بھی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ضمن میں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو قول موجود ہے کہ اگر میری کسی رائے کے خلاف تمہیں کوئی صحیح حدیث مل جائے تو میری رائے کو دیوار پر دے مارو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے تک ابھی احادیث پوری طرح جمع نہیں ہوئی تھیں اور جمعِ حدیث کا عمل جاری تھا' لہٰذا ساری احادیث ان کے علم میں نہیں تھیں۔ یہ تو ان کی بہت بڑی قابلیت ہے کہ ان کی کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو بعد میں حدیث کی رو سے غلط ثابت ہوئی ہو۔ ہاں کوئی اختلاف تو ہو سکتا ہے' لیکن غلط ثابت ہونا اور بات ہے۔ اس اعتبار سے یہ ان کی بہت بڑی فضیلت ہے۔

اس طرح ان کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ جب سورۃ الجمعہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۲ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۳﴾

''وہی تو ہے جس نے بھیجا اُمیین میں سے ایک رسولؐ انہی میں سے' جو ان کو پڑھ

کرسنا تا ہے اس کی آیات' اوران کا تزکیہ کرتا ہے اورانہیں تعلیم دیتا ہے کتاب و حکمت کی' اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان میں سے دوسرے لوگوں کو بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ سے کون مراد ہیں؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی اس وقت وہاں موجود تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کے فرمایا کہ یہ اور اس کی قوم —— عربوں کے بعد سب سے پہلے جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے وہ ایرانی ہی تھے۔ اس لیے کہ دورِ خلافت راشدہ میں سب سے پہلے عراق فتح ہوا جس پر ایرانیوں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد شام فتح ہوا جس پر رومیوں کی حکومت تھی—— اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِنْ ھٰؤُلَاءِ)) (۱) ''اگر ایمان ثریا کے پاس ہوتا تو بھی ان میں سے ایک شخص اسے پالیتا''۔ علامہ جلال الدین سیوطی اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے امام ابوحنیفہؒ مراد ہیں اور یہ بشارت انہی کے لیے ہے' کیونکہ وہ نسل کے اعتبار سے ایرانی تھے۔ لیکن حدیث کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ صرف ایرانیوں میں سے ایک یا چند آدمی ہیں' بلکہ اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو قیامت تک اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے۔

''وعظ'' کا مفہوم اور اہمیت

اس تمہید کے بعد اب ہم حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَوْعِظَۃً —— ایک روایت میں ذَاتَ یَوْمٍ کے الفاظ بھی ہیں—— ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمیں وعظ ارشاد فرمایا''۔ یہ وعظ کا لفظ نوٹ کیجیے۔ آج کل عام فضا عقلیت (rationalism) کی ہے کہ بھئی دلیل سے بات کرو۔ آپ کی یہ بات ہماری عقل میں نہیں آ رہی۔ ہماری عقل

(۱) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قولہ وآخرین منھم لما یلحقوا بھم۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ' باب فضل فارس۔

آپ کی بات ماننے اور تسلیم کرنے کے حق میں نہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص وعظ کہہ رہا ہو تو لوگ ذرا حقارت کے ساتھ کہتے ہیں کہ وعظ کہہ رہے ہیں جی۔ یعنی ان کے نزدیک وعظ کوئی اعلیٰ اور عمدہ شے نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وعظ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس میں اگرچہ منطق کا استعمال نہیں ہوتا' لیکن اس میں استدلالی اور جذباتی انداز میں دل اور روح کو براہِ راست مخاطب اور متوجہ کیا جاتا ہے۔ ایک ہے کہ آپ کسی بات کو دماغ اور عقل کے ذریعے سے دل میں اتارتے ہیں۔ عقلیت پسند (rationalists) لوگوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ جب تک ان کی عقل کسی شے کو تسلیم نہ کرے تو وہ دل میں نہیں اترتی۔ اس اعتبار سے عقل ایک رکاوٹ (barrier) ہے اور عقل کا معنی ہی 'باندھنے والی شے' ہے۔ عربی لوگ سفر کے دوران آرام کی غرض سے کہیں رکنے کے وقت اپنے اونٹ کا ایک گھٹنا باندھ دیتے تھے' یعنی ایک ٹانگ کو گھٹنے سے موڑ کر اسے کسی رسی سے باندھ دیتے۔ اس حالت میں وہ ذرا اُچک اُچک کر کسی کیکر کے درخت پر تو منہ مار لے گا مگر وہ بھاگ کر دور نہیں جا سکتا۔ اونٹ کے گھٹنے کو باندھنے والی رسی کو ''عِقال'' کہتے ہیں۔ یہ جو عربوں کا رواج ہے کہ وہ اپنے سر پر بڑی قیمتی رسی ''عِقال'' باندھتے ہیں' اصل میں یہ وہی رسی ہے جس کے ساتھ اونٹ کا گھٹنا باندھا جاتا تھا۔ آرام کے وقت تو رسی سے اونٹ کا گھٹنا باندھ دیتے' لیکن جب دوبارہ سفر کا آغاز کرتے تو اسے کھول کر اپنے سر کے اوپر لپیٹ لیتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کھلی چھوڑی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اس سے فرمایا: ((اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ))(1) ''اس کا گھٹنا باندھو اور اللہ پر توکل کرو!''☆ یعنی پہلے دنیا کے وسائل استعمال کرو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ ان وسائل کی وجہ سے تمہاری مرضی کا نتیجہ نکل آئے گا' نتیجہ

---

(1) مشكلة الفقر للالبانی' ح:۲۲۔ اس مضمون کی احادیث سنن ترمذی' صحیح ابن حبان اور دیگر کتب حدیث میں بھی منقول ہیں۔

☆ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی لائقِ توجہ ہے: ◄

تو بالآخر اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگا' لیکن وسائل اور ذرائع استعمال نہ کرنا غلط ہے۔

خلیل جبران ایک عرب ادیب اور بہت مفکّر قسم کا آدمی تھا' اس کا ایک جملہ بہت پیارا اور بہت عمدہ ہے: ''عقل سے روشنی حاصل کرو' لیکن جذبے کے تحت حرکت کرو''۔ عقل انسان کو حرکت نہیں کرنے دیتی' اس لیے کہ عقل کے معنی ہی روکنے کے ہیں۔ عقل روشنی اور چراغ کی مانند تو ہے کہ راستہ دکھا دیتی ہے' لیکن جب راستہ نظر آ جاتا ہے تو پھر عافیت اور مصلحت کے نام پر چلنے میں قدم قدم پر رکاوٹ ڈالتی ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

آگ میں کود جانا عقل کے تحت تو نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ عقل تو جان بچانے کا کہتی ہے۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کے لیے جب آگ کے انگارے زمین پر بچھا دیے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ان پر لیٹ جاؤ تو وہ لیٹ گئے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ جو بھی تکلیف آئے اسے اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھو اور کوئی جوابی کارروائی نہ کرو! یہ ہے اصل میں عشق اور یقین جس کے تحت آدمی حرکت کر سکتا ہے۔ دوسری طرف عقل کا معاملہ یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر اَڑنگے لگائے گی' آپ کو مصلحت سکھائے گی اور اپنے جان و مال کو بچانے کا مشورہ دے گی۔

قرآن بھی وعظ (مَوعِظَة) ہے

وعظ کے معنی نصیحت کے ہیں اور اس میں اصل مخاطب انسان کا وہ جذبہ ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے۔ بعض لوگوں کی روح مر چکی ہوتی ہے تو ان پر وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی مثال ایسے ہے جیسے چکنے گھڑے پر پانی پڑا اور وہ فوراً پھسل گیا' لیکن

◄ ((مَثَلُ الْقُرْآنِ مَثَلُ الْإِبِلِ الْمُعَقَّلَةِ إِنْ تَعَاهَدَهَا صَاحِبُهَا بِعُقُلِهَا أَمْسَكَهَا عَلَيْهِ وَإِنْ أَطْلَقَ عُقُلَهَا ذَهَبَتْ)) (ابن ماجه)

''قرآن کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کا گھٹنا بندھا ہوا ہو کہ اگر اس کا مالک اسے باندھے رکھے تو رکا رہتا ہے اور اگر کھول دے تو چلا جاتا ہے۔''

جن کی ارواح کچھ زندہ ہوتی ہیں — چاہے کمزور ہیں، مضمحل ہیں لیکن ہیں ابھی زندہ، مری نہیں ہیں — تو ان پر وعظ کا اثر ہوتا ہے۔ سورۂ یونس میں قرآن مجید کو بھی ''مَوْعِظَة'' کہا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔''

قرآن کا پہلا کام وعظ ہے، یعنی قرآن دلوں پر اثر کرتا ہے، دلوں کو نرم کرتا ہے اور جب دل نرم ہو جاتے ہیں تو پھر ان میں بات داخل ہوتی ہے۔ جیسے سخت زمین پر بارش برسے گی تو پانی اس میں جذب نہیں ہوگا اور اگر آپ نے زمین کو ہل چلا کر نرم کیا ہوا ہے تو وہ پانی جذب ہو جائے گا۔ قرآن کا دوسرا کام ہے: ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ کہ سینوں کے اندر جو روگ اور امراض موجود ہیں یہ ان کی دوا ہے، مگر ضروری ہے کہ یہ دوا سینے اور دل میں داخل ہو۔ فرض کیجیے ایک شخص کو مسلسل قے آ رہی ہے، اس حالت میں آپ اسے دوا پلائیں گے تو فوراً قے کے ذریعے باہر آ جائے گی اور جب تک وہ دوا معدہ کے اندر جذب نہ ہو تو وہ کیا اثر دکھائے گی؟ (چنانچہ ایسے مریض کو آپ انجکشن کے ذریعے دوا اندر داخل کر دیتے ہیں اور وہ دوا فوراً خون میں شامل ہو جاتی ہے۔) اسی طرح انسان کا دل جب تک نرم نہ ہو اُس وقت تک قرآن دل پر اثر نہیں کرے گا اور پھر قرآن شفاء ثابت نہیں ہوگا۔

قرآن کی تیسری صفت ہے ''هُدًى''، یعنی یہ قرآن ہدایت ہے۔ لیکن دلوں میں تکبر، حُبِّ دنیا، حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال ہے تو یہ ہدایت اثر نہیں کرے گی۔ پہلے اس قرآن سے دل کی زمین نرم ہوگی، پھر وہ اندر داخل ہو کر ایسا اثر دکھائے گا کہ دل میں سے تمام منفی باتوں کی جڑیں اکھاڑ باہر پھینکے گا اور پھر آپ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ کہ یہ قرآن تقویٰ والوں کے

لیے ہدایت ہے۔اگر چہ یہ اپنی جگہ ھُدًی لِّلنَّاس ہے' لیکن فائدہ اٹھانے کے اعتبار سے تقویٰ شرط ہے اور تقویٰ کے بغیر آپ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ـــــ قرآن کے بارے میں چوتھی بات یہ فرمائی: ﴿رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہے۔یعنی دنیا میں یہ ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے والوں کے لیے آخرت میں رحمت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا الوداعی وعظ اور وصیتیں

لفظ''وعظ'' کی تشریح کے بعد دوبارہ حدیث کے مطالعہ کی طرف آتے ہیں۔راوی کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ایسا وعظ فرمایا:وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ''جس سے ہمارے دل کانپ گئے' لرز گئے'' ـــــ حدیث کے متن سے بھی ثابت ہو گیا کہ وعظ کا اصل ہدف قلب ہے اور اس کا براہِ راست اثر دل میں موجود روح پر ہوتا ہے ـــــ وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ ''اور ہماری آنکھیں بہہ پڑیں''۔یعنی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہم پر رقت طاری ہوگئی۔

فَقُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ ''تو ہم نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو گویا الوداع کہنے والے یعنی چھوڑ کر جانے والے کا سا وعظ ہے''۔یعنی اس خطاب سے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ اس دنیا سے رخصت ہونے والے اور ہم سے پردہ کر کے دور ہو جانے والے ہیں۔فَاَوْصِنَا''(اگر واقعی ایسا ہے) تو پھر ہمیں ذرا مزید وصیت کیجیے'' ـــــ اب یہاں لفظ وصیت آ گیا۔وصیت' نصیحت اور وعظ' یہ ایک ہی قبیل کے الفاظ ہیں اور ان کے معنوں میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے ـــــ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دیکھا کہ اس وعظ سے تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے حضور ﷺ ہمیں الوداع کہہ رہے ہیں تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں ایسی باتوں کی نصیحت فرما دیجیے جو آئندہ ہمارے لیے روشنی کا مینار بنیں۔

پہلی وصیت: اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلی وصیت یہ فرمائی:((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ

عَزَّوَجَلَّ))'' میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی' جو بہت زبردست' بہت بلند و بالا ہے''۔ —— بعض روایات میں الفاظ آتے ہیں کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے: ((اُوْصِیْکُمْ وَنَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰهِ))'' میں تمہیں بھی وصیت کرتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی وصیت کرتا ہوں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی'' —— یعنی اللہ کی عظمت' جلالتِ شان' اس کے مواخذے اور اس کے محاسبے کا ایک احساس دل کے اندر قائم رہنا چاہیے۔ یہ بات تو ایک مؤمن کی معراج ہے کہ اس کو یہ یقین ہو جائے کہ گویا وہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کم از کم یہ کیفیت تو ضرور ہونی چاہیے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اللہ کے حضور میں ہوں۔ (I am in His presence) اس کے نتیجے میں تقویٰ پیدا ہوگا کہ اب بچ بچ کر چلنا ہے کہ کہیں کوئی غلط کام نہ ہو جائے' میرے اعضاء و جوارح سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے اور نہ کوئی ایسا خیال دل میں آنے پائے۔ اگر دل میں ایمان کے خلاف یا کسی گناہ اور برائی کا کوئی وسوسہ آجائے تو انسان لاحول ولاقوۃ الا باللہ یا تعوذ پڑھ کر اللہ کی پناہ میں آجائے اور اس برائی سے نفرت کا اظہار کرے۔ وسوسہ اندازی کا اختیار تو اللہ نے شیطان کو دیا ہوا ہے۔ سورۃ الناس میں ہے: ﴿الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○﴾ ''جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے''۔ لہٰذا وسوسہ تو آ سکتا ہے' لیکن ایمان کی علامت یہ ہے کہ پھر انسان کو شدید دکھ ہو کہ میرے دل میں یہ وسوسہ کیوں آیا۔ بہرحال تقویٰ یہ ہے کہ نہ تو میرے دل میں کوئی ایسی بات آئے اور نہ میرے اعضاء و جوارح —— میری زبان' میرے ہاتھ' میرے پاؤں' میری آنکھوں اور میرے منہ —— سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جو اللہ کی ناراضگی کا باعث بنے۔

تقویٰ کا ترجمہ عام طور پر ''ڈر'' کر دیا جاتا ہے' جو اچھا ترجمہ نہیں ہے۔ غلط میں نہیں کہہ رہا' اس لیے کہ ڈر کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ تقویٰ کا اصل مفہوم ''بچنا'' ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے سے بچنا۔ اب یہ بچنا خوف کے تحت بھی ہو سکتا ہے اور محبت کے تحت بھی۔ جیسے ایک سعادت مند بیٹا باپ کے خوف سے کسی کام سے رک

جاتا ہے کہ باز پرس ہو جائے گی' مار پیٹ ہو جائے گی' سزا مل جائے گی۔ یہ رکنا خوف کی وجہ سے ہے' مگر بعض اوقات بیٹا اپنے باپ کی محبت کی وجہ سے بھی کسی کام سے رک جاتا ہے کہ میرے ایسا کرنے سے ابا کا دل خراب نہ ہو جائے' ابا کو اس سے رنج نہ پہنچے' میری اس حرکت سے ان کا دل نہ ٹوٹے۔ اب یہ محبت اور عظمت کے تحت ناراضگی سے بچنا ہے۔ لہٰذا تقویٰ میں یہ دونوں پہلو ہونے چاہئیں۔ آج کل انگریزی میں اس کا ترجمہ God consciousness کیا جا رہا ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ اچھا ترجمہ ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے تقویٰ کا ترجمہ بھی ڈر کر دیا گیا' انذار کا ترجمہ بھی ڈرانا کر دیا گیا اور خوف کے تو معنی ہی ڈر کے ہیں' تو ان مختلف الفاظ کا ایک ہی ترجمہ کرنے سے عیسائیوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ قرآن مجید خوف کے جذبے کو زیادہ حرکت میں لاتا ہے اور خوف ایک منفی (negative) جذبہ ہے' جبکہ بائبل اور حضرت مسیح علیہ السلام کے وعظ محبت کے جذبے کو اُبھارتے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے' قرآن مجید میں بھی یہ سب پہلو موجود ہیں' اس میں کوئی شک کی بات نہیں' لیکن مختلف الفاظ کے ایک جیسے ترجمے کرنے سے ایسا تاثر ملتا ہے جیسے مجموعی طور پر (over all) یہاں پر ڈر اور خوف کی بات کی جا رہی ہے۔ چنانچہ واضح رہنا چاہیے کہ تقویٰ کے معنی ڈرنے کے نہیں' بچنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ ''اے اہل ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ!''

دوسری وصیت: سنو اور مانو (امیر کی اطاعت کرو)

رسول اللہ ﷺ نے دوسری وصیت یہ فرمائی: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ)) ''(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں) سمع و طاعت کی یعنی سنو اور مانو''۔ سمع و طاعت درحقیقت دین کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قرآن مجید کا جو بھی حکم آیا اسے سنو اور اس کو مانو' مزید یہ کہ اس کے مطابق عمل کرو۔ یہ نہیں کہ پہلے ہمیں سمجھایا جائے کہ اس میں کیا حکمت اور کیا فائدہ ہے۔ بلکہ اللہ کو مانتے ہو تو جو حکم آیا اس کو بھی مانو۔ اس میں کوئی چون و چرا اور کیوں' کیسے نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھی جو حکم آیا اس کو

بھی بلاتردّد مانو۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾(المائدۃ:۷) ''کہ جب تم نے کہا کہ ہم نے (اللہ کا حکم) سنا اور اسے مانا''۔ لہٰذا سننے اور ماننے کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ سن تو لیا ہے' لیکن ابھی غور کر رہے ہیں کہ اچھی بات ہے کہ نہیں' صحیح ہے کہ نہیں' اس میں مصلحت کیا ہے' اس میں تو یہ اندیشے ہیں' اس سے بہتر تو یہ رائے ہے' وغیرہ۔ اگر کسی حکم میں اس طرح کا لیت ولعل ہو جائے گا تو پھر ڈسپلن نہیں رہے گا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اوّلاً مسلمانوں کی حیثیت ایک انقلابی جماعت کی سی تھی اور انقلابی جماعت میں جب تک سمع وطاعت اور ڈسپلن نہیں ہوگا' انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔ اُس وقت مسلمانوں کی جماعت میں ایسا ڈسپلن تھا جیسے فوج کا ڈسپلن ہوتا ہے۔ فوج میں پہلا قانون ہی یہ ہے: listen and obey ''سنو اور مانو!'' اگر کوئی ماتحت فوجی اپنے افسر سے کہے: جناب! آپ جو حکم دے رہے ہیں' پہلے بتایئے کہ اس کی حکمت کیا ہے' فائدہ اور مصلحت کیا ہے' آپ کے سامنے اس کا کیا مقصد ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ فوج نہیں رہی' کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ فوج میں تو بس listen and obey کا اصول چلتا ہے۔ ہم نے میٹرک میں ایک بڑی پیاری نظم پڑھی تھی:

"The Charge of the Light Brigade"

''لائٹ بریگیڈ'' بمعنی برق رفتار یا روشنی کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ چلنے والا۔ چھ سو گھڑ سواروں پر مشتمل اس بریگیڈ نے فوجی ڈسپلن کی اعلیٰ ترین مثال قائم کر کے دکھا دی۔ ان کو اپنے کمانڈر کی طرف سے پیش قدمی کا حکم ملا' جبکہ انہیں معلوم تھا کہ:

Cannon to right of them,
Cannon to left of them,
Cannon in front of them,

یعنی دشمن نے تینوں اطراف دائیں' بائیں اور سامنے توپیں نصب کر رکھی ہیں اور اس وقت پیش قدمی یقینی طور پر موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا سب نے سمجھا:

Some one had blundered

کہ کسی نے بہت بڑی غلطی کی ہے جو پیش قدمی کا حکم دیا ہے' لیکن

Theirs not to make reply,
Theirs not to reason why?
Theirs but to do and die!

ان کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ اس کا جواب مانگتے یا وجہ طلب کرتے' بلکہ ان کا کام بہرصورت اس حکم پر عمل کرنا تھا۔ موت آتی ہے تو آئے' چنانچہ:

Into the valley of death
Rode the six hundred.

چھ سو کے چھ سو افراد موت کی وادی میں اتر گئے اور سب ہلاک ہو گئے' کیونکہ تین طرف سے توپیں آگ برسا رہی تھیں اور اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ آپ ﷺ نے بھی فرمایا کہ میں تمہیں سمع و طاعت کی وصیت کرتا ہوں۔

دورِ نبوی ﷺ میں مسلمانوں کی جماعت میں سمع و طاعت کا ڈسپلن لاگو تھا اور بعد میں یہی معاملہ خلافت راشدہ میں تھا۔ ان دونوں ادوار میں ایک فرق بھی تھا' وہ یہ کہ حضور ﷺ کے معاملے میں سوال کرنے کا اختیار بھی نہیں تھا' جبکہ خلافت راشدہ کے دور میں سوال کیا جا سکتا تھا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہا: **لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ** ''نہ ہم سنیں گے اور نہ مانیں گے''۔ اب یہ کلمہ بغاوت حضرت سلمان فارسیؓ کے سوا کوئی اور شخص نہیں کہہ سکتا تھا ـــــ سلمان فارسیؓ کے بارے میں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ سلمان تو ہمارے اہل بیت میں شامل ہے۔ پھر ان کی ایک لمبی داستان ہے کہ طلبِ حق کی خاطر کون کون سی وادیوں اور مرحلوں سے گزر کر حضور ﷺ کے قدموں تک پہنچے ہیں ـــــ انہوں نے کہہ دیا: **لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ**۔ اس پر حضرت عمرؓ نے برا نہیں منایا' بلکہ پوچھا: کیوں؟ کہنے لگے: آپؓ نے جو کرتا پہنا ہوا ہے' یہ اُن یمنی چادروں کا بنا ہوا ہے جو مالِ غنیمت میں آئی تھیں' اور ہر مسلمان کو ایک ایک چادر ملی تھی' جس میں کرتا نہیں بنتا' جبکہ آپ تو ہم میں طویل القامت ہیں تو آپ کا کُرتا کیسے بن گیا؟ گویا الزام عائد کیا گیا کہ آپؓ نے عام مسلمان سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: عبداللہ! تم اس کا جواب دو۔ انہوں نے کھڑے ہو کر وضاحت کی کہ میرے حصے

میں بھی ایک چادر آئی تھی' جس سے میرا کرتا نہیں بن رہا تھا اور ابا جان کی چادر سے اُن کا کرتا نہیں بن رہا تھا تو میں نے اپنے حصے کی چادر ان کو دے دی تو اس سے یہ کرتا بن گیا۔ یہ وضاحت سن کر حضرت سلمانؓ نے کہا: اَلْآنَ نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ ''اب ہم سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی''۔ یعنی یہ مغربی جمہوریت والی بات نہیں ہے کہ اپوزیشن نے ہر حال میں مخالفت (oppose) ہی کرنی ہے' ہر حال میں ٹانگیں گھسیٹنی ہی گھسیٹنی ہیں۔ نہیں' جب ایک بات کی وضاحت ہوگئی تو اب وہ معاملہ ختم ہوا۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ

رسول اللہ ﷺ نے مخلوق کی اطاعت کے حوالے سے ایک بنیادی اصول بیان فرما دیا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) (۱) ''مخلوق میں سے کسی کی اطاعت نہیں ایسے کام میں جس میں اللہ کی نافرمانی لازم آئے''۔ اگر شوہر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف کوئی حکم دے رہا ہے تو مسلمان بیوی پر اس کی اطاعت لازم نہیں ہے' بصورتِ دیگر اطاعت لازم ہے۔ قرآن مجید میں بیویوں کے حوالے سے فرمایا گیا: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ (النساء: ۳٤) کہ نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں' اپنے شوہروں کا حکم ماننے والی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک رائے شوہر کی ہے اور ایک بیوی کی' دونوں باتیں صحیح ہیں اور خلافِ شریعت کوئی بھی نہیں۔ اب یا تو بیوی اپنی اپیل یا دلیل سے شوہر کو راضی کر لے' ورنہ اسے شوہر کی بات ماننی پڑے گی۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ شوہر اگر شریعت کے خلاف حکم دے تو بھی اسے ماننا پڑے۔

اسی طرح تمہارا امیر کوئی خلافِ شریعت حکم دے تو آپ کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے! اور اگر کوئی امیر اس بات پر پوری طرح سے جم جائے اور مصر ہو تو پھر آپ اس جماعت کو چھوڑیں اور کوئی دوسری جماعت ڈھونڈیں یا آپ خود جماعت بنائیں' لیکن جماعت کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَاِنَّ

(۱) سنن الترمذی' ابواب الجہاد' باب ما جاء لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔

الشَّیْطٰنَ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ))[1] ''تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ساتھ رہیں تو وہ دور ہو جاتا ہے''۔

یہ ہے اللہ کے تقویٰ کے ساتھ' سمع و طاعت کا نظام اور اس کا حکم سورۃ التغابن کے آخر میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''تو تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک' اور سنو اور اطاعت کرو!''

حبشی غلام کی اطاعت بھی لازم ہے اگر وہ حاکم بن جائے

آگے ایک اہم نازک مسئلہ آ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ)) ''چاہے تم پر کوئی حبشی غلام ہی حکمران بن بیٹھے (تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے)''۔ یہ اس اعتبار سے ذرا نازک مسئلہ ہے کہ یہاں لفظ تَاَمَّرَ آیا ہے۔ اس کو سمجھ لیجیے۔ ایک ہے باب تفعیل اور ایک ہے باب تفعّل' ان میں فرق ہے۔ مثلاً تعلیم (بروزنِ تفعیل) کا معنی ہے کسی کو علم سکھانا' اور تعلّم (بروزن تفعُّل) کا معنی ہے خود علم حاصل کرنا۔ مادہ ایک ہی ہے لیکن باب تبدیل ہونے سے معنی میں نمایاں فرق ہو گیا۔ اسی طرح اَمَّرَ ' یُؤَمِّرُ تَاْمِیْرًا (تفعیل) کا معنی ہے کسی کو امیر بنانا اور تَاَمَّرَ، یَتَاَمَّرُ تَاَمُّرًا (تفعّل) کا معنی ہے خود امیر بن جانا۔ زیر مطالعہ حدیث میں لفظ تَاَمَّرَ آیا ہے' اس اعتبار سے معنی یہ ہو گا کہ اگر کوئی حبشی غلام اپنی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر خود امیر بن جائے تو بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔[2]

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی لزوم الجماعۃ۔

(۲) حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی زیر مطالعہ روایت حافظ ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' (۱۱۹/۴) میں اور حافظ منذریؒ نے ''الترغیب والترھیب'' (۶۰/۱) میں درج کی ہے اور علامہ البانیؒ نے ''صحیح الترغیب والترھیب'' میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں اسے ترمذی اور ابوداؤد کے حوالے سے درج کیا ہے۔ لیکن ترمذی اور ابوداؤد کے علاوہ سنن ابن ماجہ' مسند احمد اور سنن دارمی میں بھی عرباض بن ساریہؓ کی روایت ◄

ایک تو ہے اسلام کا آئیڈیل نظام۔اس میں تو امارت مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہوگی۔اب کوئی نبی نہیں آئے گا' لہٰذا مسلمانوں میں سے ہی کسی کو اپنا امیر بنانا ہے تو اس کے لیے مشورہ ہوگا اور امیر کے انتخاب کے بعد اس کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔بعض لوگ بیعت اور الیکشن کو گڈمڈ (confuse) کرتے ہیں۔یہ دونوں چیزیں بالکل مختلف ہیں۔الیکشن مشورے کے قائم مقام ہے جبکہ بیعت مشورے کے بعد ہے۔ جیسے ثقیفہ بنی ساعدہ میں پہلے مشورہ ہوا۔انصار نے کہا کہ اسلام کو عزت اور غلبہ ہماری مدد سے ہوا ہے' لہٰذا خلافت ہمارا حق ہے۔لیکن عرب تو قریش کے سوا کسی کی سیادت کو نہ جانتے تھے اور نہ مان سکتے تھے۔تو پھر نظم کیسے قائم ہوگا؟ جب اس صورتِ حال کی اطلاع ملی تو حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما فوری طور پر وہاں پہنچے کہ کہیں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے اور ایک دفعہ اگر بیعت منعقد ہوگئی تو پھر اس کو ختم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔اس لیے جلدی آئے — اہلِ تشیع ان دونوں (صاحبین) پر الزام لگاتے ہیں کہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین نہیں ہوئی اور یہ لوگ وہاں خلافت کے مشورے کے لیے آ گئے۔دوسری طرف حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما جو آپؐ کے قریبی اعزہ اور رشتہ دار تھے' وہ تجہیز و تکفین کے معاملے میں لگے ہوئے تھے — وہاں پر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کی گئی: ((اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ))(۱) چنانچہ

◄ جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے ان میں ''تأمّر علیکم'' کے الفاظ شامل نہیں ہیں' بلکہ ''اِنْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ'' اور ''اِنْ کَانَ عَبْدًا حَبَشِیًّا'' جیسے الفاظ آئے ہیں' یعنی امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو' اس کا حکم سننا اور ماننا ضروری ہے۔تاہم امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث مبارک ((وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا)) کے ذیل میں لکھا ہے کہ ''ایک غلام اگر غلبہ حاصل کر کے از خود امیر بن بیٹھے اور امورِ سلطنت کتاب وسنت کے مطابق انجام دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔البتہ عام حالات میں جبکہ امیر کا انتخاب مسلمانوں کی آزادانہ رائے سے ہو رہا ہے' کسی غلام کو امیر منتخب کرنا درست نہیں ہوگا''۔(حاشیہ از مدیر)

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی :۲٦/٤ و ٢٥٧/٦۔ السنن الکبریٰ للبیہقی:۱٤٤/۸۔

مشورے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا گیا اور پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشورے سے نامزد کیا تھا اور پھر بیعت ہوئی تھی۔

امامت متغلّب کا معاملہ

یہ تو ہے اسلام کا آئیڈیل نظام کہ مسلمانوں کی مشاورت سے امیر منتخب ہوگا' لیکن اگر ایک شخص خود اپنی طاقت سے زبردستی امیر بن جاتا ہے تو آیا اس کی اطاعت بھی لازم ہے یا نہیں؟ اصطلاح میں اس کو ''امامت متغلّب'' کہا جاتا ہے' یعنی خود غلبہ لے لینا' طاقت کے بل پر خود قابض ہو جانا —— امامت متغلّب جائز ہے یا نہیں' اور پھر ایسے امام کی اطاعت لازم ہے یا نہیں؟ فقہاء اور ائمہ حدیث کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ چاہے کوئی زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر امیر بن بیٹھے تو جب تک وہ اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق حکم دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنا پر اسلامی جماعت میں دورِ خلافت راشدہ کے بعد بھی نظم قائم رہا۔

خلافت راشدہ کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی قوت کے بل بوتے پر خلیفہ بنے ہیں' جبکہ لوگوں کے مشورے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موت کا وقت جب قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا ہم آپ کے بعد حسنؓ کو خلیفہ بنا لیں؟ انہوں نے کہا: نہ میں روکتا ہوں اور نہ میں اس کا حکم دیتا ہوں' یہ تمہارا معاملہ ہے اور تم اسے باہمی مشورے سے طے کر لو۔ مشورہ ہوا اور حضرت حسنؓ خلیفہ بن گئے۔ دوسری طرف امیر شام حضرت امیر معاویہؓ فوج لے کر آ گئے اور خانہ جنگی کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے جنگ صفین میں ۷۰ ہزار اور جنگ جمل کی ایک رات میں دس ہزار مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اب بھی جنگ کا خدشہ پیدا ہوا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ مصلحت سے کام لیتے ہوئے خلافت سے دستبردار ہو گئے اور خلافت حضرت معاویہؓ کے حوالے کر دی۔ اسی وجہ سے آپ کو خلیفہ راشد نہیں کہا جاتا کہ وہ لوگوں کے مشورے سے نہیں' بلکہ اپنی قوتِ بازو اور طاقت کے بل پر خلیفہ بنے تھے۔ لیکن یہ صورت بھی جائز ہے'

حرام نہیں ہے۔ (اس پر تفصیلی گفتگو آگے ہوگی۔)

نسلی تعصّبات کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی حبشی غلام بھی حکمران بن جائے تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔ اس میں دو باتیں ہیں: (۱) غلام ہونا' اور (۲) حبشی ہونا۔ ظاہر بات ہے کہ غلام کا درجہ کسی طور پر بھی آزاد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ کہ اگرچہ اسلام نے رنگ و نسل کے سارے امتیازات ختم کر دیے تھے' مگر پھر بھی عربوں کے ہاں کچھ نہ کچھ نسلی تعصب موجود تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت اور تزکیہ فرمایا اور وہ مساواتِ انسانی کے پوری طرح قائل تھے' لیکن اُس دور میں بھی اِکا دُکا واقعات ایسے رونما ہو جاتے جن سے نسلی تعصب کی بو آتی — چنانچہ ایک عرب صحابی نے ایک حبشی صحابی سے جھگڑتے ہوئے غصے میں آ کر کہہ دیا: یَا ابْنَ السَّوْدَاء ''اے سیاہ فام عورت کے بیٹے!'' حضور ﷺ نے سنا تو فرمایا: ((اِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ))(۱) ''تم ایسے شخص ہو جس میں ابھی جاہلیت کے اثرات موجود ہیں!''

الغرض اسلام آنے کے بعد بھی بعض لوگ حبشیوں کو کمتر سمجھتے تھے اور یہ نسلی تعصب مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکا۔ آج امریکہ میں بھی رنگ و نسل کا یہ فرق ختم نہیں کیا جاسکا' حالانکہ وہ تعلیم و تعلم' تہذیب و تمدن' معاشرت اور قانون کے اعتبار سے انتہا پر سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں رنگ کی بنیاد پر کسی کو discriminate کرنا بہت بڑا جرم ہے' لیکن اس سب کے باوجود رنگ و نسل کی منافرت آج بھی ان میں موجود ہے اور گورے حبشیوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ کچھ ملی احساسات ہوتے ہیں جو انسانی فطرت میں اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ ان میں کمی تو آسکتی لیکن مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا حضور اکرم ﷺ نے امیر کی اطاعت کے حوالے سے انتہائی بات فرمائی کہ کوئی حبشی غلام بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اگر حکمران بن بیٹھے اور وہ خلافِ شریعت کوئی حکم نہ دے تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔

(۱) غایة المرام للالبانی' ح:۳۰۷۔ راوی: ابو ذر الغفاری ؓ۔

غلام بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اگر حکمران بن بیٹھے اور وہ خلافِ شریعت کوئی حکم نہ دے تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔

فاسق وفاجر حکمران کے خلاف بغاوت

اکثر فقہاء کی رائے تو یہی ہے کہ امامت متغلب جائز ہے اور اس کی اطاعت بھی لازم ہے' البتہ فاسق وفاجر حکمران کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کی جاسکتی ہے۔ باقی فقہاء کے نزدیک فاسق و فاجر حکمران خواہ اپنے محل کی چار دیواری میں رنگ رلیاں منا رہا ہے یا اور کچھ کر رہا ہے' لیکن وہ نماز قائم کر رہا ہے' جمعہ' جماعت اور حج کا سارا انتظام کر رہا ہے تو اس کی اطاعت کرو' البتہ اگر وہ کفر کا حکم دے تو پھر اس کے خلاف کھڑے ہو جاؤ' اس لیے کہ اس کے بعد معاملہ ایک حد سے تجاوز کر جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ فاسق و فاجر شخص کے خلاف اس وقت بغاوت ہوسکتی ہے جب اس پر کوئی نصیحت اثر نہ کر رہی ہو۔ پہلے امر بالمعروف ونہی عن المنکر زبان سے کیا جائے' دیکھو باز آ جاؤ' ان چیزوں کو چھوڑ دو' لیکن اگر وہ باز نہیں آ رہا اور اس نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھا رہا تو پھر نہی عن المنکر تلوار کے ذریعے سے ہوگا۔ البتہ بغاوت اور مسلح جدّ وجُہد کی صورت میں امام ابوحنیفہ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ طاقت اتنی ہونی چاہیے کہ کم از کم ظاہری حالات واسباب کے مطابق کامیابی یقینی ہو جائے۔ یہ نہیں کہ تھوڑے سے لوگ جمع ہو کر بغاوت کا نعرہ لگا دیں اور پھر سب کے سب کچل دیے جائیں۔ لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ملوکیت کے نظام میں اتنی طاقت فراہم ہو جانا' ناممکن ہے۔

کثرتِ اختلاف کا زمانہ

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَإِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ''پس جو بھی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ یقیناً بہت سارے اختلافات دیکھے گا''۔ اب یہ اختلافات کئی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک تو رائے کا اختلاف ہوتا ہے' جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا کہ مانعینِ

زکوٰۃ کے خلاف آپ اقدام نہ کریں۔ دو محاذ تو پہلے ہی کھلے ہوئے ہیں۔ آپؓ نے جیشِ اسامہؓ بھی روانہ کر دیا ہے۔ چونکہ وہ لشکر حضور ﷺ نے تیار کیا تھا اور آپ نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ پھر ظاہر بات ہے کہ جھوٹی نبوت کے دعوے داروں کے خلاف جنگ بھی کرنی ہی کرنی ہے' لیکن جن لوگوں نے صرف زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے وہ کافر تو نہیں ہوئے۔ اصل میں انہوں نے زکوٰۃ کا انکار نہیں کیا تھا' بلکہ ان کا موقف یہ تھا کہ ہم زکوٰۃ خود لیں گے' خود تقسیم کریں گے اور حکومت کو نہیں دیں گے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ ڈٹے رہے اور آپؓ نے فرمایا: أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَاَنَا حَيٌّ ؟ (۱) کیا دین میں کمی کی جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟'' میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم! اگر حضور ﷺ کے زمانے میں یہ لوگ زکوٰۃ کی مد میں اونٹوں کے ساتھ ان کو باندھنے والی رسیاں بھی دیتے تھے اور اب اگر یہ کہیں کہ یہ اونٹ لے جاؤ اور عقال ہم نہیں دیں گے تب بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔ اونٹ کے مقابلے میں عقال کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں' لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دین میں اتنی ترمیم بھی گوارا نہیں تھی۔

یہ تو رائے کا اختلاف تھا' جبکہ بعد میں مسلمانوں میں سیاسی نوعیت کے اختلافات بھی ہوئے اور یہ اختلافات شدید نوعیت کے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر زبردست اختلاف پیدا ہوا۔ مدینے کے لوگ' جن میں ایک بڑی تعداد بلوائیوں کی تھی اور جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا' ان لوگوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور حضرت علی خلیفہ مقرر ہو گئے۔ دوسری طرف بہت سے صحابہ کرامؓ نے ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ حضرت امیر معاویہ' حضرت عمرو بن العاص' حضرت زبیر' حضرت طلحہ اور حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہم) نے کہا کہ پہلے آپ قاتلینِ عثمانؓ کو سزا دیں' پھر ہم آپ کی بیعت کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں آپ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بہرحال یہ اختلاف بڑا شدید ہوا اور جنگ جمل ہوئی' جس میں ایک رات میں دس ہزار مسلمان قتل ہوئے۔ اس کے

(۱) تخریج مشکاۃ المصابیح لابن حجر العسقلانی : ۳۹۷/۵

بعد حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ شام اور مصر کی فوجوں کو لے کر آئے اور پھر جنگ صفین جیسا بہت بڑا معرکہ ہوا جس میں ۷۴ ہزار مسلمان ختم ہوئے۔ پھر وہیں سے خوارج کا ایک فرقہ نمودار ہوا اور ان کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تو چار ہزار خوارج جنگ نہروان میں ختم ہو گئے۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک تقریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور نیزوں سے شہید ہوئے۔

پھر ہمارے ہاں فقہی اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ مختلف مکاتب فکر کے اصول فقہ مختلف ہو گئے۔ اہلِ علم کے مابین یہ اختلاف بھی پیدا ہوا کہ قرآن وسنت سے مستنبط ہونے والی رائے کو ترجیح دی جائے گی یا خبر واحد کو؟ اس پر ہمارے ہاں پورے دو مسلک بن گئے۔ ایک ''اصحاب الرائے'' کہلاتے ہیں' جن کے سرخیل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور ایک ''اصحاب الحدیث'' کہلاتے ہیں جن کے سرخیل امام مالک' امام شافعی اور پھر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اصحاب الحدیث اخبار احاد کو' جبکہ اصحاب الرائے ان کے مقابلے میں قرآن حکیم اور پختہ احادیث کی روشنی میں قائم ہونے والی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مابین بہت سے فقہی معاملات میں اختلاف ہو گیا۔

زمانۂ اختلاف میں راہِ عمل

جب یہ اختلافات ہو جائیں گے تو اب کیا کیا جائے؟ اس ضمن میں یہ بڑا اہم اصول آ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''پس (ان حالات میں) میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑو'' ((تَمَسَّكُوْا بِهَا)) ''اس کو مضبوطی سے تھامو'' ((وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ''اور اسے داڑھوں سے قابو کرنا''۔ یعنی اتنی مضبوطی سے پکڑنا کہ گرفت ڈھیلی نہ پڑے۔

اس جملہ میں لفظ ''راشدین'' آیا ہے' اس کا مفہوم سمجھ لیجیے —— قرآن مجید میں انسان کی کامیابی کے لیے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ زیادہ تر لفظ ''فلاح''

استعمال ہوا ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ' جبکہ بعض مواقع پر لفظ ''فوز'' بھی استعمال ہوا ہے:﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ﴾ یعنی کامیابی یا کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جانا' یہ فوز ہے۔فَائِزُوْن کے مقابلے میں مُفْلِحُوْنَ بہت زیادہ گھمبیر لفظ ہے۔فلاح روحانی بھی ہے اور اخلاقی بھی۔ انسان کا ایک ''حیوانی وجود'' ہے اور ایک اس کے اندر چھپا ہوا ''روحانی وجود'' ہے اور وہ انا' خودی یا روح ہے۔ آپ کی ساری توجہ حیوانی ضروریات پر ہے جبکہ روح بیچاری سسک رہی ہے' بھوکی ہے' پیاسی ہے اور اسے آپ نے کوئی غذا ہی نہیں دی۔ اس کی غذا تو اللہ کا کلام ہے' اس لیے کہ روح تو امر ربی ہے—﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (الاسراء:۸۵) ''(اے نبیﷺ!) وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کا امر ہے''—اس 'امرِ رب' کے لیے' کلامِ رب' ضروری ہے۔ دیکھئے' یہ جسدِ حیوانی جہاں سے آیا ہے وہیں سے اس کی غذا بھی آ رہی ہے۔ یہ جسم مٹی سے بنا—﴿خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ ''اُس نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے''—تو اس تراب ہی سے ہماری گندم بھی آ رہی ہے' چاول بھی آ رہے ہیں' ہماری سبزیاں بھی آ رہی ہیں۔ ہم جانوروں کا گوشت بھی کھاتے ہیں اور وہ بھی سبزیوں سے' گھاس سے' چارے سے بنا ہے۔ الغرض خوراک اور ہماری باقی جسمانی ضروریات کا اصل ذریعہ یہ مٹی ہی ہے۔

اس کے برعکس روح کا تعلق امر رب سے ہے تو اسے غذا بھی کلامِ رب اور ذکر رب سے حاصل ہوگی۔ اور فلاح کا مطلب ہی یہ ہے کہ حیوانی وجود کو پھاڑ کر اس کے اندر سے باطنی شخصیت کو برآمد کیا جائے۔ جیسے زمین پھٹتی ہے تو اس میں سے بیج کی دو پتیاں نکلتی ہیں' جس کے لیے فلق کا لفظ آیا ہے' جو فَلَحَ کا ہم معنی ہے۔ کسان اور کاشت کار کے لیے فَلَّاح کا لفظ استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ وہ بھی اپنے ہل کی نوک سے زمین کو پھاڑتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اپنے اندر سے اپنے حقیقی وجود کو نکال کر پروان چڑھایا' وہی مُفلِحُون ہیں۔

''رُشد'' روحانی اعتبار سے سب سے اونچا مقام

انسانی کامیابی کے لیے قرآن مجید میں تیسرا لفظ رُشد استعمال ہوا ہے اور یہ روحانی اعتبار سے سب سے اونچا مقام ہے' گویا انسان اپنے منتہائے مقصود کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں صرف دو مرتبہ آیا ہے۔ ایک تو سورۃ الحجرات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں آیا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝﴾

''لیکن اللہ نے تمہارے دلوں کے اندر محبوب ترین شے ایمان کو بنا دیا اور اسے مزین کر دیا تمہارے دلوں میں اور بہت ہی ناپسندیدہ بنا دیا اللہ نے تمہارے نزدیک کفر کو' فسق کو اور گناہ کو۔ یہی ہیں وہ لوگ جو رشد کو پہنچ جانے والے ہیں۔''

دوسری مرتبہ یہ لفظ سورۃ البقرۃ میں آیا ہے جہاں روزے کے احکام اور حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔ روزے کا اصل حاصل اور اس کا نقطۂ عروج روحِ انسانی کو غذا پہنچانا اور جسم انسانی کو ذرا مضمحل کرنا ہے۔ بھوک' پیاس برداشت کرو تا کہ تمہارا جسم ذرا مضمحل ہو جائے۔ جب یہ حیوانی وجود مضمحل ہوگا تو اس روحانی وجود کو ریلیف ملے گا جو اس کے اندر دبا ہوا ہے اور دبے ہونے کی وجہ سے گویا سسک رہا ہے یا تقریباً بے ہوش ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس کے اوپر قرآن کی بارش کرو اور رات کو قیام کرو۔ چنانچہ روزے کے ذریعے سے آپ نے جسم کو دبایا اور روح کو اٹھایا ہے تو اس سے جو مقام حاصل ہوگا وہ روحانی اعتبار سے بلند ترین مقام ہے' اسی لیے اس کے لیے لفظ ''رشد'' آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ انہیں بتا دیں کہ) میں تو بالکل قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں)' پس چاہیے کہ وہ مجھے پکاریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ رشد کو پہنچ جائیں۔''

ظاہر بات ہے کہ انسان کے اندر جب حقیقی ایمان پیدا ہوتا ہے تو اللہ کا قرب حاصل کرنے کی ایک طلب سی ہوتی ہے اور اللہ کو دیکھنے کی بڑی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہی اصحابِ جنت کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت ہو گی۔ اسی دیدار کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ ''پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے''۔ یعنی اس عالمِ مادی میں رہتے ہوئے تم میرا دیدار نہیں کر سکتے اور میری تجلیات کو برداشت کرنے کی تم میں طاقت نہیں ہے۔ تم ذرا سامنے کے پہاڑ کو دیکھو، ہم اس پر اپنی ایک تجلی ڈالیں گے، اگر ہماری ایک تجلی کو وہ پہاڑ جھیل جائے تو پھر تم بھی ہمیں دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ (الاعراف:۱۴۳) ''پھر جب اُس کے رب نے اپنی ایک تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے''۔ تجلیٔ باری تعالیٰ کے اس بالواسطہ مشاہدے کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت نہ کر سکے۔ پہاڑ پر تجلی کا پڑنا تھا کہ آپؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن آخرت میں اصحابِ جنت کو جو آخری نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی وہ اللہ کا دیدار ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنا دیدار نصیب فرمائے۔ آمین!

رہبانیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں!

تاریخ انسانی کا مطالعہ کرنے والوں کے علم میں ہے کہ لوگ اپنے رب کو پانے کے لیے ہی پہاڑوں میں بیٹھتے تھے، مراقبے کرتے تھے، غاروں میں نفس کشی کی ریاضتیں کرتے تھے۔ عیسائیوں کے اندر تو نفس کشی کی انتہا ہوئی ہے اور قرآن مجید میں ان کے اوپر تنقید بھی کی گئی ہے: ﴿وَ رَهْبَانِیَّةَ ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ﴾ (الحدید:۲۷) کہ رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی، جبکہ ہم نے ان پر یہ لازم نہیں کی تھی۔ اپنے نفس کو مارنے کا حکم اللہ نے نہیں دیا ہے۔ نفس کا بھی حق ہے، اسے ادا کرو، یہ نہیں ہے کہ اسے کچل دو، اسے ختم کر دو۔ ہاں نفس کے تابع نہ ہو جاؤ بلکہ اپنے نفس کو اللہ کے احکام

کے تابع کر دو۔ یہ ہمارا نفس، ہمارا حیوانی وجود ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔ یہ ہاتھ، یہ پاؤں، یہ آنکھیں، یہ کان، یہ ناک، یہ زبان، یہ ساری چیزیں ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں اور ان کا بھی حق ہے جن کو ادا کرنا ہم پر لازم ہے اور کل قیامت کے دن اس بارے میں ہم سے سوال ہوگا۔

میں نے بارہا آپ کو بتایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما پوری رات بستر پر کمر لگاتے ہی نہیں تھے اور ہر روز روزہ رکھتے تھے، بیوی سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ وہ خود روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ نے مجھے بلا کر (ذرا تیکھے انداز میں) دریافت فرمایا: ((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) ''کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ تم رات بھر قیام کرتے ہو اور روزانہ دن کو روزہ رکھتے ہو؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ، قُمْ وَنَمْ، وَصُمْ وَاَفْطِرْ، فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا......))(۱) ''تو ایسا مت کرو، (رات کو) قیام بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو، اور روزے رکھا بھی کرو اور چھوڑ بھی دیا کرو، اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ (نیند) کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے......'' گزشتہ حدیث میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ بندۂ مؤمن کا اپنی بیوی سے ہم بستری کرنا بھی باعث ثواب ہے۔ ہمارے سارے حیوانی اعمال عبادت بن جاتے ہیں جب اللہ کے حکم کے تابع اور اللہ کی حدود یعنی حلال وحرام کے دائرے میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو تمہاری زیارت اور ملاقات کے لیے آیا ہے تو اس کا بھی تم پر حق ہے، لہٰذا اس سے بھی خوشدلی کے ساتھ ملو۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ((تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ))(۲) ''تمہارا اپنے بھائی سے متبسم چہرے کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہے''۔ یعنی اللہ کے ہاں اس کا بھی

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لزوجك علیك حق۔

(۲) سنن الترمذی، ابواب البر والصلة والآداب، باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

اجر ملے گا۔ یہ نہیں کہ آپ ''عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا'' بن جائیں اور وہ بھی پریشان ہو رہا ہو کہ میں خواہ مخواہ اس سے ملنے کے لیے آ گیا ہوں۔

خلفائے راشدین میں کون کون شامل ہے؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کثرتِ اختلاف کے دور میں میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑو۔ اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ خلفائے راشدین میں کون کون شامل ہے؟ حضرات ابوبکر' عمر' عثمان اور علی رضی اللہ عنہم پر اہلِ سنت کا تو اجماع ہے' جبکہ اہلِ تشیع پہلے تین کو نہیں مانتے۔ ان میں سے جو غالی قسم کے گروہ ہیں وہ پہلے تین خلفاء کو غاصب کہتے ہیں اور جو ذرا مائل قسم کے ''زیدی شیعہ'' ہیں وہ غاصب تو نہیں کہتے' لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ حق بہرحال حضرت علیؓ ہی کا تھا کیونکہ وہ تمام صحابہ میں افضل ہیں' جبکہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد پوری انسانیت میں افضل ترین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں' اس کے بعد حضرت عمر فاروق' پھر حضرت عثمان غنی اور پھر حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؓ باقی پوری نوعِ انسانی سے افضل ہیں' لیکن یہ تین حضرات ان سے افضل ہیں۔

یہ چاروں حضرات تو بالاتفاق خلفائے راشدین ہیں' جبکہ کچھ لوگ اس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ حضرت حسنؓ کو بھی خلفائے راشدین میں شمار کیا جانا چاہیے' اس لیے کہ وہ صحابی بھی ہیں اور ان کی بہت فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے — آپؓ کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے اور آپ حضور ﷺ کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ عین نماز کی حالت میں حضور ﷺ کے کندھوں پر سواری کی ہے۔ یہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سجدے کی حالت میں حضور ﷺ کی پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تو آپ ﷺ کبھی سجدہ لمبا کر دیتے اور کبھی بڑے ہی آرام سے انہیں نیچے اتارتے تھے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما میرے باغ کے دو پھول ہیں — دوسری بات یہ ہے کہ حضرت حسنؓ نے خود اپنی طاقت سے خلافت حاصل نہیں کی' بلکہ وہ باہمی مشاورت سے منتخب ہوئے ہیں' لہٰذا انہیں بھی خلفائے راشدین المہدیین میں شامل کیا جانا چاہیے۔

البتہ امیر معاویہؓ کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ہمارے ہاں بعض انتہا پسند لوگ حضرت

امیر معاویہؓ کو بھی خلیفہ راشد کہتے ہیں' اس لیے کہ وہ بھی صحابی ہیں' لیکن اہل سنت نے ان کو اس طور سے تسلیم نہیں کیا' اس لیے کہ وہ متغلب ہیں۔ انہیں کسی نے نہیں چنا اور نہ ان کے لیے کوئی مشاورت ہوئی تھی۔ وہ تو حضرت حسنؓ نے مسلمانوں میں خونریزی اور باہمی جنگ وجدل روکنے کے لیے دستبرداری اختیار کر کے خلافت امیر معاویہؓ کے سپرد کردی تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا تھا: ((اِبْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))[۱] ''یہ میرا بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے گا''۔ اس سال کو عام الصُّلح (صلح کا سال) اور عام الْاَمن (امن کا سال) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد بیس برس تک حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت رہی۔

حضرات ابوبکر' عمر' عثمان' علی اور حسن (رضی اللہ عنہم) ان پانچوں حضرات کے دورِ خلافت کو جمع کیا جائے تو تیس سال بنتے ہیں اور اس میں حضرت حسن کے دورِ خلافت کے بھی چھ مہینے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَلْخِلَافَةُ بَعْدِيْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا))[۲] ''میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی' پھر ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا''۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور ملوکیت کا آغاز ہے' لیکن ابھی ملوکیت کی ساری خرابیاں اس میں نہیں آئی تھیں۔ ملوکیت کی خرابیاں بعد میں بنواُمیہ کے خلفاء میں آئیں اور بنوعباس کے دور میں اس میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کے دور میں محلات بنے اور دنیوی کروفر اور شان وشوکت' جو شہنشاہوں میں ہوا کرتی تھی وہی خلفاء بنوعباس نے اختیار کی۔

امیر سے اختلاف اور تنازع کی صورت میں فیصلہ کون کرے گا؟

سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے الفاظ: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان تنازع ہو جائے تو لوٹا دو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف'' ___ میں ایک بات تو واضح ہے کہ اختلاف کی صورت میں

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب علامات النبوة فی الاسلام۔

(۲) صحیح ابن حبان' ح: ۶۹۴۳۰۔ جامع بیان العلم للامام احمد: ۱۱۶۹/۲ راوی: سفینة رضی اللہ عنہ

فیصلہ کن وہی دو مطلق اطاعتیں ہوں گی‘ یعنی اللہ کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت۔ تاہم اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیر اور مامورین میں کسی تنازع کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف کون لوٹائے گا‘ یعنی کون فیصلہ کرے گا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ فرض کیجیے اگر تو دو مسلمانوں میں کوئی تنازع ہے تو امیر المؤمنین طے کرا دے‘ لیکن اگر مسلمانوں کو اپنے امیر سے ہی اختلاف ہو گیا تو اس صورتِ حال میں کیا کریں گے؟ خلافت راشدہ کے دور میں تو اس کے ضمن میں کوئی ادارہ (institution) موجود نہیں تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے فوراً بعد اپنے خطاب میں کہا تھا کہ اگر میں اللہ اور اس کے رسول کے راستے پر چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے اور اگر میں ٹیڑھا ہونے لگوں یا غلط راستے پر چلوں تو مجھے سیدھا کرنا تم پر فرض ہے۔ اب سیدھا کیسے کریں؟ اس کا وہاں کوئی طریق کار طے نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلفائے راشدین اس پہلو سے مستثنیٰ ہیں‘ اس لیے کہ وہ حضور ﷺ کے انتہائی قریبی ہیں‘ لیکن بعد کے دور میں یہ کام عدلیہ (judiciary) کے ادارے کا ہے اور اب یہ فیصلہ عدلیہ کرے گی۔

آج کے دور میں یہ معاملہ بہت واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے کہ ریاست کے تین بنیادی ستون ہیں۔ (اگرچہ چوتھا بعد میں شامل کر دیا گیا ہے‘ لیکن اصل میں تین ہی ہیں۔) ایک انتظامیہ ہے جو حکم دیتی ہے‘ ایک مقننہ ہے جو قانون بناتی ہے اور ایک عدلیہ ہے‘ جس کی اہمیت سب سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے ایک ایگزیکٹو آرڈر آیا ہے‘ اس کے خلاف ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ تو آئین اور دستور (constitution) کے خلاف ہے‘ ہم اس ایگزیکٹو آرڈر کو نہیں مانیں گے۔ اس صورت میں آپ آئینی عدالتوں (constitutional courts) یا سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ پھر وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط!

ہمارے ہاں جنرل ضیاء الحق نے شریعت کورٹ بنا کر ایک درست راستہ اختیار کیا تھا‘ لیکن اس کے اوپر پابندیاں لگا دیں‘ دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں پہنا دیں تو وہ کام

بالکل بے کار ہو گیا۔ بہر حال راستہ صحیح تھا کہ عدلیہ فیصلہ کرے گی۔ اسی طریقے سے خاص شریعت کورٹ بنا دی جائیں اور وہ فیصلہ کریں کہ کون سی چیز اور کون سا قانون شریعت کے خلاف ہے۔

آخری وصیت: بدعت سے بچو!

زیر مطالعہ روایت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے چوتھی وصیت یہ فرمائی: ((وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ)) ''اور دین میں نئی نئی باتیں نکالنے سے بچنا''۔ بدعت کے موضوع اربعین نووی کی حدیث ۵ کے ضمن میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں' لہٰذا یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ہے قرآن اور سنت سے استنباط کر کے کوئی حکم نکالنا' اجتہاد کرنا' قیاس کرنا' تو یہ سب جائز ہیں' لیکن اگر آپ نے دین میں بالکل نئی بات نکال لی جس کی تائید میں نہ قرآن سے کوئی دلیل ملی اور نہ سنت سے تو وہ بدعت ہے۔ خاص طور پر عبادات کے اندر ثواب کمانے کے لیے کیے جانے والے کام' جس کی سند ہمارے پاس نہ قرآن میں ہے' نہ حدیث میں' نہ خلفائے راشدین کے عمل میں اور نہ صحابہؓ کے عمل میں تو وہ بدعت شمار ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ نے بدعت کے حوالے سے واضح فرما دیا کہ ((فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ)) ''پس (دین میں) ہر نئی بات یقیناً بدعت ہے''۔ ((وَکُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''(اور جان لو کہ) ہر بدعت یقینی طور پر گمراہی ہے'' ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَکُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ)) ''اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ آگ ہے!'' یا ''ہر گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے!''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس حدیث کے مندرجات پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس حدیث میں موجود حضور اکرم ﷺ کی وصیتوں کو اپنانے اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
(29)

ابوابِ خیر

(حکمت اور بھلائی کے دروازے)

۹/ مئی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ (الحجرات)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ﷺ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفَرٍ فَأَصْبَحْتُ يَوْمًا قَرِيبًا مِنْهُ وَنَحْنُ نَسِيرُ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِيْ عَنِ النَّارِ ، قَالَ :

((لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِيمٍ ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ : تَعْبُدُ اللّٰهَ لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا ، وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ)) ثُمَّ قَالَ : ((اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ)) ثُمَّ تَلَا ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ حَتّٰى بَلَغَ ﴿يَعْمَلُوْنَ﴾ (السجدة:١٦ ، ١٧) **ثُمَّ قَالَ : ((اَلَا اُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ**

وَعَمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ؟)) قُلْتُ :بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ :((رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ، وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ)) ثُمَّ قَالَ :((اَلَا اُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ؟)) فَقُلْتُ :بَلٰى :يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ((فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ)) وَقَالَ : ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) قُلْتُ :يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ؟ فَقَالَ :((ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ، اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ)) (۱)

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا۔ ایک صبح ہم سب چل رہے تھے تو میں آپؐ کے قریب ہوگیا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور کردے۔ آپؐ نے فرمایا:

''تو نے ایک انتہائی اہم چیز کا سوال کیا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ جس کے لیے آسان فرمادے اس کے لیے بلاشبہ یہ بڑا آسان کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرتے رہو' رمضان کے روزے رکھو' اور بیت اللہ کا حج کرو''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تجھے نیکی کے دروازے نہ بتاؤں؟ روزہ (جہنم سے) ڈھال ہے۔ صدقہ گناہوں کو یوں مٹا ڈالتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور انسان کا رات کے درمیان میں نماز ادا کرنا (بہت فضیلت کا باعث ہے)۔ اور پھر آپؐ نے سورۃ السجدۃ کی یہ آیات (۱۶'۱۷) تلاوت فرمائیں: ''اہل ایمان کے پہلو (رات کو) بستر سے علیحدہ رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کو اس کے عذاب کے خوف اور رحمت کی امید کے ملے جلے جذبات و کیفیات سے پکارتے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے۔ یہ سب ان کے کیے ہوئے اعمال کی جزا اور بدلہ ہوگا''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تجھے دین کی بنیاد' اس کا ستون اور اس کا بلند ترین عمل نہ بتادوں؟'' میں نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیوں نہیں!

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ماجاء فی حرمة الصلاة۔ قال ابو عیسیٰ هذاحدیث حسن صحیح۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دین کی بنیاد 'اسلام' ہے' اس کا ستون 'نماز' ہے اور افضل و بلند ترین عمل 'جہاد' ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تجھے ان تمام اعمال کی بنیاد اور اصل کی خبر نہ دوں؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں' یارسول اللہ! کیوں نہیں! تو آپؐ نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور فرمایا: ''اسے قابو میں رکھو''۔ (حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ) میں نے کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ! ہم جو کچھ بولتے ہیں کیا اس پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''اے معاذ! تجھے تیری ماں گم پائے' لوگوں کو ان کے چہروں (یا نتھنوں) کے بل جہنم میں سب سے زیادہ ان کی زبانوں کی کٹائی (کمائی) ہی تو لے جائے گی۔''

معزز سامعین کرام!

آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی حدیث نمبر ۲۹ ہے' جس میں حکمت اور بھلائی کی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے ضمن میں' میں نے سورۃ الحجرات کی دو آیات تلاوت کی ہیں۔ یہ آیات اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اسلام اور ایمان کے فرق کو واضح کیا گیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک الگ چیز ہے اور ایمان الگ۔ فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤﴾﴾

''بدو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے فرما دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' ہاں تم یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے' لیکن ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم اس حال میں بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال (کی جزا) میں سے کوئی کمی نہیں کرے گا۔ (اور یہ اس لیے ہے کہ) بے شک اللہ بہت بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

اس آیت میں اسلام اور ایمان کا فرق بیان کیا گیا ہے' جبکہ اگلی آیت میں مؤمن کی

تعریف بیان کی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''(اللہ کے نزدیک) مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے (یعنی ان کی تصدیق قلب' یقین قلب کی شکل اختیار کر لے) اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

تین درجات: اسلام' ایمان اور احسان

اسلام کی حقیقت اور اس کے مختلف مظاہر میں ایک درجہ بندی ہے' جس کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بڑی اہم ہے۔ جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آیا تو بہت سے صحابہ کرام ؓ پریشان ہو گئے کہ ہمیں اسی وقت شراب چھوڑ دینی چاہیے تھی جب شراب کی حرمت کا اشارہ آ گیا تھا —— شراب کے حوالے سے سب سے پہلا حکم یہ آیا تھا: ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ط قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ط﴾ (البقرۃ: ۲۱۹) ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ ان کا کیا حکم ہے؟) آپؐ کہہ دیجیے کہ ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں' البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے''۔ اس کے بعد دوسرا حکم یہ آ گیا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء: ۴۳) ''اے اہل ایمان! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو' یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جو کچھ تم کہہ رہے ہو'' —— اس کے بعد سورۃ المائدۃ میں شراب کی حرمت کا آخری حکم آیا جس کا انداز بڑا تیکھا سا تھا۔ فرمایا: ﴿فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ (المائدۃ) ''پس اب بھی تم باز آتے ہو یا نہیں؟'' اس پر صحابہ کرام رضوان

اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض کو بہت تشویش ہوئی کہ ہم اتنا عرصہ شراب پیتے رہے' حالانکہ شراب کی حرمت کے اشارات آنے کے فوراً بعد ہی ہمیں شراب چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ اس موقع پر یہ آیت اُتری جس میں فرمایا گیا: ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾ ''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے' کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جو وہ (پہلے) کھا پی چکے''۔ یعنی جو لوگ اسلام اور ایمان پر کاربند ہو کر عمل کرتے رہے تو شراب کی حرمت کے آخری حکم کے آنے سے پہلے وہ جو کچھ کھاتے پیتے رہے' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۹۳﴾﴾ ''جب تک وہ تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' پھر مزید تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں' پھر اور تقویٰ میں بڑھیں اور درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اس آیت میں تین درجے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ 'اسلام' ہے' یعنی اللہ اور رسولؐ کو مان کر ان کے احکام پر عمل شروع کر دینا۔ اس سے اوپر کا درجہ 'ایمان' ہے' یعنی دِل کا کامل یقین' جو ایمان کے دل میں اُتر جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایمان حاصل ہو جانے کے بعد اعمال کی کیفیت بدل جائے گی اور اس میں ایک نئی شان اور جذبہ پیدا ہوگا۔ اس سے بھی آگے جب ایمان ''عین الیقین'' کا درجہ حاصل کر لے تو یہ درجۂ 'احسان' ہے۔ اس کی تفصیل ہم حدیثِ جبریل میں پڑھ چکے ہیں — رسول اللہ ﷺ نے احسان کی کیفیت ان الفاظ میں بیان فرمائی: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))[1] ''یہ کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے' اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو پھر (یہ کیفیت تو پیدا ہونی چاہیے کہ) وہ تو تجھے دیکھتا ہے'' — پھر ہم نے دین کی حقیقت کے بارے میں حضرت

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبیﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان...... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

معاذ بن جبلؓ سے مروی ایک طویل حدیث میں بڑی تفصیل سے پڑھا تھا اور اسی کا تقریباً خلاصہ زیر مطالعہ حدیث میں آج ہم پڑھیں گے۔

وہ طویل حدیث میں نے حدیث جبریل کے ساتھ اسی لیے بیان کر دی تھی کہ یہ دونوں احادیث میرے نزدیک دین کی حقیقت اور اس کے اجزاء کے مابین نسبت و تناسب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے نہایت اہم اور جامع ہیں۔ حضرت معاذؓ سے مروی وہ طویل حدیث سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن الترمذی، مسند احمد اور مسند بزار میں ہے اور امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ امام نوویؒ نے اس حدیث کو چھوڑ کر زیر مطالعہ مختصر روایت کو اپنی اربعین میں کیوں بیان کیا ہے۔ حالانکہ دونوں روایات حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہیں، دونوں کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور ان دونوں کے بارے میں امام ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ احادیث حسن صحیح ہیں۔ مجھے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ امام نوویؒ چونکہ ایک مختصر کتاب مرتب کر رہے تھے لہٰذا انہوں نے اس میں طویل حدیث کے بجائے زیر مطالعہ مختصر حدیث کو شامل کیا ہے۔ واللہ اعلم!

زیر مطالعہ حدیث کا واقعاتی پس منظر

زیر مطالعہ حدیث کا واقعاتی پس منظر اُس طویل حدیث میں مذکور ہے۔ اس وقت میں پوری حدیث کا متن تو نہیں پڑھ سکتا، البتہ اس کا مفہوم میں آپ کو بتا دیتا ہوں —— اس حدیث کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ یہ حدیث مجھے اس اعتبار سے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے کہ اس میں دورِ نبویؐ کا ایک واقعہ ایسے بیان کیا گیا ہے جیسے ہم خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسے تصویر لفظی کہا جاتا ہے کہ لفظوں میں کسی چیز کا نقشہ کھینچ دینا، تصویر کھینچ دینا، اس طور سے کہ انسان اپنے آپ کو اس تصویر میں محسوس کرے —— روایت کا پس منظر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اپنے لشکر کو لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ رات بھر سفر کرتے تھے، اس لیے کہ شدید گرمی کا موسم تھا اور اس موسم میں رات ہی کو سفر ممکن تھا۔ دن کے اوقات میں تو گرمی میں سخت تمازت ہوتی

تھی اور صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ صحرا نیچے سے آگ اُگل رہا ہوتا تھا اور سورج اوپر سے آگ برسا رہا ہوتا تھا' لہٰذا دن کے اوقات میں سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ رات بھر سفر کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فجر کے وقت پڑاؤ کیا اور فجر کی نماز باجماعت پڑھائی۔ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد سب لوگ جلد از جلد اپنی سواریوں پر سوار ہو گئے تاکہ سورج کے تیز ہو جانے تک مزید کچھ سفر کر لیں' کیونکہ جب دھوپ تیز اور تمازت شدید ہو جائے گی تو مجبوراً رکنا پڑے گا۔

اب یہ ہوا کہ ساری رات کے جاگے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی سواریوں پر اونگھنے لگے —— فجر کا وقت خاص طور پر ایسا ہوتا ہے کہ نسیم سحری انسان کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ عام طور پر مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی مریض کسی درد میں مبتلا ہو اور وہ ساری رات جاگتا رہے تو صبح کے وقت اسے کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو جاتا ہے اور وہ تھوڑی دیر سو لیتا ہے۔ چنانچہ تمام صحابہ کرامؓ اپنی سواریوں پر بیٹھے ہوئے اونگھنے لگے۔ ان کی اونٹنیوں کو آزادی مل گئی اور وہ چلتے چلتے اِدھر اُدھر جہاں کوئی کیکر کا درخت دیکھتیں تو اس پر منہ مار لیتیں۔ اس سے یہ ہوا کہ سارا لشکر وادی کی پوری چوڑائی میں پھیل گیا۔ لیکن حضرت معاذؓ جاگتے رہے اور اپنی اونٹنی کو حضور ﷺ کی اونٹنی کے ساتھ ساتھ چلاتے رہے۔ اچانک حضرت معاذؓ کی اونٹنی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر بدک گئی' اس کی وجہ سے اس کے قریب حضور ﷺ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے اپنے ہودج کا پردہ اٹھایا تو دیکھا کہ سوائے معاذ کے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ تمام صحابہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے آواز دی: ((يَا مُعَاذُ)) انہوں نے عرض کیا: لَبَّيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ ''حضورؐ میں حاضر ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اُدْنُ دُوْنَكَ)) ''نزدیک آ جاؤ' اور نزدیک آ جاؤ''۔ تو وہ قریب ہو گئے' یہاں تک کہ دونوں کی اونٹنیاں ایک دوسرے سے مس کرنے لگیں۔ تب حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا كُنْتُ اَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا كَمَكَانِهِمْ مِنَ الْبُعْدِ)) ''میرا گمان نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اتنے فاصلے پر ہوں گے''۔ ظاہر بات ہے کہ دشمن' خاص طور پر منافقین جو بظاہر اپنے ہیں' ہر وقت حضور ﷺ کی تاک میں تھے —— تبوک سے

واپسی کے دوران یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ کچھ منافقین ایک تنگ گھاٹی‘ جس میں بیک وقت ایک ہی اونٹ گزر سکتا تھا‘ میں چھپ کر بیٹھ گئے کہ حضور ﷺ کا اونٹ جب یہاں سے گزرے گا تو ہم حملہ کر کے حضور ﷺ کو قتل کر دیں گے‘ معاذ اللہ! اس وقت اس واقعہ کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو کیسے بچایا —— چنانچہ حضور ﷺ کو تعجب ہوا کہ لوگ مجھ سے اتنے فاصلے پر ہیں۔ گویا انہیں خیال ہی نہیں ہے کہ وہ میری حفاظت کے لیے میرے آس پاس رہیں۔

اس وقت اگر ہم میں سے کوئی ہوتا تو وہ اپنے نمبر بنانے کے لیے دوسروں پر تنقید کرتا کہ حضور! یہ لوگ تو پرواہی نہیں کرتے‘ جبکہ مجھے دیکھئے کہ مجھے آپ کی کتنی پرواہے اور میں تو آپؐ کی سواری کے ساتھ‘ اپنی سواری کو جوڑے چلا آ رہا ہوں۔ لیکن حضرت معاذؓ نے لوگوں کی طرف سے معذرت پیش کی کہ لوگ رات بھر کی بے خوابی کی وجہ سے اونگھ رہے تھے تو ان کی سواریاں انہیں لے کر اِدھر اُدھر متفرق ہو گئیں۔ اس جواب پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((وَاَنَا کُنْتُ نَاعِسًا)) ”ہاں میں بھی اونگھ رہا تھا“۔ دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو کوئی مافوق الفطرت انسان کے طور پر پیش نہیں کیا‘ بلکہ آپؐ نے اپنی بات بھی بتا دی کہ ٹھیک ہے یہ بشری تقاضے ہیں‘ جو میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں اور مجھے بھی اونگھ آ گئی تھی۔ اس سے آگے سوال و جواب کا ایک سلسلہ ہے‘ جہاں سے آج کی زیر مطالعہ حدیث شروع ہو رہی ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات کافی عرصے سے تھی کہ جب بھی حضور اکرم ﷺ کی خلوت میسر آئے گی تو میں آپؐ سے ایک خاص سوال کروں گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس وقت حضور ﷺ کے ساتھ خلوت بھی میسر آ گئی ہے‘ اور حضور ﷺ خاص طور پر مجھ سے اس وقت خوش بھی ہیں کہ میرا یہ ساتھی جاگتا ہوا میرے ساتھ چلتا آ رہا ہے تو اس وقت انہوں نے سوال کیا۔

یہ سارا پس منظر میں نے اس طویل حدیث سے بیان کیا ہے جو اگرچہ اربعین نوویؒ میں شامل نہیں ہے‘ لیکن مجھے بہت پیاری ہے اور میں نے اس حدیث کو اس مجموعہ حدیث

کے آخر میں ''حکمتِ دین کا عظیم خزانہ'' کے عنوان سے درج کیا ہے۔ حدیثِ جبریل کے مطالعہ کے بعد اس حدیث کے مطالعہ میں ہم نے دو جمعے صرف کیے تھے۔

زیر مطالعہ حدیث کا مطالعہ

اب ہم آج کی حدیث کا مطالعہ شروع کرتے ہیں — حضرت معاذ کہتے ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خلوت نصیب ہوگئی تو میں نے کہا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ عَنِ النَّارِ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم کی آگ سے دور کر دے''۔ قَالَ: ((لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِیْمٍ)) آپؐ نے فرمایا: ''تم نے بہت بڑی بات پوچھی ہے''۔ یہ گویا تحسین اور شاباش کا کلمہ ہے کہ تم نے وہی بات پوچھی ہے جو حقیقتاً پوچھنے کے قابل تھی۔ طویل حدیث میں بَخٍ بَخٍ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عربوں کا ایک مخصوص کلمہ ہے جو وہ کسی کی تحسین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اردو میں ہم 'بہت خوب' بولتے ہیں تو گویا بہت کی 'ب' اور خوب کی 'خ' جمع ہو کر بَخ بن گیا۔ مزید یہ کہ طویل حدیث میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے تین دفعہ فرمایا کہ تم نے بڑی عظیم بات پوچھی ہے' بڑا عظیم سوال کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ یَّسَّرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ)) ''(ویسے تو یہ بہت بڑی بات ہے) لیکن جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسان کر دے تو اس کے لیے بلاشبہ بہت آسان ہے۔''

اللہ کی عبادت کرنا اور شرک سے بچنا

حضرت معاذ کے سوال — مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم سے دور کر دے — کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے پہلا عمل یہ بتایا: ((تَعْبُدُ اللّٰہَ لَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا)) ''اللہ کی بندگی اور پرستش کرو (اور) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''۔ یہاں لفظ 'عبادت' اور 'شرک' آئے ہیں اور یہ دونوں ہی بہت جامع الفاظ ہیں۔ عام طور پر عبادت سے صرف نماز روزہ مراد لیا جاتا ہے' حالانکہ عبادت

کا مفہوم انہی تک محدود نہیں ہے‘ بلکہ عبادتِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ انتہائی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت‘ ہمہ جہت اور کامل اطاعت و فرماں برداری کرنا۔ (اس پر تفصیل سے گفتگو ہم کر چکے ہیں!) ہاں کبھی خطا ہو جائے تو توبہ کی جائے‘ اللہ سے استغفار کیا جائے‘ لیکن ایسا نہ ہو کہ مستقل طور پر کسی ایک گناہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں تو ایسا ہو رہا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ حج و عمرے بھی ہو رہے ہیں‘ نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہیں‘ نعتوں کی محافل کا بھی بڑے ذوق وشوق سے اہتمام ہو رہا ہے‘ لیکن ان سب کے ساتھ سودی کاروبار بھی جاری ہے اور سود کو چھوڑنے پر دل آمادہ ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سودی کاروبار قیامت کے دن ہر شے کی نفی کر دے گا۔

اسی طرح شرک بھی بہت جامع لفظ ہے اور اس سے مراد شرک فی الذات بھی ہے‘ شرک فی الصفات بھی اور شرک فی الحقوق بھی—— ہم تو سمجھتے ہیں کہ شرک صرف یہی ہے کہ بتوں کو سجدہ کیا جائے‘ یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے‘ جبکہ بعض زیادہ حساس قسم کے لوگ اللہ کی صفات میں کسی کو شریک کر دینے کو بھی شرک سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ کے حقوق میں کسی کو شریک کر دینا‘ جس کو ”شرکِ عملی“ کہا جاتا ہے‘ اس سے عام طور پر لوگ ناواقف ہیں۔ اس کے لیے میں آپ سب کو مشورہ دوں گا کہ شرک کے موضوع پر میری چھ تقاریر سنئے ☆۔ میری ان تقاریر کو علماء کے حلقوں میں بھی بہت پذیرائی ملی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ سے پہلی بات یہ فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے اس کی بندگی اور پرستش کرو۔ اس جملہ میں عبادت کے اثبات

☆ آج سے لگ بھگ تیس سال قبل بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم ومغفور نے شرک کے موضوع پر ایک ایک گھنٹے کی چھ تقریریں کی تھیں‘ جن کو بعد میں ”حقیقت واقسامِ شرک“ کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ شرک کی حقیقت اور شرک کی اقسام کے حوالے سے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ (مرتب)

کے ساتھ ہی شرک کی نفی بھی آ گئی' جیسے کلمہ طیبہ میں ہے: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه ''نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے۔''

ارکانِ اسلام اور ابوابِ خیر

اس نصیحت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو 'ارکانِ اسلام' پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی اور فرمایا: ((وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ ' وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ ' وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ ' وَتَحُجُّ الْبَيْتَ)) ''اور تم نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان المبارک کے روزے رکھو اور اللہ تعالیٰ کے گھر کا حج کرو'' ــــ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی متفق علیہ حدیث میں ان کو 'ارکانِ اسلام' قرار دیا گیا ہے۔

((بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ' وَاِقَامِ الصَّلَاةِ' وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ' وَحَجِّ الْبَيْتِ' وَصَوْمِ رَمَضَانَ))(۱)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

ان ارکانِ اسلام کی بنیاد پر ہمارے معاشرے کا ایک خاص رنگ بنتا ہے اور انہی کے بل بوتے پر ہماری ایک خاص تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اصل میں اسلامی زندگی کا ایک خاص تمدن ہے جس کی تشکیل نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج سے ہوتی ہے۔

یہاں تک تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ کے جواب میں یہ دو باتیں فرمائیں' اس کے بعد اب حضور ﷺ نے خود حضرت معاذ سے پوچھا: ((اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَبْوَابِ الْخَيْرِ؟)) ''کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ خیر کے دروازے کون کون سے ہیں؟'' یعنی کیا میں تمہیں وہ اعمال نہ بتاؤں جن سے تمہیں خیر ہی خیر حاصل ہو! پہلی بات آپؐ نے یہ فرمائی: ((اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ)) ''روزہ ڈھال ہے''۔ یعنی روزہ نفس کے حملوں کے خلاف ایک ڈھال ہے۔ (ایک حدیث کے ضمن میں ہم اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔) دوسری بات آپؐ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام۔

نے یہ فرمائی:((وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ)) ''اور صدقہ گناہوں کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے''۔ یعنی اگر کوئی خطا ہوگئی' کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اللہ کی راہ میں صدقہ دو تو یہ صدقہ اس گناہ کے اثرات کو اس طرح دھو دے گا جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ صدقہ کے حقیقی مفہوم اور اس کی وسعت کے بارے میں تفصیلی گفتگو حدیث ۲۵ اور ۲۶ کے ضمن میں ہو چکی ہے۔

تہجد: رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ

تیسری بات آپ ﷺ یہ فرمائی:((وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ)) ''بندے کا رات کے درمیانی حصے میں نماز پڑھنا (بہت فضیلت کا باعث ہے)''۔ رات کے درمیان میں پڑھی جانے والی نماز کو عرفِ عام میں ''تہجد'' کہا جاتا ہے۔ عام طور پر بعض لوگ اذانِ فجر سے کچھ دیر پہلے جاگ کر جلدی سے آٹھ نفل پڑھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے تہجد پڑھ لی۔ درحقیقت یہ تہجد نہیں' عام نوافل ہیں جنہیں فجر کا ضمیمہ بنالیا گیا ہے۔ بہرحال یہ بھی فضیلت و برکت والا عمل ہے اور اس پر بھی اللہ تعالیٰ اجر و ثواب سے نوازے گا۔ لیکن اصل میں تہجد اسے کہا جاتا ہے کہ رات کو سوکر' نیند کو توڑ کر اٹھنا' نوافل ادا کرنا' پھر سو جانا اور پھر فجر کے لیے دوبارہ اٹھنا۔ یعنی جب نصف رات گزر جائے تو اس وقت انسان بیدار ہو کر ثلث رات تک نوافل پڑھے اور پھر سو جائے اور پھر طلوعِ صادق کے وقت فجر کے لیے اٹھے۔ حضور اکرم ﷺ کے الفاظ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں' اس لیے کہ جَوْف کہتے ہیں پیٹ کو اور جَوْفِ اللَّيْل کا معنی ہے رات کا درمیانی حصہ!

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے اس قول ——((وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ)) —— کے لیے سورۃ السجدۃ کی آیات ۱۶ تا ۱۷ تلاوت فرمائیں' جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴿١٦﴾﴾

''(راتوں کو) ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کو

پکارتے رہتے ہیں خوف اور امید کی کیفیت میں' اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے
اس میں سے (ہماری رضا جوئی کے لیے) خرچ کرتے ہیں۔"

انہیں اللہ کے مواخذے' اس کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا خوف ہوتا ہے' جبکہ انہیں اللہ کی طرف سے اجر وثواب کی طمع ہوتی ہے۔ سب سے بڑی طمع انہیں یہ ہوتی ہے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے' اس لیے کہ سب سے اونچا مقام یہی ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط﴾ (البینۃ:۸) "اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے"۔ یہ اللہ اور بندے کی باہمی رضا ہے۔ بندہ اپنے رب سے راضی رہے بایں طور کہ دنیا میں جو بھی مصائب اور تکالیف آئیں ان پر کوئی شکوہ زبان پر نہ لائے۔ بس یہی سوچے کہ یہ میرے رب کی طرف سے ہے جو میرا آقا' میرا دوست اور میرا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس چیز کے پیچھے کیا خیر ہے اور کیا شر' اور کون سی چیز میرے لیے بہتر ہے اور کون سی بری۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾

"اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔"

اگر ہم اس کیفیت کے اندر دنیوی زندگی گزاریں تو اللہ ہم سے راضی ہو جائے گا اور پھر آخرت میں ہمیں بھی راضی کر دے گا۔ یہ باہمی رضا کا معاملہ ہے اور یہ درحقیقت تہجد سے حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کے لیے کیا کچھ تیار کر رہا ہے' اس کا اندازہ لگانا انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی انسانی سوچ وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ اس ضمن میں فرمایا:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾﴾

"تو کوئی انسان نہیں جانتا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے' اُن کے اعمال کے بدلے کے طور پر۔"

قرآن مجید میں جنت کی جتنی بھی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کا تعلق اہلِ جنت کی ابتدائی مہمانی سے ہے' اور اس کے لیے الفاظ بھی وہ استعمال کیے گئے ہیں جو ہماری ذہنی سطح کے قریب ہیں' مثلاً وہاں پر پھل ہوں گے' شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی' ایسی خالص شراب ہوگی جس میں نہ کوئی نشہ ہوگا اور نہ ہی کوئی بہکنے کی بات ہوگی' جوان اور ہم عمر حوریں ہوں گی' وغیرہ۔ یہ ساری نعمتیں تو ابتدائی جنت کی ہیں' لیکن اللہ کے خاص بندوں کو رفتہ رفتہ جنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات میں لے جایا جائے گا اور وہاں کی نعمتوں کا نہ تو کسی کو علم ہے اور نہ ہی ان کا تصور انسانی فہم و ادراک میں آ سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان نعمتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ :اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالاَ عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔''

دین کی بنیاد اور اس کا ستون

اس کے بعد یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ کا دریائے سخاوت مزید جوش میں آیا اور آپ ﷺ نے حضرت معاذ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: ((اَلَا اُخْبِرُکَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِہٖ وَذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ؟)) ''(اے معاذ!) کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ دین کی جڑ (بنیاد) کیا ہے اور اس کا عمود (ستون) کیا ہے اور اس کا بلند ترین عمل کون سا ہے؟'' — عام طور پر اکثر لوگوں کو دین کے مختلف اعمال کے بارے میں تو معلوم ہوتا ہے' لیکن دین کے مختلف اعمال کے مابین باہمی نسبت کیا ہے' کیا چیز مقدم ہے اور کیا ثانوی حیثیت رکھتی ہے' کس چیز کا کس کے ساتھ منطقی ربط ہے' یہ درحقیقت حکمتِ دین کا

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ ۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم اور صحاح ستہ کی دیگر کتب کے متعدد ابواب میں بیان ہوئی ہے۔

خاص موضوع ہے اور اس کے بارے میں سب کو علم نہیں ہے ـــ زیر مطالعہ روایت میں رسول اللہ ﷺ نے پورے دین کو ایک درخت سے تشبیہہ دی ہے۔ ایک ہے اس کی جڑ اور بنیاد' ایک ہے اس کا تنا اور پھر درخت کی سب سے قیمتی چیز اس کی چوٹی ہے جہاں پھل لگتا ہے۔ جیسے آم کے درخت کی جڑیں بھی ہیں اور اس کا تنا بھی ہے' پھر اس تنے کے اوپر شاخیں پھیلتی ہیں جن میں پتے اور اصل شے آم لگتے ہیں۔ اسی طرح گلاب کے پودے کی جڑ میں پھول نہیں لگتے اور نہ ہی اس کے تنے میں لگتے ہیں' بلکہ پھول تو اس کے اوپر چوٹی پر لگتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کی جڑ' اس کے عمود اور اس کی چوٹی کے بارے میں بتاؤں؟ حضرت معاذ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں' ضرور فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ)) ''دین کی جڑ اور بنیاد اسلام ہے''۔ ایک تو ہے اسلام اپنے ارکان کے حوالے سے' لیکن یہاں اسلام سے مراد ارکانِ اسلام نہیں ہیں' بلکہ یہاں اسلام اس معنی میں آیا ہے کہ پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت! اسلام کے لغوی معنی ہیں: سرنڈر کر دینا' ہتھیار پھینک دینا۔ اس لفظ کے اندر اصل میں نقشہ یہ ہے کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں تو ان میں سے ایک نے اپنے ہتھیار پھینک دیے۔ گویا اُس نے سرنڈر کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنڈر کرنے کا نام اسلام ہے اور یہ درحقیقت دین کی جڑ اور بنیاد ہے۔

دین کے ستون کے حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ)) ''اس کا تنا نماز ہے''۔ نماز کے بارے میں یہ بھی آیا ہے: ((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ)) ''نماز دین کا ستون ہے''۔ عِمَاد اور عَمُود کا مادہ ایک ہی (عمد) ہے۔ اگر دین کو عمارت سے تشبیہہ دیں تو اس کے معنی ستون کے ہوں گے اور اگر درخت سے تشبیہہ دیں تو اس کے معنی تنا کے ہوں گے۔

دین کا افضل ترین عمل: جہاد فی سبیل اللہ

رسول اللہ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کو دین کی چوٹی اور افضل ترین عمل قرار دیتے

ہوئے فرمایا: ((وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ)) ''اور اس کی چوٹی اور افضل ترین عمل جہاد ہے''۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے ذہنوں سے بالکل اوجھل ہوگئی ہے۔ ہمارا سارا ذہن اور ہماری ساری جدوجہد ''ارکانِ اسلام'' کے اوپر ہے۔ بہت دیندار قسم کے لوگ بھی ارکانِ اسلام پر تو عمل پیرا ہو جائیں گے' لیکن اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ اسی لیے ابتدا میں' میں نے سورۃ الحجرات کی آیت آپ کو سنائی تھی جس میں فرمایا گیا کہ صرف وہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں جن میں یہ تین شرائط پائی جاتی ہوں: (۱) اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لانا' (۲) پھر شک میں نہ پڑنا' یعنی تصدیق قلب کا یقین قلب کی شکل اختیار کر لینا' اور (۳) اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ اگر یہ جہاد نہیں ہے' تو آپ سمجھ لیجیے کہ دین کے درخت کو پھل نہیں لگا۔ اس لیے کہ اس درخت کا پھل تو جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس صورتِ حال میں ہمارے ایمان کی کیفیت صرف ایک زبانی عقیدہ کی ہے جو ہم نے اپنے والدین سے سن رکھا ہے۔

جب اسلام کو اللہ نے فتح دی تو اس وقت لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اور اس وقت یہ داخل ہونا درحقیقت اس بنیاد پر تھا کہ اب ہم مقابلہ نہیں کر سکتے لہٰذا ہم سرنڈر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا کہ تمہارا ایمان لانے کا دعویٰ مبنی بر حقیقت نہیں ہے' اس لیے کہ ابھی تمہارا ایمان یقین کی کیفیت میں نہیں پہنچا۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے سرنڈر کر دیا ہے' سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور اب ہماری مزاحمت اور مخالفت ختم ہوگئی ہے۔ یہ بھی اس وقت ہے کہ اگر تم نے یہ سرِ تسلیم خلوصِ دل کے ساتھ خم کیا ہے اور اس میں کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اور اگر معاملہ یہ ہے کہ تم نے ابھی اس نیت سے سر جھکا دیے ہیں کہ حالات بدلیں گے تو پھر کھڑے ہو جائیں گے تو یہ سراسر منافقت ہے۔ لیکن اگر اس قسم کی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے اور آپ ایمان لائے ہیں' آپ نے گواہی دی ہے: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ تو اب آپ مسلمان مان لیے گئے ہیں اور اب آپ کی جان اور مال محفوظ ہیں۔ لیکن اگر جہاد نہیں ہے تو پھر آپ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹے ہیں۔ جہاد کے بارے میں

تو رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِغَزْوٍ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ نِفَاقٍ))(۱)

''جو کوئی اس حالت میں مرے کہ نہ تو اس نے کبھی جہاد کیا ہو اور نہ ہی کبھی اس نے جہاد کی نیت کی ہو تو وہ شخص نفاق کے ایک حصہ پر مرا۔''

دین کی چوٹی: جہاد اور جہاد کی چوٹی: قتال

جہاد کے معنی لوگوں نے صرف جنگ کے سمجھے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے' اس لیے کہ جنگ کے لیے تو قرآن کی اصطلاح قتال فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ الصف میں یہ دونوں الفاظ آئے ہیں۔ آیت ۱۰'۱۱ میں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے رستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جہاد کے بغیر جہنم سے چھٹکارا پانے کا خیال ایک امیدِ موہوم اور بے بنیاد تمنا ہے۔ ان آیات میں تو جہاد کا تذکرہ ہے' جبکہ آیت ۴ میں قتال کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾

''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔''

لہٰذا ثابت ہوا کہ قتال فی سبیل اللہ الگ شے ہے اور جہاد فی سبیل اللہ الگ۔ حضور اکرم ﷺ کے بارہ سالہ مکی دور میں قرآن کے ذریعے سے جہاد فی سبیل اللہ ہو رہا

(۱) سنن النسائی' کتاب الجہاد' باب التشدید فی ترک الجہاد۔

تھا‘ دعوت وتبلیغ‘ تربیت وتزکیہ اور تنظیم جیسے ذرائع سے جہاد ہو رہا تھا‘ جبکہ مدینہ میں پہنچ کر یہ جہاد قتال کی شکل اختیار کر گیا۔

اس اعتبار سے نوٹ کر لیجیے کہ جہاد صرف جنگ کا نام نہیں ہے۔ اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ دوسرا بڑا جہاد ہے اللہ کے دین کی دعوت وتبلیغ اور اس مقصد کے لیے جان و مال کھپانا اور وقت لگانا۔ تیسرا بڑا جہاد ہے: اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کرنا۔ آپ سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر اللہ کے دین کو نافذ کریں اور پھر اللہ کا دین لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ بھی آپ کی پکار پر خلوصِ دل کے ساتھ لبیک کہیں‘ انہیں منظم کریں اور ان کو سمع وطاعت کا خوگر بنائیں اور جب معتد بہ تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں تو پھر جہاد کا بلند ترین درجہ آئے گا‘ اور وہ ہے اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کے لیے قتال کرنا۔

صاف ظاہر ہے کہ جب تک مناسب تعداد میں لوگ موجود نہ ہوں اور ان کی پوری طرح ٹریننگ بھی نہ ہوئی ہو تو اُس وقت تک جنگ نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ جہاد تو کر رہے ہوں‘ لیکن انہیں مخلص لوگوں کی اتنی تعداد میسر ہی نہ ہو کہ وہ قتال کر سکیں تو صرف جہاد ہی ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے گا۔ البتہ اگر اللہ کی توفیق سے اس معاشرے سے response مل جائے اور معتد بہ تعداد میں لوگ منظم بھی ہو جائیں اور انہوں نے اپنے اوپر اللہ کے دین کو نافذ بھی کر لیا ہو ـــــ یہ نہیں کہ اپنے اوپر‘ اپنے گھر میں تو دین ہے نہیں اور باہر دین نافذ کرتے پھریں ـــــ پھر انہوں نے کسی ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع وطاعت اور بیعت جہاد بھی کر لی ہو اور ان کے دلوں سے سوائے اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے ہر امنگ نکل گئی ہو تو اس وقت نظامِ باطل کے ساتھ جا ٹکرانے اور قتال کا مرحلہ آئے گا۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ نیت بالکل خالص ہونی چاہیے ـــــ اس مجموعہ کی پہلی حدیث میں ہم نے پڑھا تھا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی ‘ فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ

اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ' وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ)) (متفقٌ علیه)

''بے شک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔ پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہوئی' تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کے حساب میں شمار ہوگی۔ اور جس کی ہجرت ہوئی دنیا کے حصول کے لیے تاکہ دنیا حاصل کرے یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے شمار ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

اگر یہ قتال مالِ غنیمت یا حکومت حاصل کرنے کے لیے ہے یا کسی قبیلے سے کوئی دشمنی چلی آ رہی ہے اور اب اس سے بدلہ لینے کی نیت سے جہاد میں شریک ہو رہے ہیں تو یہ قتال فی سبیل اللہ نہیں' قتال فی سبیل النفس ہے۔

زبان کا کنٹرول: جنت کے حصول کی ضمانت

حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَا اُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ؟)) ''اے معاذ! میں تمہیں ان تمام معاملات کی روح کے بارے میں بتاؤں؟'' یعنی کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو ان تمام اجزاء کو جوڑنے والی ہے اور ان کو صحیح رخ پر اور صحیح روح کے ساتھ آگے بڑھانے والی ہے! —— مَلَاك کہتے ہیں روح اور مغز کو۔ عرب کہتے ہیں: اَلْقَلْبُ مَلَاكُ الْجَسَدِ ''دل پورے جسم کے لیے ملاک ہے'' یعنی دل پورے جسم کا روحِ رواں ہے۔ دل ہے تو زندگی ہے اور اگر دل بند ہو جائے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس تمام معاملے کی روح کے بارے میں نہ بتاؤں؟ حضرت معاذ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ضرور فرمائیے۔ فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ ''پس حضور ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا'' اور فرمایا: ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) ''اس کو روک کر رکھو''۔ یعنی زبان سے کوئی غلط اور ظالمانہ کلمہ نہ نکلے' کوئی غیبت اور کوئی تہمت برآمد نہ ہو' خواہ مخواہ کسی کی عزت کے اوپر حملہ نہ ہو۔ زبان

کو اپنے قابو میں رکھو اور جب بھی زبان کھولو تو حق اور سچ کی بات کرو۔ یہ بات قرآن مجید میں بھی آئی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا﴾ (الاحزاب) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بات کیا کرو سیدھی سچی''۔ اگر یہ دو کام ہو جائیں یعنی دل میں تقویٰ ہو اور زبان پر مکمل کنٹرول ہو تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ: ﴿یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ ''اللہ تمہارے سارے اعمال درست کر دے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا''۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((مَنْ یَتَکَفَّلْ لِی مَا بَیْنَ لَحْیَیْهِ وَمَا بَیْنَ رِجْلَیْهِ أَتَکَفَّلْ لَهُ بِالْجَنَّةِ))(۱)

''جو شخص مجھے اپنی زبان اور شرمگاہ کی ضمانت دے دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔

زیر مطالعہ حدیث میں بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اس پر حضرت معاذؓ کی سادگی دیکھئے —— حضرت معاذ وہ ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ))(۲) کہ میرے صحابہ میں حلال وحرام کا سب سے زیادہ جاننے والا معاذ بن جبل ہے! یعنی ہم یوں کہیں گے کہ فقہ کے سب سے بڑے ماہر معاذ بن جبل ہیں —— وہ اس بات پر حیران ہو کر کہتے ہیں: یَا نَبِیَّ اللّٰهِ! وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَکَلَّمُ بِهٖ؟ ''اے اللہ کے نبی ﷺ! کیا ہمارا اس پر بھی مواخذہ ہوگا جو ہم کلام کرتے رہتے ہیں''۔ ظاہر بات ہے آدمی جب دوستوں کے اندر بیٹھا گپ شپ کرتا ہے تو اُس وقت زبان پر کنٹرول نہیں رہتا۔ اس وقت تو جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ اب اس میں غیبتیں بھی ہو رہی ہیں' غلط باتیں بھی ہو رہی ہیں' جھوٹ بھی بولا جا رہا ہے...... تو حضرت معاذؓ نے پوچھا: اے اللہ کے نبی ﷺ! یہ جو ہم باتیں کرتے رہتے ہیں کیا اس پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں حضور ﷺ کی محبت اور شفقت ملاحظہ ہو۔ آپ ﷺ نے

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزهد' باب ما جاء فی حفظ اللسان۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب معاذ بن جبل۔ وسنن ابن ماجه' المقدمة' باب فضائل خباب۔

فرمایا: ((ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ!)) ''اے معاذ! تمہیں تمہاری ماں گم کرے''۔ یعنی تمہاری گمشدگی پر یا تمہاری غیر حاضری پر تمہاری ماں روئے ——عربوں کے ہاں یہ جملہ لاڈ پیار سے بھی بولا جاتا تھا—— ((وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ، اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ)) ''لوگوں کو ان کے چہروں کے بل جہنم میں جھونکنے والی سب سے بڑی شے زبان کی کٹائی (کمائی) ہی تو ہوگی''۔ حَصِيْد کہتے ہیں اس فصل کو جو مکمل طور پر کٹ گئی ہو، جیسے گندم کا پودا پورے کا پورا کاٹا جاتا ہے۔ گویا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ کا مفہوم یہ ہے کہ زبان سے جو بھی لفظ نکلتا ہے وہ آخرت کے اندر ایک بیج بن کر وہاں پروان چڑھتا ہے۔ لہٰذا جو فصلیں زبانوں سے بوئی جارہی ہیں، کل قیامت کے دن جب یہ کٹیں گی تو یہی سب سے بڑھ کر انسانوں کو جہنم میں جھونکنے کا باعث بنیں گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث میں بیان کردہ حکمت اور بھلائی کی باتوں پر صحیح جذبے اور خلوصِ نیت کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
30

شرعی احکام کی اقسام

(فرائض دینی کا جامع تصور)

۳۰ مئی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ (النساء:١٣٦)

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ○ (البقرہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ○ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ (الحج:٧٨)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۧ○ (آل عمران)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ○ (الحجرات)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ○ (الصف)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ○ (الصف)

عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ جُرْثُوْمِ بْنِ نَاشِرٍ ؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :

((اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْهَا ' وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا ' وَحَرَّمَ اَشْیَاءَ فَلَا تَنْتَهِکُوْهَا ' وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ رَحْمَةً لَّکُمْ غَیْرَ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا)) (۱)

سیدنا ابوثعلبہ خشنی جرثوم بن ناشر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کر دیے ہیں انہیں ضائع مت کرو' اور اس نے کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو' اور اس نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کی حرمت پامال نہ کرو' اور اس نے تم پر شفقت فرماتے ہوئے بعض چیزوں کے متعلق عمداً سکوت فرمایا ہے لہٰذا ان کے متعلق تم کھود کرید مت کرو۔''

معزز سامعین کرام!

اربعین نووی کی حدیث نمبر ۳۰ آج ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ اس حدیث مبارکہ کے چار ٹکڑے ہیں اور یہ چاروں اہم ہیں' لیکن ان میں سب سے پہلا زیادہ اہم ہے' یعنی ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پہلا حصہ باقی تین کے مقابلے میں اہم ترین ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ان ٹکڑوں/جملوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

پہلا جملہ: ((اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْهَا)) ''اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کر دیے ہیں' انہیں ضائع مت کرو!''

دوسرا جملہ: ((وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا)) ''اور اس نے کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو!''

تیسرا جملہ: ((وَحَرَّمَ اَشْیَاءَ فَلَا تَنْتَهِکُوْهَا)) ''اور اس نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے' ان کی حرمت پامال نہ کرو!''

چوتھا جملہ: ((وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ رَحْمَةً لَّکُمْ غَیْرَ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا)) ''اور اُس نے تم پر شفقت فرماتے ہوئے بعض چیزوں کے متعلق عمداً سکوت فرمایا ہے' لہٰذا ان کے متعلق تم کھود کرید مت کرو!''

(۱) رواہ الدارقطنی وغیرہ۔ حدیث حسن!

آخری تین جملوں کے مضامین کا جائزہ

اس ضمن میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ بعد والے تین جملوں کے مضامین کی احادیث اس سے پہلے بھی ہم پڑھ چکے ہیں' چنانچہ اربعین کی حدیث ۹ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔سیدنا ابو ہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُ، وَمَا اَمَرْتُكُمْ بِهٖ فَافْعَلُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَاِنَّمَا اَهْلَكَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰى اَنْبِيَائِهِمْ))(۱)

''میں تمہیں جس کام سے منع کروں اس سے باز رہو' اور جس کام کا حکم دوں اسے بقدر استطاعت بجا لاؤ۔ کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرتِ سوالات اور انبیاء سے اختلاف ہی نے ہلاک کر ڈالا تھا۔''

اس حدیث میں وہی بات آ رہی ہے جو زیر مطالعہ حدیث کے چوتھے جملے میں بیان ہوئی ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا ہے' تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ ان چیزوں میں سکوت اختیار کرو اور ان کی کھود کرید میں نہ پڑو۔

اسی طرح اربعین کی حدیث ۶ میں زیر مطالعہ حدیث کے درمیانی دونوں جملوں کے مضمون کا تذکرہ ہے۔ابوعبداللہ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ، وَاِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ، اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ، اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ، وَاِذَا فَسَدَتْ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ۔ وصحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب توقیرہ وترک اکثار سؤالہ...... واللفظ لہ۔

فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ، اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)) (۱)

''حلال چیزوں کا حکم بالکل واضح ہے اور حرام چیزوں کا حکم بھی واضح ہے' ان دونوں (حلال وحرام) کے درمیان کچھ امور متشابہ ہیں جن کی حلت وحرمت کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص اس قسم کی غیر واضح اشیاء سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا' اور جو شخص اس قسم کے امور کو اختیار کرنے لگے وہ حرام میں جا پڑے گا' جیسا کہ کوئی چرواہا مخصوص چراگاہ کے آس پاس جانوروں کو چرائے تو ہو سکتا ہے کہ جانور چراگاہ میں جا پہنچیں۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی چراگاہ سے مراد اس کی حرام کردہ اشیاء ہیں۔ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار! وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔''

حدود اللہ کے قریب جانے کی ممانعت

الغرض زیر مطالعہ حدیث کے آخری تین جملوں سے ملتی جلتی احادیث اس سے پہلے بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔ اس بارے میں صرف ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ یہاں فرمایا:((وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا)) ''کہ اللہ نے کچھ حدود مقرر کی ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو''۔ جبکہ قرآن مجید میں ان حدود اللہ کے بارے میں فَلَا تَعْتَدُوْهَا کے بجائے فَلَا تَقْرَبُوْهَا آیا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ﴾ (البقرة:۱۸۷) ''یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود ہیں' پس ان کے قریب بھی مت جاؤ''۔ ایک تو یہ ہے کہ آپ نے ان حدود کو کراس کر لیا اور ان سے تجاوز کر گئے۔ یہ تو گویا معاملہ بہت ہی آگے بڑھ گیا' جبکہ ایک یہ ہے کہ آپ نسیان یا معصیت میں اس کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی اندیشہ ہے کہ کہیں آپ باقاعدہ حرام کے اندر ملوث نہ ہو جائیں تو اس لیے فرمایا کہ ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ﴾ ان کے قریب بھی نہ پھٹکو۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینه ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاة' باب اخذ الحلال وترك الشبهات۔

آپ کے علم میں ہے کہ یہی لفظ قرآن میں زنا کے بارے میں بھی آیا ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾﴾ (بنی اسراء یل) ''اور زنا کے قریب بھی مت جاؤ' اس لیے کہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے' اور بہت برا راستہ ہے''۔ احادیث میں آتا ہے کہ آنکھوں کا بھی زنا ہے' کانوں کا بھی زنا ہے' ہاتھ اور پاؤں کا بھی زنا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَزِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ، وَزِنَا اللِّسَانِ النُّطْقُ، وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِي، وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ أَوْ يُكَذِّبُهُ)) (۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا سے اُس کا حصہ لکھ دیا جسے وہ ضرور حاصل کرے گا۔ آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے' اور زبان کا زنا بات چیت ہے' اور دل تمنا اور خواہش کرتا ہے' اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔''

آنکھوں کا زنا یہ ہے کہ نامحرم خاتون کو بار بار دیکھنا۔ ایک دفعہ نگاہ پڑ گئی تو وہ معاف ہے' اس لیے کہ وہ غیر اختیاری ہے' لیکن اگر آپ نے دوبارہ مڑ کر دیکھا ہے تو یہ آپ کا اختیاری فعل ہے اور اس پر پکڑ ہوگی۔ کانوں کا زنا یہ ہے کہ نامحرم عورتوں کی آواز سننا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس صنفِ نازک میں مردوں کے لیے ایک خاص حکمت کے تحت کشش (attraction) رکھی ہے۔ اگر یہ کشش نہ ہوتی تو تمدن اور تہذیب کا یہ سارا معاملہ کیسے چلتا۔ کون شادی کر کے اتنا بڑا کھکیڑ مول لیتا۔ کہاں ایک پیٹ پالنا اور کہاں آٹھ دس پیٹوں کے لیے انتظام کرنا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مرد کے لیے عورت کے اندر اتنی کشش رکھ دی ہے کہ اس کی آواز کے اندر بھی ایک سُریلا پن ہوتا ہے جس میں جاذبیت ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ غیر محرم لوگوں سے بات کر رہی ہوں تو گفتگو میں نرمی پیدا نہ کریں — مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھیجا کہ میری فلاں زوجہ کے گھر سے

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب قدر علیٰ ابن آدم حظه من الزنا وغیرہ۔

فلاں چیز لے آئیں تو ان سے پردے کے پیچھے سے بات کرنے کے حوالے سے حکم دیا گیا کہ اے نبی کی بیویو!﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ (آیت ۳۲) ''گفتگو میں اپنی آواز میں لوچ مت پیدا کرو''۔ الغرض نسوانی آواز کا سننا گویا کانوں کا زنا ہے۔ ہاتھ کا زنا لمس اور چھونا ہے اور اس کے بعد ظاہر بات ہے کہ شرمگاہیں پھر اس عمل کی تکمیل کرتی ہیں جسے عرفِ عام میں ہم ''زنا'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

دین کے جملہ فرائض اور اوامر ونواہی پر ایک نظر

بہرحال زیر مطالعہ حدیث میں بیان کردہ آخری تین چیزیں ماقبل احادیث میں بھی آئی ہیں' لہٰذا میں ان کے بجائے زیر مطالعہ حدیث کے پہلے جملے پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ فرائض کون سے ہیں جو اللہ نے ہمارے اوپر لازم اور واجب کر دیے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی فہرست بنائی جائے تو وہ بہت طویل ہو جائے گی' بایں طور کہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر کا صیغہ آیا ہے' وہ گویا اللہ کی طرف سے اس شے کی فرضیت کا اعلان ہے۔ اس ضمن میں چند آیات ابتدا میں' میں نے آپ کو سنائی ہیں۔ ان آیات کی تفصیل میں جائے بغیر ان کا متن اور ترجمہ میں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ فرائض کی لسٹ کتنی لمبی ہے۔

ایمان کے حوالے سے حکم ہوا:﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (النساء:١٣٦) ''اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر (جیسا کہ اس کا حق ہے)''۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ ارکانِ اسلام میں سے دو یعنی نماز اور زکوٰۃ کا تو بار بار قرآن مجید میں ذکر آتا ہے' مثلاً سورۃ البقرۃ میں فرمایا:﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ''۔ پھر نمازِ جمعہ کا خصوصی ذکر بھی کیا گیا ہے:﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ (الجمعة:٩) ''اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے

لیے جمعہ کے دن تو لپکو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو''۔ روزے کے بارے میں فرمایا:﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ﴾ (البقرة:۱۵۸) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ' پس جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے روزے رکھے''۔ آگے مریض اور مسافر کے لیے رعایت بیان کر دی گئی کہ وہ بعد ازاں روزے رکھ کر گنتی پوری کر لیں۔ حج کے بارے میں فرمایا:﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾﴾ (البقرة) ''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ وہ حج کریں اُس کے گھر کا' جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی' اور جس نے کفر کیا تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے''۔ یعنی اگر کوئی سفر کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا تو گویا وہ کفر کا مرتکب ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے شخص کی کوئی پروا نہیں ہے۔

اسی طرح اسلام کے بارے میں فرمایا:﴿فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (الحج) ''پس اُسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو' اور (اے نبی ﷺ) بشارت دے دیجیے ان کو جو اپنے آپ کو جھکا دیتے ہیں (اللہ کے سامنے)''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (آیت ۲۰۸) ''اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''۔ یعنی جزوی نہیں بلکہ پورے کا پورا اسلام اپنے اوپر نافذ کرو۔ اسی طرح اطاعت کے حوالے سے فرمایا:﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ (النساء:۵۹) ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اُس کے) رسول کی اور اُن کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔''

تقویٰ کے حوالے سے فرمایا:﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران:۱۰۲) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق

ہے''۔ اللہ کی عبادت کے حوالے سے حکم ہوا: ﴿فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ﴾ (العنکبوت:۱۷) ''پس تم اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اُسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر ادا کرو''۔ اسی سورۃ میں آگے حکم ہوا: ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾﴾ ''اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین بہت وسیع ہے' پس تم میری ہی عبادت کرو''۔ اس آیت میں یہ حکم بھی مضمر ہے کہ اگر کسی جگہ پر ایسا ماحول ہے کہ تم میری عبادت نہیں کر پا رہے تو اس جگہ کو چھوڑ دو' وہاں سے ہجرت کر کے کسی ایسے علاقے میں چلے جاؤ جہاں تمہیں میری عبادت سے کوئی نہ روکے۔

سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ یہی مضمون سورۃ النساء میں بھی آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ جہاد کے بارے میں حکم ہوا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ (الحج:۷۷) ''اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے''۔ اور پھر قتال کے بارے میں فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) ''اور (اے مسلمانو!) ان (کافر و مشرکین) سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر) باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کا ہو جائے۔''

سورۃ الحج کی آخری سے پہلی آیت بہت جامع ہے اور اس میں چار احکام جمع کر دیے گئے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۷۷﴾﴾ ''اے ایمان کے دعوے دارو! جھک جاؤ' اور سربسجود ہو جاؤ' اور اپنے رب کی بندگی کرو' اور نیک کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ!'' اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت میں بھی چار احکام بیان ہوئے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا

اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۲۰۰﴾ ''اے اہلِ ایمان! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ' اور آپس میں مربوط رہو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

دین کے جملہ فرائض میں باہمی ربط وتناسب

میں نے ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر آپ کے سامنے یہ تمام اوامر ونواہی بیان کیے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں باہمی ربط کیا ہے؟ اور کون سی چیز بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور کون سی چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے؟ اس کا جاننا بہت ضروری ہے' اس لیے کہ اگر ان فرائض میں درجہ بندی کا خیال نہ رکھا جائے تو ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی'' کے مصداق یہ بات انسان کی بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے ایک شے جو آپ سے مَن بھر مطلوب ہے' وہ تو آپ ایک تولہ کر کے فارغ ہو جائیں اور جو تولہ بھر مقصود تھی اس کے اوپر آپ ایک مَن کا ڈھیر لگا دیں۔ یہ نسبت وتناسب کا اُلٹ ہو جانا بھی انسان کی تباہی وبربادی' ناکامی اور آخرت کے خسران پر منتج ہوسکتا ہے۔

اس نسبت وتناسب کو سمجھنے کے لیے میں آپ کے سامنے ایک عمارت کا نقشہ رکھتا ہوں — ایک مرتبہ جمعہ میں خطاب کرتے ہوئے اچانک وہ نقشہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں ڈال دیا۔ یہ کوئی تیس پینتیس سال پرانی بات ہے' لیکن اس کے بعد جہاں بھی میں نے وہ نقشہ بیان کیا ہے تو اس سے بہت سے لوگوں کو انشراح حاصل ہوا ہے۔ یہ واقعتاً ایسے ہی ہے کہ ایک آدمی کی بینائی کمزور ہوگئی ہے' وہ ٹھیک طور پر دیکھ نہیں پاتا' لیکن جب اسے عینک لگ جاتی ہے تو اسے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے روشنی حاصل ہوگئی اور جو چیزیں پہلے دھندلی نظر آ رہی تھیں اب وہ صاف نظر آنے لگ جاتی ہیں۔ اسی طریقے سے دین کے جملہ فرائض میں نسبت وتناسب کو سمجھنے کے لیے یہ نقشہ ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

دینی فرائض کا جامع تصور

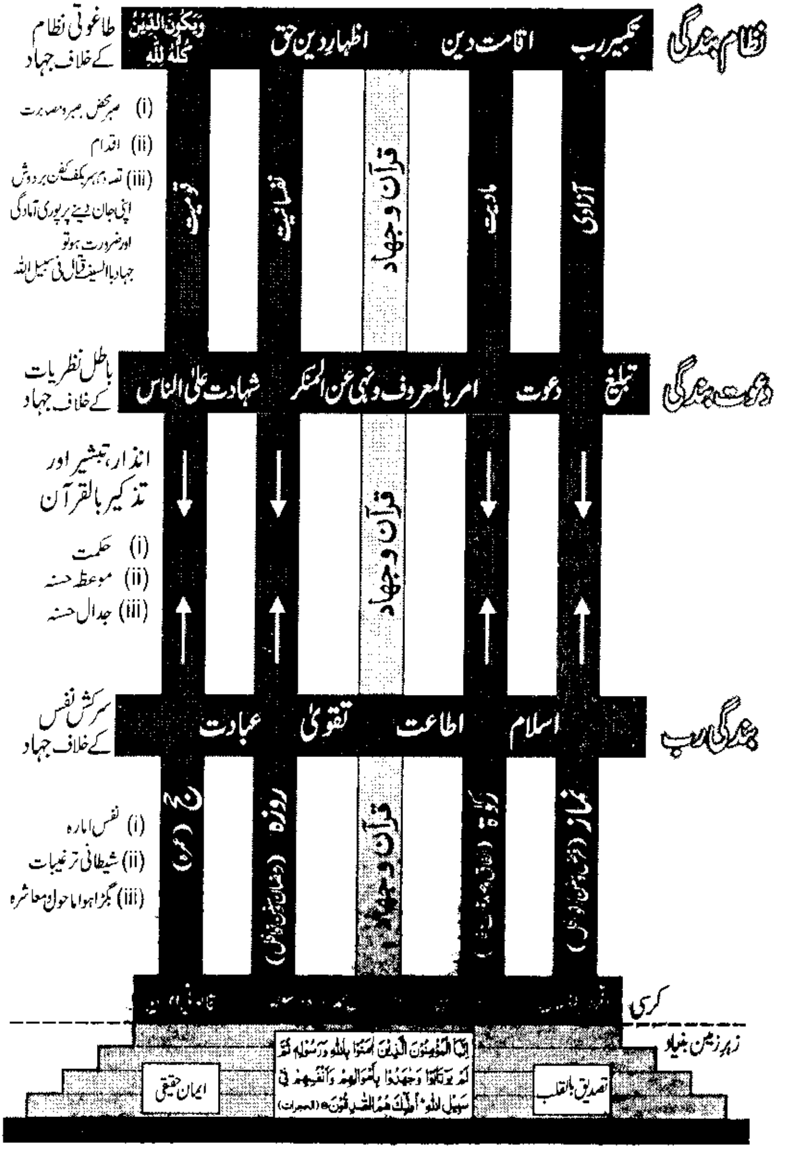

آپ ایک تین منزلہ عمارت کا تصور اپنے ذہن میں قائم کریں جس کی پہلی منزل پر صرف چار ستون کھڑے ہیں۔ ستونوں کے علاوہ نہ کوئی دیواریں ہیں اور نہ کوئی کمرے وغیرہ ہیں۔ آج کل کے رواج کے مطابق گویا پارکنگ لاٹ کے طور پر وہ جگہ چھوڑ دی گئی۔ البتہ اس پہلی منزل کے نیچے ایک بنیاد ہے اور ان بنیادوں پر یہ چاروں ستون کھڑے ہیں۔ پھر ان بنیادوں کے بھی دو حصے ہیں' ایک حصہ وہ ہے جو نظر آ رہا ہے اور وہ سطح زمین سے اوپر ہوتا ہے' جسے آپ پلنتھ (plinth) اور کرسی بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ بھی بنیاد ہے' لیکن اصل بنیاد وہ ہے جو زیر زمین ہے اور نظر نہیں آتی۔ ظاہر بات ہے کہ عمارت کی مضبوطی کا سارا دارومدار اس پر ہے۔ جتنی اونچی عمارت آپ نے بنانی ہے اس کی فاؤنڈیشن اتنی ہی گہری ہونی چاہیے۔

ان بنیادوں پر چار ستون ہیں اور پھر ان چار ستونوں کے اوپر پہلی چھت آ گئی۔ اب اس کے اوپر تعمیر (construction) کی وجہ سے ستون نظر نہیں آئیں گے لیکن ستون اوپر چڑھتے رہیں گے اور ان ستونوں پر ہی دوسری چھت بھی آئے گی۔ آج کل انجینئرنگ کا اصول یہی ہے کہ بلڈنگ کا سارا سٹرکچر ستونوں پر استوار ہوتا ہے۔ باقی دیواروں کو بڑی آسانی سے اِدھر اُدھر کیا جا سکتا ہے اور اس سے چھت پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ چھت کا سارا وزن تو ستونوں پر ہے' نہ کہ دیواروں پر۔ اب ان ستونوں پر دوسری چھت آ گئی۔ پھر یہی ستون اوپر جائیں گے اور تیسری چھت بھی انہی پر آ جائے گی۔ غور کیجیے کہ چار ہی ستون ہیں اور اس کے اوپر تین چھتیں ہیں اور ظاہر بات ہے کہ نیچے بنیاد (foundation) بھی ہے۔

دین کی بنیاد: ایمان اور اسلام!

اس سہ منزلہ عمارت کے نقشہ کو ذہن میں رکھیے۔ میں یہاں درمیان سے شروع کروں گا۔ دیکھئے اسلام تو گویا نقطہ آغاز ہے۔ اسلام کے بارے میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ......)) کہ اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں سے پہلا اِقْرَارٌ بِاللِّسَان ہے جو پلنتھ لیول ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آپ نے اقرار کیا اور کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ

مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ شخص مسلمان ہے۔ یہ تو گویا عمارت کی بنیاد کا وہ حصہ ہے جو لوگوں کو نظر آتا ہے۔ لیکن ایک ہے ایمان یعنی تصدیق بالقلب' اور یہ درحقیقت اصل بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی۔ دل میں ایمان ہے یا نہیں' ہمیں نظر نہیں آتا' لیکن اصل ایمان وہی ہے۔ سورۃ الحجرات' آیت ۷ میں فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر کھبا دیا ہے''۔ اور پھر آگے آیت ۱۴ میں بدوؤں کے بارے میں فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

دین کے چار ستون: نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ

یوں سمجھئے کہ ہم نیچے سے اوپر کی طرف چل رہے ہیں۔ اصل بنیاد ہے ایمانِ قلبی' یعنی یقین والا ایمان اور اس کے بعد پلنتھ کی حیثیت رکھتا ہے زبان سے گواہی دینا۔ اس کے اوپر چار ستون چار عبادات ہیں: نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ۔ اس حوالے سے ہم یہ حدیث پڑھ چکے ہیں:

((بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ' وَاِقَامِ الصَّلَاةِ' وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ' وَحَجِّ الْبَيْتِ' وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام

دین کی پہلی چھت اور اس کی چار اصطلاحات

دین کے ان چار ستون پر اوپر کی تینوں چھتوں کا وزن ہے۔ پہلی چھت کے بارے میں آپ اچھی طرح نوٹ کر لیں کہ اس کے لیے چار اصطلاحات ہیں۔

۱) **اسلام**: اسلام کے معنی ہیں: سرِ تسلیم خم کر دینا' ہتھیار ڈال دینا (to surrender.)۔ اس کے حوالے سے ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ گویا ایک لڑائی ہو رہی تھی' اس میں آپ نے ہار تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے' سرِ تسلیم خم کر دیا۔

۲) **اطاعت**: یہ دوسری اصطلاح ہے۔ اطاعت یہ ہے کہ اپنی دلی مرضی اور خوشی کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ کا کہنا ماننا۔ ایک ہے مجبوری سے ماننا' اسلام تو وہ بھی شمار ہو جائے گا اور اس سے بھی جان و مال کو تحفظ حاصل ہو جائے گا' لیکن یہ اطاعت شمار نہیں ہوگی۔ جیسے اپنی جان بچانے کے لیے کسی کا اسلام کا اعلان کر دینا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بالفعل ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک جنگ میں حضرت اُسامہؓ کا ایک مشرک سے دو بدو مقابلہ ہوا۔ مشرک نے جب دیکھا کہ میری تو اب بس ہوگئی ہے اور اب میں کچھ نہیں کر سکتا تو اس نے فوراً سے کلمہ پڑھ دیا: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰه۔ لیکن حضرت اسامہؓ نے اسے قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس کا پتا چلا تو آپؐ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ حضرت اسامہؓ نے وضاحت پیش کی کہ حضور! اُس نے تو جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ —— اگرچہ اُس نے جان بچانے کے لیے ہی کلمۂ شہادت پڑھا ہو' لیکن ہمیں حکم یہی ہے کہ کسی کے کلمہ پڑھ لینے کے بعد اس پر تمہاری تلوار نہیں چلنی چاہیے' اس لیے کہ کلمہ بہت بڑی ڈھال ہے۔ لیکن اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ دلی آمادگی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرنا۔ اطاعت کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد بار یہ حکم آیا ہے: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ لیکن سورۃ النساء میں اللہ اور رسول کے ساتھ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

۳) **تقویٰ**: تیسری اصطلاح ہے۔ یعنی پوری زندگی احتیاط کے ساتھ اور پھونک پھونک

کرقدم رکھنا کہ کہیں حدود اللہ پامال نہ ہو جائیں‘ کہیں غیر شعوری طور پر بھی اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ زیر مطالعہ حدیث میں ہم نے یہ الفاظ پڑھ لیے ہیں: ((وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا)) کہ اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور سورۃ البقرۃ میں تو آیا ہے: ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ کہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے حوالے سے ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران:۱۰۲) ”اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے۔“

٤) عبادت: دین کی پہلی چھت کے حوالے سے اب تک تین چیزیں بیان ہوئی ہیں: (۱) اسلام یعنی سرنڈر کرنا‘ (۲) اطاعت یعنی دلی آمادگی سے اللہ اور رسول کا حکم ماننا‘ اور (۳) تقویٰ یعنی پوری احتیاط ملحوظ رکھنا کہ کہیں قدم حدود اللہ سے تجاوز نہ کر جائیں۔ بلکہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ فاصلے پر رہیں اور اس کے قریب بھی نہ جائیں۔ اب ان سب کو جمع کریں تو ایک لفظ بنتا ہے: عبادت! اللہ کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہمہ تن‘ ہمہ وقت‘ ہمہ وجوہ اللہ کی بندگی اور اطاعت کرنا عبادت ہے۔ درحقیقت یہ پہلی چھت کے لیے چار اصطلاحات ہیں اور یہ چاروں بہت قریب قریب ہیں‘ لیکن ان چاروں اصطلاحات کو الگ الگ ذہن میں رکھیے‘ اس لیے کہ قرآن مجید کے مضامین اور اس کی حکمتوں کو سمجھنے اور جاننے کے لیے ان سے واقفیت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

عبادت کے حوالے سے میں تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں کہ عبادت کے لیے یہ عبادات (یعنی نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ) فرض کر دی گئی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر لوگ صرف ان عبادات کو ہی عبادت سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ عبادت تو یہ ہے کہ ہمہ تن‘ ہمہ وقت‘ ہمہ وجوہ اللہ کی اطاعت اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر کرنا۔ کیا آپ ۲۴ گھنٹے نماز پڑھتے ہیں؟ کیا آپ روزانہ روزہ رکھتے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ یہ چاروں تو عبادات ہیں‘ جو شامیانے کے چار بانسوں کی مانند ہیں‘ جبکہ عبادت گویا اصل شامیانہ ہے۔

دین کی دوسری چھت اور اس کی چار اصطلاحات

جیسے میں نے نقشہ میں آپ کو بتایا کہ دین کی عمارت میں چار ستون ہیں اور ان ستونوں کے اوپر پہلی چھت بھی ہے اور پھر انہی کے اوپر دوسری چھت بھی پڑی ہوئی ہے۔ جیسے پہلی چھت کے لیے چار اصطلاحات تھیں اسی طرح اس دوسری چھت کے لیے بھی چار الفاظ/اصطلاحات نوٹ کر لیجیے۔

۱) **تبلیغ**: یعنی اللہ کے دین اور اللہ کی کتاب کی تبلیغ۔ نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ:٦٨) ''اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے''۔ اس میں کوئی کتمان نہیں کرنا ہے اور نہ اس ضمن میں خود سے کوئی فیصلہ کرنا ہے کہ اس بات کو پہنچا دوں اور یہ نہ پہنچاؤں' بلکہ تمام کا تمام پہنچانا آپ پر فرض ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے وہ آیات بھی امت تک پہنچائی ہیں جن میں بظاہر احوال اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر عتاب ہوا ہے۔ مثلاً: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (التحریم: ١) ''اے نبی (ﷺ) آپ کیوں حرام ٹھہرا رہے ہیں (اپنے اوپر) وہ شے جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟'' اسی طرح سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کا معاملہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ② ......﴾۔ حضور اکرم ﷺ نے خود فرمایا کہ یہ آیات عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اُتری ہیں —— حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا صحابی تھے۔ ایک دن وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس اُس وقت آئے جب قریش کے بڑے بڑے سردار آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور آپؐ انہیں تبلیغ کر رہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ اپنی ذاتی منفعت کے لیے تو کچھ نہیں کر رہے تھے' بلکہ آپؐ تو مسلمانوں ہی کی بھلائی کے لیے یہ سب کر رہے تھے کہ اگر یہ بڑے سردار ایمان لے آئیں تو اس وقت جو غریب مسلمان بیچارے ستائے جا رہے ہیں' ان کو کچھ نہ کچھ ریلیف مل جائے گا۔ جیسے حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما اسلام میں داخل ہوئے تو بہت سے مسلمانوں کو بہت کچھ ریلیف ملا

تھا۔ لیکن عبداللہ بن اُم مکتومؓ کو چونکہ پتا نہیں تھا تو وہ بار بار حضورﷺ کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ اس پر حضور اکرمﷺ کو کچھ ناگواری کا احساس ہوا اور آپؐ کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ اس پر سورۂ عبس کی یہ آیات نازل ہو گئیں:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ③ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ⑥ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ⑦ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ⑧ وَهُوَ يَخْشٰى ⑨ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ⑩﴾

''تیوری پر بل پڑ گئے اور انہوں نے رخ موڑ لیا' اس لیے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور (اے نبیﷺ) آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا' یا وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اس کے لیے مفید ہوتی۔ لیکن وہ جو بے نیازی دکھاتا ہے' آپ اس کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور اگر وہ پاکی اختیار نہیں کرتا تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔ اور وہ جو آپؐ کے پاس چل کر آیا ہے' اور اس کے دل میں خشیت بھی ہے' اس سے آپؐ استغناء برت رہے ہیں۔''

ان آیات کے نزول کے بعد عالَم یہ تھا کہ عبداللہ بن اُم مکتومؓ جب بھی آتے تھے تو آپﷺ فرمایا کرتے تھے: مَرْحَبًا بِالَّذِیْ اَعْتَبَنِیَ اللّٰہُ مِنْہُ ''مرحبا اس شخص کے لیے جس کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر عتاب فرمایا''۔ بہرحال یہ ہے تبلیغ اور اللہ کے رسولﷺ نے یہ فریضہ مکمل طور پر ادا کیا۔

۲) **دعوت**: دوسری چھت کے ضمن میں یہ دوسری اصطلاح ہے۔ دعوت اور تبلیغ تقریباً ہم معنی لفظ ہیں لیکن ان میں کچھ فرق بھی ہے۔ میں ان چیزوں کا ربط آپ کے سامنے ظاہر کر رہا ہوں۔ تبلیغ میں آپ خود پہنچ کر بات پہنچاتے ہیں جس کو انگریزی میں کہتے ہیں:

reach out to others to convey the meesage of Allah.

جبکہ دعوت میں آپ اس بندہ کو اللہ کی طرف کھینچ کر لاتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ تبلیغ یعنی بات کا پہنچانا اور دعوت یعنی کسی کو بلانا اور کھینچ کر لانا۔

۳) **امربالمعروف ونھی عن المنکر**: یہ انہی دو باتوں یعنی دعوت

وتبلیغ کے ضمن میں دوسری جہت کی تیسری اصطلاح ہے۔ ''واضح رہے کہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' (بھلائی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا) ایک ہی اصطلاح ہے۔ یہ دو نہیں' بلکہ ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں دس مرتبہ یہ اسی طریقے سے جڑے ہوئے آئے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھیے کہ امر بالمعروف تو ہر سطح پر ہوگا' البتہ نہی عن المنکر صرف وہیں ہوگا جہاں آپ کو اختیار حاصل ہے۔ آپ کو اپنے گھر میں اختیار حاصل ہے کیونکہ آپ سربراہِ خاندان ہیں۔ آپ کا بچہ نماز نہیں پڑھ رہا تو آپ اسے مار سکتے ہیں' لیکن آپ پڑوسی کے بچے کو نماز نہ پڑھنے پر مار نہیں سکتے۔ ہاں نیکی کی تلقین ہر وقت کی جاسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ کوئی آپ کو جھڑک دے گا کہ کہاں سے آئے تم مجھے ہدایت کرنے اور سمجھانے؟ چنانچہ امر بالمعروف تو ہمیشہ کرنا ہے' لیکن نہی عن المنکر اپنے دائرہ اختیار میں۔ خاص طور پر بڑے پیمانے پر یہ اُس وقت ہوگا جب اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی اور یہ حکومت کا فرض ہوگا۔ اس بارے میں فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ﴾ (الحج: ٤١) ''وہ لوگ کہ اگر انہیں ہم زمین میں تمکن عطا کر دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔''

٤) **شہادت علی الناس:** اب ان تمام الفاظ یعنی (١) تبلیغ' (٢) دعوت اور (٣) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو جمع کریں گے تو ایک لفظ بنے گا: شہادت علی الناس! اور یہ دین کی دوسری جہت کی دوسری اصطلاح ہے۔ دیکھئے دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر انفرادی سطح پر بھی کرنا ہے اور اجتماعی سطح پر بھی' اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر اللہ کی طرف سے حجت قائم ہوجائے اور وہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ ہم تک تو تیرا پیغام کسی نے پہنچایا ہی نہیں تو ہم سے مواخذہ کیسا؟ ہم سے محاسبہ کس بات کا؟ لہٰذا یہ انبیاء اور رسولوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں تک اللہ کے پیغام کو پہنچائیں' اس لیے کہ وہ تو بھیجے ہی اس مقصد کے لیے جاتے ہیں تاکہ لوگوں پر حجت

قائم کر دیں۔ اس بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا﴿۱۶۵﴾﴾ ''یہ رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

ختمِ نبوت کے بعد اب یہ مقصد بحیثیتِ مجموعی امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ اُمت نے چونکہ اس میں کوتاہی کی ہے لہٰذا صدیوں سے اللہ کی سزا کی گرفت میں ہے۔ میری ایک کتاب ہے: ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی، حال اور مستقبل''۔ سابقہ اُمتِ مسلمہ یہود کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کی طرف سے ان پر کیسے کیسے عذاب آئے اور کیوں آئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔ اس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں دو دفعہ (آیت ۴۷ اور ۱۲۲) آیا ہے: ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۝﴾ ''اے یعقوب کی اولاد! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی تمام جہان والوں پر''۔ لیکن تمہارے کرتوت یہ تھے کہ تم نے میری کتاب کو پس پشت ڈال دیا: ﴿وَلَمَّا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ۙ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴿۱۰۱﴾﴾ (البقرۃ) ''اور جب آیا اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول (یعنی محمد ﷺ) تصدیق کرنے والا اُس کتاب کی جو ان کے پاس موجود ہے تو اہل کتاب میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، گویا وہ جانتے ہی نہیں۔''

اب اس کی سزا مختلف مواقع پر ان کو ملی۔ کبھی آشوریوں کے ہاتھوں ان کا قتل عام ہوا، کبھی بخت نصر کے ہاتھوں، کبھی یونانیوں کے ہاتھوں، کبھی رومیوں کے ہاتھوں۔ اس کے بعد پچھلی صدی میں جرمنوں کے ہاتھوں ان کا قتل عام ہوا ہے۔ یہ سارے عذاب اسی لیے آئے کہ انہوں نے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ اپنا فرض صحیح طریقے سے سرانجام نہیں دیا۔

ان میں کچھ نہ کچھ یقیناً نیکوکار بھی ہوں گے۔ قرآن مجید تو حضورﷺ کے زمانے کے یہودیوں کے بارے میں بھی فرماتا ہے: ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ﴿۱۱۳﴾﴾ ''یہ سب کے سب برابر نہیں ہیں۔ اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو (سیدھے راستے پر) قائم ہیں' رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں''۔ مزید فرمایا کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس ڈھیروں سونا رکھوا دو تو وہ اس میں رتّی برابر بھی خیانت نہیں کریں گے اور تمہیں جوں کا توں واپس کر دیں گے' لیکن ان میں سے ایسے بھی ہیں کہ ان کے پاس ایک دینار بھی رکھوا دو تو وہ واپس نہیں کریں گے۔ جب کسی قوم کی اکثریت اس طرح کی ہو جائے تو پھر ان پر اللہ کا عذاب آتا ہے اور اس عذاب کی گرفت میں وہ نیکوکار بھی آ جاتے ہیں۔

نصِ قرآنی کے مطابق اس عذاب سے صرف وہ لوگ بچائے جاتے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے' یعنی خود بھی گناہوں سے رکے رہے اور دوسروں کو بھی روکتے رہے۔ البتہ جو خود تو رکے رہے' لیکن دوسروں کو نہیں روکا تو وہ بھی عذاب کے اندر گھن کی طرح پس جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ (آیت ۲۵) ''اور ڈرو اُس فتنے سے جو تم میں سے صرف گنہگاروں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا''۔ یعنی یہ عذاب صرف ان کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا کہ جنہوں نے جرائم یا گناہ کیے' بلکہ وہ بے گناہ بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے جو خاموش رہے' جنہوں نے دعوت و تبلیغ نہیں کی اور جنہوں نے اپنی حد امکان تک لوگوں کو برائی سے نہیں روکا۔ ظاہر بات ہے وہ بھی مجرم شمار ہوں گے اور وہ بھی اس عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔ یہ ہے شہادت علی الناس!

دین کی تیسری چھت اور اس کی چار اصطلاحات

اب باری آئی دین کی تیسری چھت اور تیسری منزل کی ۔۔۔ ع اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی! ۔۔۔ اور یہ سب سے مشکل مقام ہے۔ دین کی تیسری منزل ہے:

دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ دین اسلام ایک مکمل نظام ہے اور یہ صرف کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ موجودہ عیسائیت نرا عقیدہ ہے' اس میں اور کچھ نہیں ہے۔ شریعت بھی نہیں ہے' نہ کوئی شے حلال ہے اور نہ حرام۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ کہہ کر گئے تھے کہ شریعت موسوی تم پر لاگو رہے گی' لیکن سینٹ پال نے اس کو ساقط قرار دے دیا کہ شریعت ہم پر لاگو نہیں ہے۔ لہٰذا موجودہ عیسائیت ایسا مذہب ہے جس میں شریعت ہے ہی نہیں اور وہ صرف اس عقیدے پر مشتمل ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لو اور اپنے دل میں اس کا یقین کر لو کہ تمہارے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے' اس لیے کہ مسیحؑ سولی پر چڑھ کر تمہاری طرف سے پہلے ہی کفارہ دے چکے ہیں۔ جو بھی اس عقیدے کو مان لے گا تو اس کی طرف سے کفارہ ہو جائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! قرآن تو کہتا ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (الانعام: ۱۶۴) ''کوئی جان دوسری کسی جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔''

بعض مذاہب کے اندر عقیدہ بھی ہے' کچھ عبادات اور پوجا پاٹ بھی ہے' لیکن اس سے آگے کوئی نظام نہیں ہے۔ نہ سیاسی نظام ہے' نہ معاشی نظام ہے' نہ معاشرتی نظام ہے اور نہ فوجداری یا دیوانی قوانین ہیں۔ نہ کوئی سول قانون' نہ کوئی قانونِ شہادت' اور نہ کوئی عائلی قوانین ہیں' کچھ بھی نہیں ہے۔ جبکہ اسلام کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں عقائد بھی ہیں' ایمانیات بھی اور عبادات —— نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ —— بھی۔ پھر کچھ رسومات ہیں' مثلاً بچہ پیدا ہوگا تو اس کا ختنہ کرائیں گے' عقیقہ کرائیں گے۔ کوئی فوت ہوگا تو اس کو جلائیں گے نہیں' بلکہ اس کی تجہیز و تکفین کریں گے اور اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ یہ رسومات ہیں۔ اس کے بعد اسلام کا معاشرتی نظام بھی ہے اور معاشی نظام بھی۔ اس کے فوجداری قوانین بھی ہیں' سول قوانین بھی' دیوانی قانون بھی' قانونِ شہادت بھی' عائلی قوانین بھی۔ پھر سب سے بڑھ کر اسلام کا ایک سیاسی نظام بھی ہے کہ اللہ کی حاکمیت اور اللہ کا قانون اس دنیا میں بالاتر رہے: ﴿لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ ''تاکہ اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہو جائے''۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور یہی اسلام کی

چوٹی اور بلند ترین منزل ہے۔ اب اس تیسری چھت کے لیے بھی چار اصطلاحات/الفاظ نوٹ کیجیے۔ دو اصطلاحات مکی قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور دو اصطلاحات کا تذکرہ مدنی قرآن میں ہے۔

۱) **تکبیرِ رب**: مکی قرآن میں بیان شدہ پہلی اصطلاح ہے: تکبیرِ رب! یعنی رب کو بڑا کرو۔ رب کو بڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ پر اللہ کی بڑائی نہیں مانی جا رہی، وہاں اُس کی بڑائی منوائی جائے۔ جہاں اس کا قانون نافذ نہیں، اور اس کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں ہو رہے وہاں اس کا قانون نافذ کیا جائے۔ سورۃ المائدۃ میں بڑے دوٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴿۴۴﴾...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۴۵﴾...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴿۴۷﴾﴾ ''اور جو اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں...... وہی تو ظالم ہیں...... وہی تو فاسق ہیں''۔ یہ تو نام نہاد مسلمان ہیں اور انہوں نے اسلام کو صرف مذہب سمجھا ہے، لیکن بطور دین اور نظام کے نہیں سمجھا۔ آج پوری زمین پر ایسا کوئی خطہ نہیں ہے جہاں پر اللہ کا پورا دین قائم ہے۔ تو دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کرنا اور اس کے قانون کو نافذ کرنا تکبیرِ رب ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی ابتدائی وحیوں میں سے سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات بھی ہیں جن میں تکبیرِ رب کا حکم ہے۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! اٹھ کھڑے ہو اور (لوگوں کو) خبردار کرو! اور اپنے رب کو بڑا کرو!'' ہم نے سمجھ لیا ہے کہ تکبیر رب کے معنی ہیں اللہ کو بڑا کہنا، لیکن تکبیر کے معنی یہ نہیں ہیں۔ تکبیر کے معنی ہیں کسی شے کو بڑا کرنا اور تصغیر کے معنی ہیں کسی شے کو چھوٹا کرنا۔ کتاب سے اسم تصغیر بنتا ہے ''کتابچہ''۔ کتاب بڑی تھی اور کتابچہ چھوٹا ہو گیا۔ تکبیر ربّ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی مانی جائے اور اس کی حاکمیت دنیا میں بالفعل قائم کی جائے۔ پھر یہ اصطلاح سورۂ بنی اسرائیل کے اختتام پر بھی آئی ہے: ﴿وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا﴾ یعنی اسے اس طرح بڑا بناؤ جیسے کہ اس کے بڑا ہونے کا حق ہے۔

۲) **اقامتِ دین**: دین کی تیسری جہت کے حوالے سے یہ دوسری اصطلاح ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اس کا حکم دیا گیا ہے: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ ''کہ دین کو قائم کرو اور اس میں جھگڑا مت ڈالو''۔ ہاں مذہب کی سطح پر اختلاف ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نماز میں ہاتھ سینے پر ہوں یا ناف پر یا کھول دیں' اس اختلاف پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی طرح رفع یدین کا معاملہ ہے' جو بھی روایات آپ کو مضبوط معلوم ہوں ان کو اختیار کر لیں' کوئی مضائقہ نہیں۔ مذہب کی سطح پر کوئی اختلاف ہو جائے تو وہ قابلِ قبول ہے' لیکن دین کے معاملے میں اختلاف کسی صورت قابلِ قبول نہیں۔ وہاں اختلاف کریں گے بھی کیسے؟ کیا آپ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت میں اختلاف کریں گے؟ اقامتِ دین کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑو' اللہ کا قانون نافذ کرو' حدود اللہ کو قائم کرو' اور اس میں کسی اختلاف میں نہ پڑو۔ ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾(الشوریٰ:۱۳) ''(اے مسلمانو!) اللہ نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمدﷺ) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو''۔ یعنی نوح کا' ابراہیم کا' موسیٰ کا' عیسیٰ (علیہم السلام) کا اور اے محمدﷺ آپ سب کا دین ایک ہے' البتہ شریعتیں مختلف ہیں: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ (المائدۃ:۴۸) ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے''۔ دیکھئے شریعتِ موسوی اور شریعتِ محمدیؐ میں فرق رہے گا' منہجِ عمل بھی تمام انبیاء و رسل کا ایک سا نہیں ہو سکتا' لیکن ہمارے لیے منہجِ نبوی کو اختیار کرنا لازم ہے۔

۳) **اظهارُ دینِ الحقِّ علَى الدِّینِ کُلِّهٖ**: تیسری جہت یعنی دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کے حوالے سے مکی قرآن میں دو اصطلاحات بیان ہوئی ہیں: تکبیرِ رب اور اقامتِ دین۔ پھر اس ضمن میں دو ہی اصطلاحات مدنی قرآن میں بھی بیان

ہوئی ہیں۔ پہلی اصطلاح ہے: اِظْهَارُ دِینِ الْحَقِ عَلَى الدِّیْنِ کُلِّہٖ!اور یہ قرآن مجید میں تین مرتبہ آئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹) ”وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر“۔ یعنی صرف معاشرتی نظام پر نہیں‘ بلکہ سیاسی نظام پر بھی اور معاشی نظام پر بھی اللہ کا دین غالب ہو۔ سود حرام ہے لہٰذا اس کو ختم کرو‘ اس کا استیصال کرو‘ اسے جڑوں سے اُکھیڑ کر پھینک دو۔ فحاشی اور منشیات کو کمائی کا ذریعہ بنانا حرام ہے‘ لہٰذا اس کا سدباب کرو۔ یہ جو آج کل ہمارے معاشرے میں بے حیائی کو پھیلا کر اس کے ذریعے سے کمائی کے راستے اختیار کیے گئے ہیں اس سے ہمارا معاشرہ زوال کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ آج کل ہر شے کے اشتہار کے ساتھ عورت کی تصویر ہوتی ہے اور اخبارات میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ پھر فیشن اور شوبز کے نام پر باتصویر رنگین صفحات الگ سے چھاپے جاتے ہیں‘ کہ یہ موسم گرما کا انداز ہے‘ یہ موسم سرما کا انداز ہے اور یہ بہار کے رنگ ہیں۔ یہ تمام چیزیں نہیں ہونی چاہئیں۔ میرے علم کی حد تک پوری دنیا میں‘ سوائے ترکی اور پاکستان کے‘ کہیں بھی روزانہ کے اخبارات میں کبھی رنگین تصویر نہیں آتی۔ جو ڈیلی نیوز پیپر خرید رہا ہے وہ تو خبروں کے لیے خرید رہا ہے‘ تو اس میں عورتوں کی رنگین تصاویر کس لیے ہیں؟ یہ طرزِ معاشرت اور یہ ذرائع معیشت قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ لہٰذا سارے نظاموں پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد ضروری ہے‘ جس کے لیے قرآن کی جامع اصطلاح ہے: اظهارُ دِینِ الحقِّ علی الدِّین کلہ۔

٤) **یَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ**: یہ بھی ایک جامع ترین اصطلاح ہے اور یہ سورۃ الانفال میں آئی ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ ”اور (اے مسلمانو!) ان (کفار و مشرکین) سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر) باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کا ہو جائے“۔ یعنی ان مشرکین اور کفار سے جنگ کرو اور جنگ کرتے رہو‘ یہاں تک کہ فساد‘ فتنہ اور بغاوت بالکل فرو

ہو جائے اور نظام پورے کا پورا اللہ کے حکم کے تابع ہو جائے۔ اس آیت میں چوٹی کی بات بیان فرمائی گئی ہے' اس لیے کہ جہاد کی چوٹی قتال ہے۔

یہ ہے آخری منزل اور اس بارے میں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ سب سے اہم پہلی منزل ہے اور سب سے بلند تیسری منزل ہے۔ پہلی اس لیے اہم ہے کہ پہلی منزل ہو گی تو دوسری بنے گی اور دوسری ہو گی تو تیسری بنے گی۔ لیکن بلند ترین آخری منزل ہے' جس کے لیے یہ اصطلاحات بیان ہوئی ہیں: تکبیرِ رب' اقامتِ دین' لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ' اِظهارُ دینِ الحق عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ' وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ!

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم اور اس کے مختلف اجزاء کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین یارب العالمین!

اقول قولی هذا و استغفر اللّٰه لی ولكم ولسائر المسلمين و المُسلمات

شرعی احکام کی اقسام (۲)

۶ جون ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

فرائضِ دینی میں جہاد کا مقام

اب تک کی گفتگو میں ہم نے فرائضِ دینی کا نقشہ مکمل کر لیا ہے' لیکن اب مجھے خیال آیا کہ اس نقشہ میں جہاد اور قتال کا کہیں ذکر نہیں آیا' حالانکہ ہم ایسی احادیث پڑھ چکے ہیں جن میں حضورﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کو دین کی چوٹی قرار دیا ہے۔ چنانچہ اربعین کی حدیث نمبر ۲۸ میں ہم نے حضورﷺ کا یہ فرمان پڑھا تھا: ((وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ)) ''اور دین کی چوٹی کا عمل جہاد ہے''۔ پھر یہ حدیث ذرا مفصل انداز میں ''حکمت دین کا ایک عظیم خزانہ'' کے عنوان سے ہم نے کافی پہلے پڑھی تھی جس میں یہی بات اس طور پر آئی تھی' کہ آپﷺ نے فرمایا: ((اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مُعَاذُ بِرَأْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ)) ''اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ ہمارے اس دین کی جڑ کیا ہے اور اس کی چوٹی کیا ہے''۔ پھر آپﷺ نے دین کی چوٹی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ((وَاَنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''اور اس کی بلندترین چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ اسی طرح بہت سی قرآنی آیات میں جہاد کو ایمان کا جزوِ لازم قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

''حقیقی مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر' پھر

شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ۔ صرف یہی لوگ سچے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ الصّف کی یہ آیات بھی ہمارے ہاں بار بار زیر بحث آتی ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ⑩ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑪﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

ان آیاتِ الٰہیہ اور ارشاداتِ نبویؐ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاد ایمان کا لازمی حصہ (integral part) ہے اور جہاد کے بغیر جہنم سے چھٹکارا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اب اس بات کو سمجھئے اور اسے فرائض دینی کے نقشہ کے اندر فٹ کیجیے۔

جہاد ایمان کا جزوِ لازم اور رکن ہے!

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ بنیاد (foundation) کے دو حصے ہوتے ہیں۔ بنیاد کا وہ حصہ جو زمین کے اوپر نظر آ رہا ہے (plinth level) وہ کلمہ شہادت ہے' جبکہ اس سے نیچے زیر زمین بنیاد دلی یقین والا ایمان ہے۔ یہاں سے جہاد کا پودا پھوٹتا ہے اور پھر مختلف سطحوں پر اس کی شاخیں پھیلتی ہیں۔ آخر کار وہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ جہاد ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے۔ بعض لوگ جہاد کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے جوش و جذبے میں اس کو بھی ارکانِ اسلام میں شامل کر دیتے ہیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے' اس لیے کہ ارکانِ اسلام حدیث جبریل اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی متفق علیہ روایت کی رو سے پانچ ہی ہیں۔ اب مجھے یا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس میں کسی کا اضافہ کریں۔ لہٰذا جہاد ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے' البتہ ارکانِ ایمان میں سے

ہے۔گویا اسلام کے تو پانچ ارکان ہیں: کلمہ شہادت' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ' جبکہ ایمانِ حقیقی کے دو اضافی رکن ہو گئے: (i) دل میں یقین' اور (ii) عمل میں جہاد۔ اس طرح ایمان کے ارکان سات ہو جائیں گے' کیونکہ اسلام والے پانچ ارکان تو لازماً شامل ہیں' لیکن دو اضافی بھی ساتھ شامل ہو گئے۔

جہاد کی پہلی منزل اور اس کی تین ذیلی سطحیں

جہاد کا پودا زیر زمین بنیاد یعنی یقین والے ایمان سے نکل رہا ہے اور فرائض دینی کی پہلی چھت یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کے لیے جدوجہد کرنا' یہ جہاد کی پہلی منزل ہے یا یوں کہہ لیں کہ پہلی چھت پر چڑھنے کے لیے جہاد بمنزلہ سیڑھی کے ہے۔ آگے اس کی تین ذیلی سطحیں (sub levels) ہیں۔

دیکھئے' سب سے پہلے آپ اللہ کے بندے بننا چاہتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے تو اس کے لیے آپ کو تین قوتوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلی قوت آپ کا نفس امارہ ہے — ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے'' — اور اپنے نفس کے خلاف زور آزمائی کرنا' یہ جہاد کی پہلی منزل کی پہلی ذیلی سطح ہے' اور یہ اہم ترین ہے' اس لیے کہ پہلی منزل ہو گی تو دوسری بنے گی اور پھر دوسری منزل ہو گی تو تیسری بنے گی۔ چنانچہ جہاد کی اہم ترین سطح مجاہدہ مع النفس اور نفس کے خلاف جہاد ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ))(۱) ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس (کو کنٹرول کرنے) کے لیے جدوجہد کرے''۔ اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِیْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰی))(۲) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''

(۱) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجهاد' باب باب ماجاء فی فضل من مات مرابطا۔

(۲) رواہ الدیلمی' بحوالہ کنز العمال: ۴/۲۶۹۔

شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ۔ صرف یہی لوگ سچے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ الصّف کی یہ آیات بھی ہمارے ہاں بار بار زیر بحث آتی ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ⑩ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑪﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

ان آیاتِ الٰہیہ اور ارشاداتِ نبویؐ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاد ایمان کا لازمی حصہ (integral part) ہے اور جہاد کے بغیر جہنم سے چھٹکارا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اب اس بات کو سمجھئے اور اسے فرائض دینی کے نقشہ کے اندر فٹ کیجیے۔

جہاد ایمان کا جزوِ لازم اور رکن ہے!

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ بنیاد (foundation) کے دو حصے ہوتے ہیں۔ بنیاد کا وہ حصہ جو زمین کے اوپر نظر آ رہا ہے (plinth level) وہ کلمہ شہادت ہے' جبکہ اس سے نیچے زیرِ زمین بنیاد دلی یقین والا ایمان ہے۔ یہاں سے جہاد کا پودا پھوٹتا ہے اور پھر مختلف سطحوں پر اس کی شاخیں پھیلتی ہیں۔ آخر کار وہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ جہاد ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے۔ بعض لوگ جہاد کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے جوش و جذبے میں اس کو بھی ارکانِ اسلام میں شامل کر دیتے ہیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے' اس لیے کہ ارکانِ اسلام حدیث جبریل اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی متفق علیہ روایت کی رو سے پانچ ہی ہیں۔ اب مجھے یا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس میں کسی کا اضافہ کریں۔ لہٰذا جہاد ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے' البتہ ارکانِ ایمان میں سے

ہے۔ گویا اسلام کے تو پانچ ارکان ہیں: کلمہ شہادت' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ' جبکہ ایمانِ حقیقی کے دو اضافی رکن ہو گئے: (i) دل میں یقین' اور (ii) عمل میں جہاد۔ اس طرح ایمان کے ارکان سات ہو جائیں گے' کیونکہ اسلام والے پانچ ارکان تو لازماً شامل ہیں' لیکن دو اضافی بھی ساتھ شامل ہو گئے۔

جہاد کی پہلی منزل اور اس کی تین ذیلی سطحیں

جہاد کا پودا زیرِ زمین بنیاد یعنی یقین والے ایمان سے نکل رہا ہے اور فرائض دینی کی پہلی چھت یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کے لیے جدوجہد کرنا' یہ جہاد کی پہلی منزل ہے یا یوں کہہ لیں کہ پہلی چھت پر چڑھنے کے لیے جہاد بمنزلہ سیڑھی کے ہے۔ آگے اس کی تین ذیلی سطحیں (sub levels) ہیں۔

دیکھئے' سب سے پہلے آپ اللہ کے بندے بننا چاہتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے تو اس کے لیے آپ کو تین قوتوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلی قوت آپ کا نفس امارہ ہے ـــــ ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے'' ـــــ اور اپنے نفس کے خلاف زور آزمائی کرنا' یہ جہاد کی پہلی منزل کی پہلی ذیلی سطح ہے' اور یہ اہم ترین ہے' اس لیے کہ پہلی منزل ہو گی تو دوسری بنے گی اور پھر دوسری منزل ہو گی تو تیسری بنے گی۔ چنانچہ جہاد کی اہم ترین سطح مجاہدہ مع النفس اور نفس کے خلاف جہاد ہے۔ اسی لیے حضورﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ))(۱) ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس (کو کنٹرول کرنے) کے لیے جدوجہد کرے''۔ اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى))(۲) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو۔''

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجهاد' باب باب ماجاء فی فضل من مات مرابطا۔

(۲) رواه الديلمی' بحواله كنز العمال: ۲۶۹/۴۔

جہاد کی پہلی منزل کی دوسری ذیلی سطح ہے: شیطان کے خلاف جدوجہد کرنا۔ اس لیے کہ اس نفس کو اُکسانے والا شیطانِ لعین ہے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنا بھی جہاد ہے۔ شیطان کے بارے میں قرآن نے واضح طور پر فرمادیا: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ﴾ (فاطر:٦) ''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' چنانچہ تم بھی اس کو دشمن ہی سمجھو!'' اسی طرح سورۃ الناس میں فرمایا: ﴿الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝﴾ ''جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے''۔ جیسے آگ کے اوپر کچھ خاکستر آگیا ہو تو پھونکیں مار کر اس آگ کو بھڑکایا جاتا ہے اسی طرح شیطان بھی نفس کے اندر پھونکیں مارتا رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ شیطان اپنی تھوتھنی انسان کے دل پر رکھتا ہے اور اس کو پھونکیں مارتا رہتا ہے۔ لہٰذا شیطان کو اپنا دشمن سمجھتے ہوئے اُس کے خلاف جدوجہد کرو۔ وہ تمہیں نظر نہیں آتا اور تم پر وہاں سے حملہ کرتا ہے جہاں سے تم اسے دیکھ نہیں پاتے۔ چنانچہ جب تک تم اس کے خلاف جہاد نہیں کرو گے تو کیسے اللہ کے بندے بن سکو گے اور کیسے اپنے نفس کو تابع کر سکو گے!

جہاد کی پہلی منزل کی تیسری ذیلی سطح بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ اس لیے کہ معاشرہ بھی آپ کو برائی کی طرف دھکیلتا ہے۔ آپ نے اکثر یہ جملہ سنا ہوگا کہ کیا کریں جی' اب تو چلن ہی اس بات کا ہے' اگر ہم اپنی بیٹیوں کو ستر و حجاب کا پابند بنادیں گے تو ہماری بچیوں کے رشتے کہاں ہوں گے۔ اگر ہمارے ہونے والے داماد کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ گھر کے اندر بلا روک ٹوک نہیں جا سکتا' اس لیے کہ اندر تو میری سالیاں ہیں جو میرے لیے نامحرم ہیں اور مجھے تو باہر بیٹھک میں بیٹھنا پڑے گا تو پھر کون ہمارا داماد بننا پسند کرے گا؟ اسی طرح اگر آپ رشوت لیتے تھے اور آپ نے اللہ کی توفیق سے چھوڑ دی ہے تو اب آپ کے گھر والے لڑیں گے اور آپ کو طرح طرح کی باتیں سنا کر آپ کو پھر سے رشوت کی دلدل میں دھکیلنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ آج کل تو سب رشوت لیتے ہیں' تمہیں تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا ہے؟ پہلے ہم اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا کھاتے تھے اور اب تو سوکھی روٹی مل رہی ہے' وغیرہ

وغیرہ۔ یہ معاشرہ آپ کو دباؤ میں ڈالے گا کہ بیٹیوں کے ہاتھ کہاں سے پیلے کریں گے؟ اس لیے کہ جہیز تو ناگزیر ہے' تو وہ کہاں سے لاؤ گے اگر رشوت نہیں لو گے؟ چنانچہ یہ معاشرہ آپ کو بدی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اس کے خلاف جدوجہد (struggle) کرنا ہے۔ یہ جہاد کی پہلی منزل کا تیسرا sub level ہے۔

کسی بھی معاشرے کے اندر زندگی گزارنے کے دو انداز ہیں۔ ایک یہ کہ ع ''زمانہ با تو نسازد' تو با زمانہ بساز!'' یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہیں کرتا تو تم زمانے کے رنگ میں رنگے جاؤ۔ گویا ع ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!'' اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ''زمانہ با تو نسازد' تو با زمانہ ستیز!'' کہ اگر زمانہ تمہارے ساتھ ہم آہنگی نہیں کر رہا تو تم زمانے کے خلاف جنگ کرو۔ اس کے لیے میں یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر ہجوم ایک طرف جا رہا ہے اور آپ بھی اُدھر ہی جا رہے ہیں تو آپ کو struggle کرنے کی ضرورت نہیں' وہ ہجوم خود ہی آپ کو اُدھر لے جائے گا۔ اور اگر آپ اس ہجوم کے مخالف سمت چلنا چاہیں گے تو ہو سکتا ہے بڑی مشکل سے آپ دو قدم چلیں اور پھر ہجوم کا ریلا آئے اور آپ کو دس قدم پیچھے لے جائے۔ علامہ اقبال نے ''تُو با زمانہ ستیز'' کی وضاحت اپنے اس شعر میں کی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

الغرض فرائض دینی کی پہلی منزل یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ' احسان اور عبادتِ ربّ کا تقاضا پورا کرنے کے لیے تین جہاد کرنے پڑیں گے: (i) نفس کے خلاف جہاد' (ii) شیطان اور اس کی ذرّیتِ معنوی کے خلاف جہاد' اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد۔

جہاد کی دوسری منزل اور اس کی تین ذیلی سطحیں

فرائض دینی کی دوسری چھت کے لیے چار اصطلاحات تھیں: تبلیغ' دعوت' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اور شہادت علی الناس۔ ان کے لیے جدوجہد کرنا جہاد کی دوسری

سطح/منزل ہے۔ظاہری بات ہے کہ دعوت وتبلیغ کے لیے پہلے دین سمجھیں گے‘ سیکھیں گے‘ تبھی تو آگے پہنچائیں گے۔تو دین کا سیکھنا‘ سمجھنا اور اس کے لیے وقت لگانا جہاد ہے۔وہی وقت جو آپ کسی دنیوی فن سیکھنے یا کوئی ہنر حاصل کرنے یا پی ایچ ڈی کرنے کے لیے لگاتے ہیں‘ یہی وقت اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول ﷺ کی حدیث کو سمجھنے کے لیے لگانا پڑے گا تبھی تو آپ اللہ اور اس کے رسول کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا پائیں گے۔چنانچہ اللہ کے دین کو سیکھنے کے لیے وقت لگانا جہاد کی دوسری سطح ہے۔دیکھئے‘ اصل دولت تو وقت ہے۔ایک ڈاکٹر اپنا وقت لگا کر فیس وصول کر رہا ہے‘ کلرک اپنا وقت کام میں لگاتا ہے تو اسے پیسے ملتے ہیں۔لیکن دین تقاضا کرتا ہے کہ یہی وقت دین کو سمجھنے اور سمجھانے میں لگاؤ۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))(۱) ''تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔''

پھر جہاد کی اس دوسری منزل یعنی دعوت وتبلیغ کے لیے جان و مال کھپانے کی بھی تین ذیلی سطحیں (sub levels) ہیں۔پہلی ذیلی سطح یہ ہے کہ آپ معاشرے میں موجود تعلیم یافتہ‘ ذہین اور دانشور اشرافیہ طبقہ (intellectual elite) کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔یاد رکھیے کہ ان تک دعوت پہنچانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔اس کے لیے آپ کو خود بھی اسی لیول اور شعور (consciousness) پر آنا پڑے گا جس پر وہ لوگ ہیں۔وہ وعظ سے اثر نہیں لیں گے‘ بلکہ دلیل طلب کریں گے۔جب قرآن کہتا ہے: ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرة) کہ اے مشرکو‘ اے کافرو! اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کرو۔تو انہیں بھی تو حق ہے نا کہ وہ دلیل کا مطالبہ کریں۔اب دلیل کو جاننا اور لوگوں کو اس طور سے سمجھانا کہ ان کے ذہن کی تشفی ہو جائے‘ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔سطحی علم سے تو ایسا نہیں ہوسکتا‘ اس لیے کہ ان کے اندر بگڑے تگڑے شیطان بھی ہوتے ہیں‘ اور غلط فلسفوں‘ غلط نظریات (مثلاً ڈارون ازم‘ مارکسزم‘ لاجیکل پازیٹوازم‘ میٹریل ازم‘ سیکولرازم‘ لبرل ازم وغیرہ) نے ان کے ذہنوں میں پنجے

(۱) صحيح البخاري‘ كتاب فضائل القرآن‘ باب خيركم من تعلم القرآن وعلمه۔

گاڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سب سے نبرد آزما ہونے کے لیے بڑی اونچی سطح پر تحصیل علم وحکمت کی ضرورت ہے۔ یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے' یہ کوئی پارٹ ٹائم جاب نہیں ہے' لہٰذا اس کام کے لیے اپنی زندگیوں کو لگادو!

اس سے کم تر سطح پر عوام ہوتے ہیں جن کے دماغوں میں کوئی خناس نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ ڈاروِن ازم کس بلا کا نام ہے' مارکسزم کس پرندے کا نام ہے اور لاجیکل پازیٹوازم کیا چیز ہے۔ ان کو آپ سادہ انداز میں وعظ ونصیحت کریں گے تو وہ بھی کارگر ہوگی۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ خلوصِ دل سے آپ ان کو دعوت وتبلیغ کریں۔ یہ نہ ہو کہ آپ ان کو حقیر سمجھ کر ان پر اپنی نیکی کی دھونس جمار ہے ہوں۔ اگر آپ کا طرزِ عمل ایسا ہوگا تو مخاطب کا ضمیر repel کرے گا' اس لیے کہ دل' دل کو پہچانتا ہے کہ یہ میرے اوپر اپنی نیکی کی دھونس جمارہا ہے۔ لہٰذا خلوص سے ان کو دعوت دی جائے! اس حوالے سے یہ حدیث ہم پڑھ چکے ہیں: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) کہ دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے' لہٰذا آپ بھی دعوت دیتے وقت نصح وخیر خواہی کو ملحوظ رکھیں۔ اس بارے میں دوسری شرط یہ ہے کہ آپ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں اس پر خود بھی عمل پیرا ہوں' ورنہ آپ کی دعوت غیر مؤثر رہے گی۔

دعوت وتبلیغ کے ضمن میں تیسری ذیلی سطح اُن لوگوں کا مقابلہ اور ان کے خلاف جدوجہد کرنا ہے جو باقاعدہ ٹریننگ لے کر لوگوں کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جیسے عیسائی مبلغین لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور انہیں بہت فنڈز دیے جاتے ہیں۔ عیسائی مشنریز کے بجٹ حکومتوں کے بجٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ اسی طرح قادیانی مبلغین کی جو ٹریننگ ہوتی ہے اور انہیں جس طریقے سے پڑھایا سکھایا جاتا ہے' عام علماء ان سے بات نہیں کر سکتے جب تک خاص اس موضوع پر ان کو بھی ٹریننگ نہ دی گئی ہو۔ لہٰذا ان بگڑے تگڑوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کو بھی اسی طرح کی ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی۔

جہاد کی دوسری منزل اور سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵

دعوت و تبلیغ کے حوالے سے جد وجہد کے تین لیول ہو گئے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں ان تینوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ﴾(النحل:۱۲۵)

’’آپؐ دعوت دیجیے اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجیے بہت اچھے طریقے سے۔‘‘

اس آیت میں اپنے رب کے راستے کی طرف بلانے یعنی دعوت و تبلیغ کے تین لیول بیان کیے گئے ہیں:(i) بِالْحِكْمَةِ دانائی، حکمت، دلائل اور براہین کے ساتھ تبلیغ کرنا۔ یہ پہلی سطح کے لوگوں یعنی معاشرے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، دانشور اور اشرافیہ طبقے کے لیے ہے۔ (ii) وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اچھے وعظ اور اچھی نصیحت کے ساتھ تبلیغ کرنا، یعنی بات دل سے نکلے اور مخاطب کے دل میں اتر جائے۔ اس لیے کہ دماغ کی رکاوٹ (barrier) زیادہ تر پہلی سطح کے ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ہوتی ہے کہ وہ ہر بات کو دلائل کے ترازو میں تولتے ہیں۔ لہٰذا آپ پہلے ان کے دماغ کے بیریئر کو عبور کریں گے تو پھر ان کے دلوں تک پہنچیں گے۔ لہٰذا یہ وعظ و نصیحت پہلی سطح کے لیے نہیں، بلکہ عوام کے لیے ہے، اس لیے کہ ان میں عقل کا حجاب ہے ہی نہیں، تو دل سے نکلی بات دل پر جا اُترتی ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ اچھا وعظ وہ ہے جس پر انسان خود بھی عمل پیرا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴿۳۳﴾﴾(حٰمٓ السجدۃ) ’’اور اُس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں‘‘۔ یعنی وہ یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں کوئی بہت بڑا مربی یا مزکی ہوں یا یہ کہ میں روحانیت کے بہت اونچے مقام پر فائز ہوں، بلکہ وہ کہے کہ میں بھی عام مسلمان ہوں اور تمہیں اسلام کی دعوت دے رہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو کوئی سپرہیومن نہیں سمجھتا۔ میں

نے آپ کو کئی دفعہ نوٹ کرایا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی اپنے آپ کو سپر ہیومن کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ ''اربعین نووی'' کی حدیث نمبر ۲۹ میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ رات بھر کے سفر کی وجہ سے لوگ فجر کی نماز پڑھ کے جب چلے ہیں تو اپنی سواریوں پر اونگھ رہے تھے تو اس وجہ سے ان کی اونٹنیاں بے مہار ہو کر اِدھر اُدھر پھیل گئی ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَنَا کُنْتُ نَاعِسًا)) ہاں بھئی، میں تو خود بھی اونگھ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں اونگھ رہے تھے، بلکہ فرمایا کہ میں بھی اونگھ رہا تھا اور جو بشری تقاضے ہیں وہ مجھ پر بھی ہیں۔ لہٰذا دعوت کے ضمن میں یہ پہلو اہم ہے کہ عام آدمیوں کے اندر عام آدمی بن کر دعوت دی جائے، یہ نہ ہو کہ ان کے اوپر آپ اپنے تقویٰ، زہد اور درجہ احسان کا کوئی رعب گانٹھیں۔ اس طرزِ عمل سے وہ آپ کے قریب آنے کے بجائے، آپ سے بددل ہو کر اسلام سے اور دور ہو جائیں گے۔

تیسری چیز اس آیت میں یہ بیان ہوئی: ''جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ'' کہ بعض اوقات آپ کو مناظرہ اور مجادلہ بھی کرنا پڑے گا اور یہ دراصل تیسری سطح کے لوگوں کے لیے ہے جو تربیت یافتہ اور ماہر مبلغین ہوتے ہیں۔ جیسے انیسویں صدی کے اختتام پر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے ہندوستان میں پادری فنڈر کو شکست دی تھی۔ ورنہ اگر وہ بات نہ ہوتی تو شاید ہندوستان کے سارے مسلمان عیسائی ہو جاتے۔ فنڈر کلکتہ سے چل کر دہلی تک آ گیا اور ہر جگہ علماء کو شکستیں دیں، اس لیے کہ ہمارے علماء تو بائبل پڑھتے ہی نہیں، نہ تورات پڑھی اور نہ انجیل، جبکہ عیسائی پادری تو پورے قرآن مجید کو پڑھ کر، سمجھ کر، عربی زبان سیکھ کر اور پوری طرح تیار ہو کر آتے تھے تو ہمارے علماء ان کا کیسے مقابلہ کر سکتے تھے؟ مناظرہ کے لیے پہلے مکمل تیاری ہونی چاہیے۔ اگر وہ آپ کے قرآن پر حملہ کر رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ انجیل کے کون کون سے مقامات ہیں جہاں پر آپ انہیں جھول دکھا سکتے ہیں۔ اِس دور میں شیخ احمد دیدات مرحوم نے یہ کام کیا اور اب ڈاکٹر ذاکر نائیک یہ کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک خاص طور پر ہندومت کے خلاف ان کی کتابوں اور ان کے حوالوں سے ان پر حجت قائم کر رہے ہیں۔ تو اس

حوالے سے فرمایا گیا کہ اگر کبھی مجادلہ اور مناظرہ کی نوبت آئے تو وہ اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔ اگر مدمقابل تمہیں گالی دے' تم تب بھی گالی مت دینا۔ وہ اللہ کو برا بھلا کہیں تو تم ان کے معبودوں کو برا بھلامت کہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی حمیت بھڑک اٹھے اور وہ تمہاری بات ہی سننے سے انکار کر دیں' بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ اچھے طریقے سے ان کے جذبات واحساسات کا پاس کرتے ہوئے ان سے بات کی جائے۔ اس طرح یہ دوسرے لیول کے جہاد کے تین sub level ہو گئے: (i) تعلیم یافتہ اور اشرافیہ طبقے کو دعوت و تبلیغ' (ii) عوام الناس کو دعوت وتبلیغ' اور (iii) تربیت یافتہ' ایکسپرٹ اور بگڑے تگڑوں کو دعوت وتبلیغ۔

جہاد کی تیسری منزل اور اس کی تین ذیلی سطحیں

اب آیئے جہاد کی تیسری منزل کی طرف اور وہ ہے انقلاب برپا کر کے پرانے نظام کو ختم کرنا اور اللہ کے دین کو قائم کرنا۔ یہ سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ جہاد کا درخت جو یقین والے ایمان سے پھوٹا تھا' اب وہ اپنی چوٹی کو پہنچ رہا ہے۔ ہر نظام کے ساتھ کچھ لوگوں کے وابستہ مفادات (vested interests) ہوتے ہیں اور وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے نظام کو کوئی نہ چھیڑے۔ کیا جاگیردار کبھی پسند کرے گا کہ جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا جائے؟ دنیا کے اندر جو بھی نظام رائج ہیں ان میں چند طبقات کو خاص مراعات حاصل ہوتی ہیں اور وہ کبھی بھی اپنی مراعات چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس مرحلہ میں تصادم اور ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس سے پہلے تو سارا معاملہ اندر ہی اندر ہو رہا تھا۔ پہلے مرحلے پر نفس اور شیطان کے خلاف جہاد تو اندر ہی اندر تھا۔ دوسرے نمبر پر باطل نظریات اور عقائد کے خلاف جہاد میں بھی جنگ اور تصادم نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی آپ کو گالی دے جائے گا' برا بھلا کہہ جائے گا' یا جیسے ہمارے ہاں تبلیغی جماعت کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے یا ان کے بستر تہہ کروا کر نکال باہر کیے جاتے ہیں' مگر اس مرحلے میں کوئی مارتا نہیں۔ لیکن نظام کو بدلنے کے لیے ہتھیلی پر جان رکھ کر میدان میں آنا پڑے گا۔

جہاد کی اس منزل کی بھی آگے تین ذیلی سطحیں ہیں۔ پہلا ہے غیر فعال مزاحمت (passive resistance)‘ یعنی اگر وہ تمہیں ٹارچر کریں‘ ذہنی وجسمانی تشدد کریں تو پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اسے برداشت کرو اور کوئی جوابی کارروائی نہ کرو۔ بارہ سال مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے لیے یہی حکم تھا کہ چاہے کافر تمہارے ٹکڑے کر دیں یا تمہیں زندہ جلا دیں‘ تم نے اپنے دفاع میں بھی ہاتھ نہیں اٹھانا! یہ اس تصادم کا پہلا مرحلہ تھا اور یہی اصل میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ سیرتِ مطہرہ کے اس پہلو کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں ہے۔ میری کتاب ’’منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ‘‘ کا مطالعہ کیجیے اور جانیے کہ رسول اللہ ﷺ کے انقلاب کا منہج کیا تھا اور اس کے مراحل کون کون سے تھے۔ ابتدائی بارہ برس تک حکم یہی تھا کہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کرنی!

اس زمانے میں جور وستم (persecution) کا ایک انداز زبانی (verbal) بھی تھا۔ مثلاً کسی نے آ کے کسی مسلمان کو گالی دی ہے‘ کسی نے کہا کہ پاگل ہو گئے ہو یا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ کو بھی (نعوذ باللہ) یہ سب کہا گیا کہ پاگل ہو گئے ہیں‘ مجنون ہیں‘ ان پر جادو کا اثر ہے‘ وغیرہ۔ یہ سب کہا گیا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ۝۱۰﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر آپ صبر کیجیے اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے‘‘۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کو ان جملوں سے سخت تکلیف بھی پہنچتی تھی۔ سورۃ الحجر کے آخر میں فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ یَضِیۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ۝۹۷﴾ ’’اور ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے ان کی باتوں سے‘‘۔ یعنی آپ ﷺ کا دل دکھتا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جو میرے قدموں میں اپنی آنکھیں بچھاتے تھے اور مجھے الصادق اور الامین کہتے تھے‘ آج یہ مجھے جھوٹا اور شاعر کہہ رہے ہیں۔ اس پر آپ کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت حکم یہی تھا کہ کفار کی طرف سے جو بھی اذیت آئے‘ چاہے وہ زبانی ہو یا جسمانی‘ بہرصورت اسے جھیلو اور برداشت کرو۔ یہ جہاد کے تیسرے مرحلے کی پہلی ذیلی سطح ہے۔

اس کے بعد ایک وقت آتا ہے جبکہ داعی کے ساتھ تعداد کافی ہو جاتی ہے اور اب اس کے لیے اس نظام کو للکارنا ممکن ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دو چار سو آدمیوں سے نظام کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل کے حساب سے تو لاکھوں آدمی چاہئیں۔ اب اگر داعی کو اندازہ ہے کہ معتد بہ تعداد موجود ہے تو اب وہ اس نظام کے خلاف کوئی عملی حرکت کرے اور فعال مزاحمت (active resistance) کا آغاز کرے۔ یہ ہے جہاد کے تیسرے مرحلے کی دوسری ذیلی سطح۔

اس کے بعد آخری سطح پر آ کر حق و باطل کا تصادم ہوگا اور اس تصادم میں جانیں بھی جائیں گی۔ یہ دو طرفہ تصادم بھی ہو سکتا ہے، جیسے ہمیں حضور اکرم ﷺ کی سیرت میں نظر آتا ہے، اور یہ یک طرفہ تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ آج کے دور میں یک طرفہ تصادم اور یک طرفہ جنگ کی شکل سامنے آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ کسی پر ہاتھ نہ اُٹھائیں لیکن نظام (system) کو بلاک کر دیں۔ یعنی دھرنا دیں، گھیراؤ کریں اور نظام کو مفلوج کر دیں۔ یہ نوبت پاکستان میں آج تک نہیں آئی، البتہ اہل تشیع نے ایک دفعہ یہ کر کے دکھایا ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں پچاس ہزار کی تعداد میں انہوں نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا اور کہا کہ یہاں سے ہم تب تک نہیں اٹھیں گے جب تک ہمیں یہ گارنٹی نہ دی جائے کہ ہم سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ زکوٰۃ ہم آپ کو نہیں دیں گے، ہم جہاں دیتے ہیں وہیں دیں گے —— ان کی زکوٰۃ ان کے مراجع یعنی ایران اور عراق میں موجود ان کے بڑے بڑے علماء کو جاتی ہے اور وہ عام آدمی کے لیے نہیں ہے —— بہرحال انہوں نے یہ کر کے دکھایا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ضیاء الحق کو ان کا مطالبہ ماننا پڑا۔

آج کے دور میں یک طرفہ تصادم کی یہ نئی شکل پیدا ہوئی ہے۔ یوکرائن میں اسی طریقے سے انقلاب آ گیا۔ جب لوگوں کے سیلاب نے پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا تو ان کا صدر پچھلے دروازے سے جان بچا کر بھاگ گیا۔ یہی جارجیا میں ہوا اور یہی لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں ہو چکا ہے۔ یہ یک طرفہ تصادم دنیا میں ہو رہا ہے، لیکن ہمیں اپنی جان دینے کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت حکم دے اور آپ

کے اوپر گولیاں چل جائیں اور آپ کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑے ۔

جان دی' دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اب یہ جہاد سے آگے بڑھ کر قتال کا مرحلہ آ گیا اور یہ جہاد کا آخری اور سب سے اونچا درجہ ہے۔ اس کے لیے آغازِ خطاب میں سورۃ الصف کی یہ آیت بھی تلاوت کی گئی تھی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝۴﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔''

دینی فرائض کے حوالے سے میں نے تین منزلہ عمارت کی مثال دی ہے۔ اس میں ظاہر بات ہے کہ پہلی منزل سے اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھی چاہیے تو وہ جہاد کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسری منزل سے اوپر جانے کے لیے پھر آپ کو سیڑھی چاہیے تو یہ جہاد کا دوسرا مرحلہ ہے۔ پھر آخری منزل پر جانے کے لیے بھی سیڑھی چاہیے تو وہ جہاد کا تیسرا مرحلہ ہے۔

جہاد کا ذریعہ: قرآن مجید!

آخری بات یہ ہے کہ آپ کے پاس جہاد کرنے کے لیے ہتھیار اور ذریعہ کیا ہے؟ —— یہ قرآن مجید ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پڑھو اور اسے اپنے اندر اتارو۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۝۴﴾

''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔ (یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔ یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جایئے۔''

یہ قرآن نور ہے اور جتنا نور باطن کے اندر جائے گا اتنی ہی اندر کی تاریکیاں چھٹتی جائیں

گی۔ نفس کے خلاف جہاد کے لیے ہتھیار بھی قرآن ہے اور دعوت و تبلیغ میں ہتھیار بھی قرآن ہی ہے' اس لیے کہ قرآن میں حکمت ہے: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:۳۹) ''یہ ہے جو (اے محمدﷺ!) آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی کی ہے حکمت میں سے''۔ قرآن سے حکمت سیکھو اور حکمت کی سطح پر دعوت و تبلیغ دو۔ قرآن سے وعظ حاصل کرو اور اس وعظ کے ذریعے سے دعوت و تبلیغ دو۔ قرآن مجید سے سمجھو کہ مشرکین کے خلاف کیسے مناظرہ ہوا' منافقین کے ساتھ کیسے ہوا' اہل کتاب کے ساتھ کیسے ہوا اور پھر اسی کے حساب سے خود بھی تیاری کرو۔ یہ سب قرآن مجید میں موجود ہے۔ گویا جہاد کے تینوں levels کے لیے ہتھیار قرآن ہے۔ اسی لیے سورۃ الفرقان میں فرمایا گیا: ﴿فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِيۡرًا ﴿۵۲﴾﴾ ''تو (اے نبیﷺ!) آپ ان کفار کا کہنا نہ مانیے اور آپ ان کے ساتھ جہاد کریں اس (قرآن) کے ذریعے سے بڑا جہاد''۔ اکیلے میں جو جہاد ہو رہا تھا — چاہے وہ نفس کے خلاف تھا' چاہے وہ باطل عقائد اور باطل لغویات کے خلاف تھا — وہ جہاد بالقرآن تھا' یعنی قرآن کے ذریعے سے جہاد ہو رہا تھا۔

جہاد کے لیے اجتماعیت کی ضرورت

ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ پہلی سطح کے جہاد کے لیے کسی جماعت یا کسی اجتماعیت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو اپنے ہی اندر سے جنگ کرنی ہے۔ میں آپ کے نفس کے خلاف جہاد نہیں کر سکتا اور نہ آپ میرے نفس کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں۔ البتہ اگر ایک جماعت موجود ہو تو اس سے سہولت ہو جاتی ہے۔ آپ بھی اسی کشمکش میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی لگا ہوا ہوں تو میں دیکھوں گا کہ یہ میرا بھائی آگے نکل گیا ہے تو میں بھی زیادہ کوشش کروں گا۔ اسی طرح دوسرے مرحلے پر یعنی دعوت و تبلیغ کے لیے بھی جماعت لازم نہیں ہے۔ البتہ ادارے ہونے چاہئیں۔ جیسے ہماری انجمن خدام القرآن ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اور بھی بہت سی انجمنیں ہیں' مثلاً اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (IRF) ہے جو آج بہت بڑا ادارہ بن گیا ہے۔ الہدیٰ ایک

ادارہ ہے جو خواتین کے اندر قرآن مجید کا علم پھیلا رہا ہے۔لیکن تیسرے مرحلے پر یعنی جہاد بالسیف' جہاد بالید — جس کا نام قتال ہے — کے لیے جماعت شرطِ لازم ہے۔ یہ انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا' بلکہ اس کے لیے سمع و طاعت والی جماعت ضروری ہے۔حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اللّٰهُ اَمَرَنِي بِهِنَّ : بِالْجَمَاعَةِ، وَالسَّمْعِ، وَالطَّاعَةِ، وَالْهِجْرَةِ، وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱)

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ یعنی جماعت' سننا' اطاعت کرنا' ہجرت' اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

یہ جماعت کا لزوم اصل میں آخری درجے کے لیے ہے۔ پہلے درجے کے لیے جماعت ضروری نہیں ہے' صرف صحبتِ صالح کافی ہے۔ دوسرے درجے کے لیے ادارے' انجمنیں' فاؤنڈیشن اور نشر و اشاعت کے ادارے وغیرہ کافی ہیں۔لیکن تیسرے لیول کا جہاد جماعت کی شکل میں ہوگا اور جماعت اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر قائم کرنی ہے تو وہ بیعت کی بنیاد پر ہوگی۔حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ، وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰى اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۲)

''ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحابِ اختیار سے

(۱) سنن الترمذی' ابواب الامثال عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔ ومسند احمد' مسند الشامیین:۱۶۷۱۸ واللفظ لہ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس 'وکتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورًا تنکرونھا۔وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامیر فی غیر معصیۃ ......

جھگڑیں گے نہیں، لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے' اور اللہ کے معاملے میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے خوف رہیں گے۔''

فرائض دینی کے جامع تصور کے حوالے سے جو کمی رہ گئی تھی' وہ اب پوری ہوگئی ہے' بایں طور کہ میں نے اس سہ منزلہ عمارت میں ایک سیڑھی کا اضافہ کیا ہے اور وہ جہاد ہے۔ پھر اس کے تین لیولز اور آگے ان تین لیولز کے سب لیولز ہیں۔لیکن ان میں مشترک بات یہ ہے کہ ان ساری سطحوں پر جہاد میں اصل ذریعہ قرآن ہے اور اہم بات یہ ہے کہ تیسرے مرحلے میں جان ہتھیلی پر رکھ کر (چاہے دوطرفہ جنگ ہو یا یکطرفہ) اپنی جان دینے کے لیے تیاری کرنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کے فرائض کو سمجھنے اور پھر اس پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِOO

حدیث
31

زہد کی حقیقت وفضیلت

۲۷ جون ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ (القيامة)

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (الاعلى)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

(الكهف)

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ ﷜ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهُ اَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَاَحَبَّنِي النَّاسُ، فَقَالَ:

((اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ، وَازْهَدْ فِيْمَا فِيْ اَيْدِي النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ)) (۱)

سیدنا ابوالعباس سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیے' جب میں اسے بجا لاؤں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ' اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا' اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیاز رہو' لوگ تم سے محبت کریں گے۔''

---

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الزهد' باب الزهد في الدنيا۔

معزز سامعین کرام!

دینِ اسلام کی تعلیمات کے عملی پہلو کا لُبِ لُباب اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ انسان طالبِ دنیا نہ رہے، طالبِ آخرت اور طالبِ عقبیٰ بن جائے۔ یہ گویا ایک طرح کا لٹمس ٹیسٹ ہے بایں طور کہ کسی شخص کی ایمانی کیفیت کے بارے میں اندازہ کرنا ہو تو اس کی طلبِ دنیا اور طلبِ عقبیٰ کا حال دیکھ لیجیے۔

دنیوی واُخروی زندگی کی حیثیت اور ہماری ترجیحات

دُنیوی اور اُخروی زندگی کی کیا حیثیت ہے اور ہماری ترجیحات کیا ہیں؟ یہ موضوع قرآنِ مجید کے بے شمار مقامات پر آیا ہے۔ ''مُشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر میں نے ابتدا میں تین آیات کی تلاوت کی ہے۔ سورۃ القیامہ میں اللہ تعالیٰ شکوہ کے انداز میں نوعِ انسانی سے کہہ رہے ہیں: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝٢٠ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝٢١﴾ ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''۔ یعنی تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم لوگ ''حُبِ عاجلہ'' میں مبتلا ہو، اپنی دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال و اسباب سے محبت کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں آخرت کو بالکل ہی نظر انداز کیے ہوئے ہو۔ پھر یہی بات سورۃ الاعلیٰ میں بایں الفاظ فرمائی گئی: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝١٧﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی''۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا فانی اور چند روزہ ہے۔ اول تو پوری دنیا ہی فانی ہے اور ایک دن پوری کائنات نے ختم ہو جانا ہے، پھر اس میں ہماری کیا حیثیت ہے۔ ہماری زندگی تو بس چند سال کی ہے، جبکہ اللہ کا ایک دن ہزار برس کا ہے، لیکن ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ''ترجیح'' دیتے ہیں۔ اس لفظ ترجیح کو نوٹ کیجیے۔ یہ بات واضح ہے کہ ہمارا دین یہ نہیں کہتا کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ ترکِ دنیا تو رہبانیت ہے اور وہ اسلام میں نہیں ہے۔ لیکن مطلوب طرزِ عمل یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کو ترجیح دو اور اس ضمن میں کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ ع ''بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں!''

دنیا کا بناؤ سنگھار ذریعۂ آزمائش ہے!

تیسری آیت جو میں نے ابتدا میں تلاوت کی' وہ سورۃ الکہف کی آیت ۷ ہے اور اس میں یہ بات بڑے ہی کانٹے دار انداز میں کہی گئی ہے — سورۃ الکہف کے بارے میں حضورﷺ نے فرمایا ہے کہ دجالی فتنے سے بچنا چاہتے ہو تو سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیات کی تلاوت کرو۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آخری آیات کی تلاوت کرو اور بعض روایات میں آتا ہے کہ پوری سورۃ الکہف کی تلاوت کرو۔ سورۃ الکہف اور فتنہ دجال کے مابین کیا ربط و تعلق ہے' اس پر میرے مفصل دروس موجود ہیں جن کا مطالعہ مفید رہے گا — اس سورۃ کے پہلے رکوع میں یہ آیت آئی ہے: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾ ''یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار تاکہ انہیں ہم آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل میں''۔ دُنیا کے یہ ظاہری ٹھاٹھ باٹھ دراصل انسان کی آزمائش کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایک طرف دنیا کی یہ سب دلچسپیاں اور رنگینیاں ہیں اور دوسری طرف اللہ اور اس کے احکام ہیں۔ انسان کے سامنے یہ دونوں راستے کھلے چھوڑ کر دراصل یہ دیکھنا مقصود ہے کہ وہ ان میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے' اس عروس ہزار داماد کے عشق کے اندر مبتلا ہو کر ساری دوڑ دھوپ اور دن رات کی محنت و مشقت اسی کے لیے کرتا ہے یا اپنے خالق و مالک کو پہچانتے ہوئے اس کے احکام کی تعمیل کو اپنی زندگی کا اصل مقصود سمجھتا ہے اور آخرت کا طالب ہو کر دنیا کو صرف بقدرِ ضرورت استعمال کرتا ہے۔

اس بات کو بہت پیارے انداز میں ایک شعر میں یوں کہا گیا ہے:

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

ایک طرف ہمارے محبوبِ حقیقی کا دمکتا ہوا روشن چہرہ ہے اور دوسری طرف یہ دنیا کی روشنی اور چمک ہے جو حقیقی نہیں ہے' اب دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ پروانہ اُدھر جا رہا ہے یا اِدھر آ رہا ہے۔

اسی آزمائش کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو زیبائش اور آرائش سے نوازا ہے اور یہ آرائش وزیبائش آج اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہ دنیا اتنی حسین کبھی بھی نہیں تھی جتنی کہ آج ہے۔ دنیا کا حسن دبئی' یورپ' امریکہ' ابوظبی اور سعودی عرب میں جا کے دیکھئے' وہاں آپ کو دنیا کی آرائش وزیبائش اپنی انتہا پر نظر آئے گی۔ پھر ظاہر بات ہے کہ آدمی اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اس دنیا کو دلہن کی طرح بنا وسنگھار کر کے ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے اور ہمارا امتحان یہ ہے کہ ہماری ساری توجہ اور محبت اسی پر مرکوز ہو جاتی ہے یا ہماری محبت کا مرکز ومحور اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرار پاتا ہے۔

زہد: محبوبِ الٰہی بننے کا خصوصی ذریعہ

اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث (حدیث نمبر ۳۱) بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔ سیدنا ابوالعباس سہل بن سعد الساعدی ؓ فرماتے ہیں: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ! ''ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ!'' دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُہٗ اَحَبَّنِیَ اللّٰہُ وَاَحَبَّنِی النَّاس ''میری راہنمائی فرمائیے کسی ایسے عمل کی طرف کہ جب میں اس پر عمل کرلوں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں''۔ یعنی کوئی ایسا عمل بتلایئے کہ جس کے کرنے سے میں اللہ کا بھی محبوب بن جاؤں اور لوگوں کا بھی محبوب بن جاؤں۔ تمنا بہت اچھی اور بہت عمدہ ہے۔ صحابیؓ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں کی فکر تھی اور انہوں نے ترجیح آخرت کو دی کہ اللہ کو مقدم رکھا' کہ میں اللہ کا بھی محبوب بن جاؤں اور دنیا کا بھی محبوب بن جاؤں۔ اس کے جواب میں محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِزْھَدْ فِی الدُّنْیَا ' یُحِبَّکَ اللّٰہُ)) ''دنیا سے زہد اختیار کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا''۔ یعنی دنیا کی آسائشوں' آرائشوں' عیاشیوں' لذتوں سے بچو' انہیں کم سے کم رکھو تو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

ہمارے ہاں عموماً زہد وقناعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قناعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ کم سے کم پر راضی رہنا اور زیادہ کی ہوس کا نہ ہونا' یعنی اپنے سے زیادہ والوں کو دیکھ کر کوئی

رشک نہ آئے کہ ان کے اوپر تو اللہ کی بڑی رحمتیں ہیں۔ بس یہ جذبہ ہو کہ اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے اور جس حال پر مجھے رکھا ہے اس پر میں شکر ادا کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اگر وہ مجھے زیادہ دے دیتا تو میرے اندر اخلاقی طور پر زوال آ جاتا اور میں عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ لہٰذا میرے لیے یہ کمی درحقیقت بہت بڑی غنیمت ہے اور اسی میں میرے لیے عافیت ہے۔

دنیا کی بے بضاعتی

اب اس کے ضمن میں' میں دو اور احادیث آپ کو سناتا ہوں جو بہت ہی عمدہ ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جوامع الکلم میں سے ہیں۔ پہلی حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے میرے کندھے سے پکڑا اور فرمایا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))(۱) ''دیکھو دنیا میں ایسے رہو گویا تم اجنبی ہو یا راستہ چلنے والے مسافر ہو''۔ یعنی دنیا کے معیارات کے اعتبار سے نامور و مشہور ہو جانا' صاحبِ اقتدار ہو جانا' صاحبِ ثروت ہو جانا' یہ مطلوب نہیں ہونا چاہیے' بلکہ دنیا میں ایسے رہنا چاہیے جیسے کہ اجنبی ہو۔ یہ دنیا تمہارا وطن نہیں ہے' بلکہ تمہارا اصل وطن اور تمہارا اصل گھر تو آخرت میں ہے۔ یہ دنیا تو عارضی ٹھکانہ ہے اور تمہیں یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ سورۃ الملک میں فرمایا: ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت۲) ''(اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے''۔ کبھی اللہ دے کر آزماتا ہے کہ بندہ شکر کرتا ہے یا نہیں اور کبھی چھین کر آزماتا ہے کہ صبر کرتا ہے یا نہیں! صابر و شاکر کے الفاظ اردو میں بھی ہمارے ہاں جڑ کر آتے ہیں۔ اگر کوئی تکلیف آ گئی یا کوئی نقصان ہو گیا یا کوئی بیماری آ گئی تو انسان اسے اللہ کی طرف سے سمجھتے ہوئے صبر کرے اور کوئی بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آنے پائے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا:

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ وسنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی قصر الامل۔

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴿٢٣﴾﴾

’’نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری اپنی جانوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے‘اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔تاکہ تم افسوس نہ کیا کرو اُس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے اور اس پر اِترایا نہ کرو جو وہ تمہیں دے دے۔ اور اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں اِترانے والے اور فخر کرنے والے۔‘‘

شکر کے لوازم

اس کے برعکس اگر اللہ نے انسان کو اپنے انعامات سے نوازا ہے تو پھر انسان کے اندر شکر کے جذبات ہونے چاہئیں۔ امام راغبؒ کے مطابق شکر میں تین چیزیں شامل ہیں: شکر بالقلب‘ شکر باللسان اور شکر بالجوارح۔ دل میں اللہ کے احسان کی عظمت قائم ہو جائے‘ یہ شکر بالقلب ہے۔ پھر احسان مندی کے جذبات دل میں سے اُبھریں جیسے کسی چشمے میں سے پانی اُبلتا ہے اور وہ جذبات زبان سے الفاظ کی صورت میں ادا ہوں تو یہ شکر باللسان ہے۔آپ بھوکے تھے‘ کمزوری محسوس کر رہے تھے‘ اللہ نے کھانے کو کچھ دے دیا تو اب شکر ادا کرو اور اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا سکھائی ہے: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)) ’’کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے (بھوک میں) کھانا کھلایا اور (پیاس میں) پانی پلایا اور مجھے مسلمانوں میں سے بنایا‘‘۔ اسی طرح باقی نعمتوں پر بھی اللہ کی حمد اور اللہ کا شکر لازمی ہے‘ یہاں تک کہ آپ بیت الخلاء میں گئے‘ فراغت ہوگئی‘ پہلے طبیعت بوجھل تھی‘ اب طبیعت کے اندر انشراح پیدا ہوگیا تو آپ باہر نکل کر یہ دعا پڑھیں: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ)) ’’کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ سے اذیت بخش چیز کو دور کر دیا اور مجھے عافیت بخشی‘‘۔ سوچئے اگر آپ کا پیشاب رک

جائے تو آپ کا کیا حشر ہوگا؟ وہ حشر جو ہوگا سو ہوگا‘ لیکن اس کے ساتھ جو زہریلے جراثیم‘ جس کو انسان پیشاب کے ذریعے سے خارج کرتا ہے‘ جسم کے اندر ہی رہیں گے تو وہ آپ کے اندر ایک قیامت برپا کر دیں گے۔ اسی طرح اگر آپ کو اجابت نہیں ہو رہی‘ شدید قبض ہوگئی ہے تو اس صورت میں بھی آپ کا حال برا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس دعا میں کتنے پیارے الفاظ آئے ہیں کہ ’’اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ‘‘ (مجھ سے اذیت بخش چیز کو دور کر دیا اور مجھے عافیت بخشی) —— بہرحال زبان سے شکر کے جذبات کا اظہار کرنا شکر باللسان ہے۔

اسی طرح ایک شکر بالجوارح ہے‘ یعنی اپنے جسم کے تمام اعضاء سے شکر کرنا اور اللہ کی تمام نعمتوں کو صحیح صحیح استعمال کرنا۔ اگر آپ نے کسی نعمت کو غلط استعمال کیا تو یہ ناشکری اور کفرانِ نعمت ہوگا۔ یا اللہ نے آپ کو ایک نعمت دی اور آپ نے وہ نعمت استعمال ہی نہیں کی تو یہ بھی کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتا ہے۔ بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام قرآن مجید ہے اور اگر آپ نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی‘ تو یہ سب سے بڑا کفرانِ نعمت ہے‘ اس لیے کہ نعمتِ ہدایت سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔ ہدایت وہ نعمت ہے کہ اس کے بغیر کوئی شے نعمت نہیں رہتی۔ آپ اولاد کو‘ دولت کو‘ اقتدار کو اور شہرت کو نعمت سمجھتے ہیں‘ لیکن اگر ہدایت نہیں ہے تو یہ چیزیں نعمت نہیں رہیں گی‘ بلکہ زحمت بن جائیں گی اور آپ ان کا غلط استعمال کریں گے۔ پھر آپ اولاد کی بھی غلط تربیت کریں گے تو کل قیامت کے دن اللہ پوچھے گا کہ یہ تمہارے پاس میری امانت تھی‘ تم نے اس کی کیسے تربیت کی؟ تم نے اسے میرا بندہ بنا کر اٹھانے کی کوشش کی یا دنیا کی طلب میں لگا کر مجھ سے غافل بنا دیا؟ خود بھی اسی میں لگے رہے اور اسے بھی لگا دیا تو یہ ہے نعمت کا کفران‘ جبکہ نعمت کا صحیح صحیح استعمال کرنا‘ یہ ہے شکر بالجوارح۔

دنیا ہمارا اصل وطن‘ گھر اور منزل نہیں ہے!

دوسری حدیث بھی سن لیجیے۔ یہ بھی بڑی پیاری حدیث ہے۔ حضرت علقمہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِي جَنْبِهٖ‘

فَقُلْنَا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوِ اتَّخَذْنَا لَکَ وِطَاءً؟ فَقَالَ ''ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ بورے پر سو کر اُٹھے تو آپؐ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات تھے۔ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم آپؐ کے لیے ایک بچھونا بنا دیں''۔آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا لِی وَمَا لِلدُّنْیَا مَا أَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا)) (۱)

''مجھے دنیا سے کیا غرض' میں تو دنیا میں اس طرح ہوں کہ جیسے کوئی سوار کسی درخت کے نیچے سائے کی وجہ سے بیٹھ گیا پھر وہاں سے روانہ ہوگیا اور درخت کو چھوڑ دیا۔''

ظاہر بات ہے کہ وہ درخت اس سوار کا عارضی قیام تھا۔وہ اُس کا وطن' اُس کا گھر یا اس کی منزل نہیں تھی۔اسی طرح سے یہ دنیا بھی ہماری منزل' ہمارا گھر' اور ہمارا وطن نہیں ہے۔ ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّمَا خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ وَالدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ)) (۲) ''تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور یہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے''۔پھر اس دنیا میں ہمارا امتحان بھی ہو رہا ہے۔بہرحال اللہ تعالیٰ نے ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کی تمام چیزیں اسی دنیا میں رکھی ہیں' ان کو استعمال کرو' لیکن اس دنیا کو مطلوب و مقصود اور محبوب نہ بنالو۔

ہمارے علماء اس کی بڑی پیاری مثال دیتے ہیں کہ ہم دنیا میں کشتی کی مانند ہیں۔ کشتی پانی میں ہے تو عافیت ہے' لیکن اگر کشتی میں پانی آ گیا تو اب تباہی و بربادی ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں مسافر اور سوار کی طرح رہو جو کسی درخت کے سائے میں آرام کرنے کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے اور پھر وہ اس درخت کو چھوڑ کر اپنی اصل منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے۔

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپؐ پر عجیب کیفیت طاری ہے جیسے آپؐ کسی

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی اخذ المال بحقه۔

(۲) رواه البیهقی فی شعب الایمان۔

چیز کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر اپنے سے دور کر رہے ہوں۔ میں کچھ دیر تک دیکھتا رہا' پھر میں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! یہ کیا معاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دنیا ایک نہایت خوبصورت عورت کی شکل میں میرے سامنے لائی گئی' تو میں اسے دھکے دے رہا تھا کہ مجھے تم سے کیا سروکار! تو یہ ہے اصل میں زہد فی الدنیا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ کے محبوب بن جاؤ تو دنیا میں زہد اختیار کرو۔

انسان کیسے لوگوں کا محبوب بن سکتا ہے؟

اگلا معاملہ اس سے بھی زیادہ عملی ہے۔ اخلاقیات کے اندر یوں سمجھئے کہ یہ بلند ترین تعلیمات میں سے ہے۔ انسان لوگوں کا محبوب کیسے بن سکتا ہے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَازْهَدْ فِيمَا فِيْ اَيْدِى النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ)) ''اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیاز رہو' لوگ تم سے محبت کریں گے''۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دولت مند کو دیکھ کر یہ حسرت پیدا ہو جائے کہ یہ دولت میرے پاس کیوں نہیں؟ یا حسد تو نہ آئے' لیکن رشک کے انداز میں ایسی بات آ جائے تو یہ احساس زہد کے خلاف ہو جائے گا۔ اگرچہ رشک کرنا حرام نہیں ہے' حسد حرام ہے' لیکن رشک زہد کے خلاف ہے جو ایک بہت اونچا رتبہ ہے۔

اگر انسان لوگوں کے مال و دولت سے بے نیاز رہے اور دولت مند دیکھے کہ یہ آدمی میرے پاس میری دولت کی وجہ سے نہیں آیا' یہ مجھے کوئی کلمہ خیر کہنے کے لیے آیا ہے' یا حقوق العباد میں سے کسی حق کو ادا کرنے کی تلقین کرنے کے لیے آیا ہے' یا میں مریض تھا تو میری عیادت کرنے آ گیا ہے' اسے میری دولت سے کوئی سروکار نہیں' اس کے اندر میں نے کوئی لالچ محسوس نہیں کی اور اس کی آنکھوں کے اندر مجھے کوئی ہوس نظر نہیں آ رہی۔ اگر ایسا ہو گا تو وہ شخص آپ سے محبت کرے گا اور آپ کا مقام اس کی نگاہ میں بلند ہو جائے گا۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو وہ محسوس کرے گا کہ یہ میری دولت سے مرعوب ہو گیا ہے' یا میرے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر اس کے دل میں حسرت پیدا ہوئی ہے' یا یہ تو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے میری قیمتی چیزوں کو دیکھ رہا ہے تو وہ آپ سے محبت تو دور

کی بات ہے، نفرت کرے گا۔

الغرض، زیر مطالعہ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آپ بحیثیت مجموعی دنیا، دنیا کی زندگی، دنیا کی آسائشوں، آرائشوں، نعمتوں، لذتوں اور دنیا کی تعیّشات سے بچیں تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور زہد اور بے نیازی اختیار کریں ان چیزوں کے بارے میں جو لوگوں کے پاس ہیں تو اس سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی وقعت بڑھ جائے گی اور لوگ آپ سے محبت کریں گے۔ یہ درحقیقت ہمارے لیے اخلاقی تعلیم کے اعتبار سے کانٹے کی بات ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی آرائش و زیبائش اور دنیا کے ساز و سامان سے ہماری حفاظت فرمائے اور صحیح معنوں میں ہمیں اس حدیث کا مصداق بنائے۔ آمین یارب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
32
33

اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت
اور اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی

۱۳ جون ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات:۱۳)

وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ○ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ سَعْدِ بْنِ سِنَانِ الْخُدْرِیِّ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :

((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)) (۱)

سیدنا ابوسعید سعد بن سنان خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ خود نقصان اٹھاؤ!''

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :

((لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاھُمْ، لَادَّعٰی رِجَالٌ اَمْوَالَ قَوْمٍ وَّدِمَاءَ ھُمْ، وَلٰکِنَّ الْبَیِّنَۃَ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ)) (۲)

سیدنا ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) حدیث حسن رواہ ابن ماجۃ والدارقطنی وغیرھما مسندا، ورواہ مالک فی المؤطا عن عمرو بن یحیی عن ابیہ عن النبی ﷺ مُرسَلًا فاسقط اباسعید، ولہ طرق یقوی بعضھا ببعض

(۲) حدیث حسن، رواہ البیھقی وغیرہ ھکذا، وبعضہ فی الصحیحین

''اگر لوگوں کو ان کے دعویٰ کے مطابق (بلاتحقیق) دے دیا جائے تو لوگ دوسروں کے اموال اور خون پر دعویٰ کرنے لگیں' لہٰذا اصول یہ ہے کہ مدعی ثبوت پیش کرے اور مدعا علیہ اگر انکاری ہو تو قسم اٹھائے۔''

معزز سامعین کرام!

اربعین نووی کی احادیث کا سلسلہ وار مطالعہ جاری ہے اور آج ہم حدیث ۳۲ اور ۳۳ کا مطالعہ کریں گے ـــــ احادیث کے مطالعہ سے پہلے جان لیجیے کہ اس مجموعہ احادیث کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس میں دین اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ احادیث میں صرف ۴۲ احادیث ہیں' لیکن دین اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس میں بیان ہونے سے رہ گیا ہو۔ دین کی اصل روح کیا ہے' دین کا اصل ڈھانچہ کیا ہے' دین کا پورا نقشہ درخت یا عمارت کی صورت میں کیا ہے' اخلاقیات کے کیا اصول ہیں' شریعت کی بنیاد کیا ہے' حلال اور حرام کے مابین مشتبہات کے بارے میں کیا رویہ ہونا چاہیے وغیرہ' یہ سب اس مجموعہ میں موجود ہے۔

آج ہمارے زیر مطالعہ دو احادیث ہیں جو نظامِ عدل سے متعلق ہیں۔ اصل میں لفظ عدل مختلف سطحوں پر مختلف معنی رکھتا ہے۔ ایک ہے عدلِ اجتماعی کہ سیاسی نظام ایسا نہیں ہونا چاہیے جس میں کسی خاص خاندان یا خاص طبقے کی رعایت ملحوظ ہو بلکہ وہ تمام عوام کے لیے بہترین ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو اظہارِ رائے کی بھی آزادی ہو اور جماعت بنانے کی بھی۔ یہ نہ ہو کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہوا ہے یا ایک خاندان اختیارات پر قابض ہے یا کوئی ایک خاص طبقہ باقی لوگوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ سب اجتماعی اور سیاسی سطح پر ظلم ہے جس کی تلافی بہرصورت ہونی چاہیے اور اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

معاشی سطح پر عدل

معاشی سطح پر عدل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بھی دنیا میں پیدا کی ہیں' ان سب کی تقسیم منصفانہ ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ان میں کسی خاص گروہ کی اجارہ داری قائم

ہو جائے اور دوسرا گروہ ان کا دست نگر بن کر رہ جائے بایں طور کہ ایک طرف دولت کے انبار لگ جائیں اور ایک طرف فقر و فاقہ اور بھوک کا عالم ہو بلکہ ہر انسان تک بنیادی ضروریات کی فراہمی ہونی چاہیے۔ اسلام کے نظامِ عدل میں عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوگی' باقی ہر شخص کو آزاد چھوڑا جائے گا کہ وہ محنت ومشقت کرے' جِدّ وجُہد کرے اور حلال ذریعے سے کمائے۔ اب اس صورت میں اگر کوئی زیادہ کمائے تو وہ اس کا حق ہے اور کوئی کم کمائے تو یہ اس کا اپنا انفرادی معاملہ ہے۔ البتہ جو پیچھے رہ جائیں تو اسلام میں ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی ایک صورت رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس اُن کی ضرورت سے زائد ہو گیا ہے اور وہ ایک خاص سطح (جسے فقہی اصطلاح میں ''نصاب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے) سے آگے نکل گئے ہیں تو ان سے زکوٰۃ لی جائے اور ان طبقات کو پہنچائی جائے جو پیچھے رہ گئے ہیں۔

سوشل سکیورٹی کا نظام اسلام کا ایجاد کردہ ہے!

آج کی دنیا میں اسے سوشل سکیورٹی کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ موجودہ دور میں انسان نے بہت ترقی کی ہے' لیکن سوشل سکیورٹی کا اصول موجودہ دور کا ایجاد کردہ نہیں ہے' بلکہ اس کا آغاز خلافت راشدہ کے دور سے ہوا تھا۔ خلافت راشدہ کے دور میں یہ اصول رائج تھا کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کرنا خلافت کی ذمہ داری ہے' یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ اگر دجلہ یا فرات کے کنارے (یعنی مدینہ منورہ سے کوسوں دور عراق کے ملک میں) کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

سوشل سکیورٹی کا تصور اگرچہ اسلام نے دیا تھا' لیکن آج ہم اس حوالے سے بہت پیچھے ہیں۔ ہمارا نظام ظالمانہ ہے' یہاں غریب پستی کی حدوں کو چھوتے ہوئے غریب تر اور امیر ترقی کے زینے چڑھتے ہوئے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک طرف ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی ہے جہاں ایک خالی پلاٹ بھی کروڑوں کا ہے۔ وہاں اونچے اونچے محلات بن رہے ہیں اور ان پر ایسے انداز سے ماربل تھوپا جا رہا ہے جیسے کسی زمانے میں

دیہات میں عورتیں دیواروں پر اوپلے تھوپ دیتی تھیں' جبکہ ایک طرف غریبوں کی جھگیاں ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں ہے اور انہیں بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں ہیں۔ یہ معاشی سطح پر ظلم ہے اور اسلام کے نظامِ عدل میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ہمارے ہاں سوشل سکیورٹی کا نام تک نہیں ہے' حالانکہ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم سوشل سکیورٹی کے تصور کو آگے لے کر چلتے۔ ہم نے تو اسے اختیار نہیں کیا' جبکہ دنیا نے اس کو اختیار کر کے انتہا تک پہنچا کر دکھایا ہے۔ سکینڈے نیوین ممالک یعنی ناروے' سویڈن اور ڈنمارک میں سوشل سکیورٹی کا اعلیٰ ترین نظام موجود ہے۔ باقی فحاشی' عریانی اور سیکس کے حوالے سے وہاں بدترین معاملہ ہے اور اس حوالے سے وہ معاشرہ سنڈاس بن چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے' لیکن روٹی تو ہر ایک کو ملے گی۔ ملکہ کا بیٹا جہاں پڑھے گا وہیں ایک فقیر کا بیٹا بھی پڑھے گا۔ وہاں پر کوئی دو نظامِ تعلیم نہیں ہیں' جیسے ہمارے ہاں ہے کہ غریب کے بچوں کے لیے چٹائیوں والے سکول ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر بچے پڑھتے ہیں' جبکہ دوسری طرف AC اور دنیا کی تمام نعمتوں سے مالا مال پرائیویٹ سکول ہیں جن میں پندرہ پندرہ' بیس بیس ہزار فیس دے کر اُمراء کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں' جبکہ وہاں امیر اور غریب کے بچے ایک ہی سکول میں پڑھتے ہیں۔ اسی طرح جس ہسپتال کے اندر ملکہ کا علاج ہوگا اسی ہسپتال میں غریب ترین آدمی کا بھی علاج ہوگا۔ صرف ایک بات میں نے وہاں دیکھی کہ ملکہ کے لیے ہسپتال میں ایک کمرہ reserve ہوتا ہے تاکہ اگر کسی وقت ملکہ کو ضرورت پڑ جائے اور ہسپتال میں جگہ نہ ہو تو بس وہ ایک کمرہ ملکہ کے لیے مختص رہے گا۔ باقی علاج وہی ہوگا جو ایک غریب کا ہوتا ہے۔ کوئی مزدور دورانِ مزدوری معذور ہو گیا ہے تو ساری عمر اس کو پنشن ملے گی۔ آپ اپنے آپ کو معذور ڈکلیئر کرا لیں تو اس کے بعد آپ عیش کریں۔ ہمارے جو لوگ وہاں پر گئے ہیں' انہوں نے غلط طور پر اس کا فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طریقے اور بہانے سے اپنے آپ کو ان فٹ قرار دلوا لیتے ہیں اور پھر یہاں آ کر عیش کرتے ہیں۔ ان کی پنشن یہاں آ رہی ہوتی ہے اور پاکستان کے ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ اتنی نہیں ہے جتنی ان کی پنشن ہوتی ہے۔

بہر حال انہوں نے یہ کام کر کے دکھایا ہے اور جس طریقے سے وہاں علاج معالجہ کا معاملہ ہے‘ ایسا امریکہ میں بھی نہیں ہے۔ امریکہ اس اعتبار سے برا ملک ہے اور وہاں ہیلتھ کیئر اس سطح کی نہیں ہے۔ وہاں آپ کو علاج بہت مہنگے داموں خریدنا پڑتا ہے۔ پھر اس کے لیے انہوں نے ہیلتھ انشورنس کا نظام بنایا ہے۔ آپ ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے پیسے کٹواتے رہتے ہیں اور جب آپ بیمار ہوں تو انشورنس کمپنی آپ کو آپ کے علاج کے لیے پیسے دے گی۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں بھی آپ نے انشورنس کے پیسے دیے تھے‘ تب ہی آپ کو یہ حق حاصل ہوا ہے‘ لیکن آپ انگلینڈ میں چلے جایئے تو علاج مکمل طور پر فری ہے اور برابری کی سطح پر ہے‘ یعنی امیر اور غریب کا کوئی فرق وہاں روا نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے ایک بزرگ ہوا کرتے تھے سراج الحق سید صاحب‘ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے‘ میں ایک دفعہ ان کے ساتھ برطانیہ گیا تھا۔ ان کے ایک بھائی بہت عرصے سے وہاں مقیم تھے اور ذیابیطس کے بہت پرانے مریض تھے‘ لیکن ان کا جس عمدہ طریقے سے وہاں پر علاج ہوتا تھا‘ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر ہفتے ایک شخص گھر پر آ کر ان کے پاؤں کے ناخن تراشتا تھا۔ وہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ اگر اس نے خود ناخن کاٹا اور ذرا سا زخم لگ گیا تو پھر ذیابیطس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر زہر پھیل جائے اور انگوٹھا کاٹنا پڑے۔ کیا آپ اس چیز کا اپنے معاشرے میں تصور کر سکتے ہیں؟

معاشرتی اور سماجی سطح پر عدل

سماجی سطح پر عدل انسانوں کے مابین مساوات ہے کہ انسانوں میں بحیثیت انسان کوئی اونچ نیچ نہیں ہے اور پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ چاہے وہ گورے ہوں‘ کالے ہوں‘ سید ہوں‘ مصلّی ہوں‘ یا کسی اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں‘ وہ سب برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عورت اور مرد بھی بحیثیت انسان برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے‘ البتہ انتظامی سطح پر عورت اور مرد میں فرق ہے۔ گھر کے ادارے کا سربراہ ایک ہی ہو سکتا ہے‘ دو نہیں ہو سکتے۔ جیسے آپ کوئی انجمن بناتے ہیں تو صدر ایک ہی ہو گا‘ البتہ نائب صدور چار پانچ یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں‘ اس سے فرق نہیں

پڑتا۔ اسی طرح آپ نے کاروبار کے لیے کوئی لمیٹڈ کمپنی بنائی ہے تو اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی ہوگا' جبکہ ڈائریکٹرز زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح گھر کے ادارے (institution of family) کا سربراہ ایک ہی ہے اور وہ مرد ہے' نہ کہ عورت۔ عورت کی حیثیت وزیر کی ہے' لیکن گھر میں اصل حکم مرد کا چلے گا اور وہ بھی اللہ اور رسول ﷺ کے دائرے کے اندر رہ کر' یہ نہیں کہ وہ فرعون بن جائے کہ جو چاہوں میں حکم دے سکتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اور اگر شوہر شریعت کے خلاف کوئی حکم دے گا تو بیوی ماننے کی پابند نہیں ہے۔ چنانچہ سماجی سطح پر عدل یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں' البتہ اگر کوئی فرقِ مراتب ہوگا تو وہ صرف اکتسابی (acquired) چیزوں میں ہوگا۔ مثلاً کسی نے کوئی اونچا مقام حاصل کر لیا ہے یا کوئی بہت بڑا خادمِ خلق بن گیا ہے تو اس کی زیادہ عزت کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی زیادہ متقی ہے تو اللہ کی نگاہ میں اس کی زیادہ قدر و منزلت ہوگی۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ﴾ (الحجرات:۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے اور ہم نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہے۔''

عدالتی سطح پر عدل

یہ تو اجتماعی سطح پر عدل ہے' جبکہ ایک ہے عدالتی نظام۔ بعض لوگوں میں جھگڑے ہو جاتے ہیں یا ایک دوسرے پر ظلم کر بیٹھتے ہیں —— ظلم کے حوالے سے وہ حدیث ہم پڑھ چکے ہیں: ((يَا عِبَادِيْ! اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ ' وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُّحَرَّمًا ' فَلَا تَظَالَمُوْا)) ''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے کہ کسی پر ظلم کروں اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے' لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم

نہ کرو‘‘ ـــــ معاشرے میں جب ظلم وزیادتی ہوتی ہے تو پھر جھگڑے ہوتے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا میرا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ میرا ہے۔اس طرح ایک مدعی بن کے کھڑا ہوجاتا ہے اور ایک مدعا علیہ بن کر۔اسی طریقے سے جرائم ہیں‘ جن کے مرتکبین کو سزا ملنی چاہیے۔اب عدالت کا کام ہے کہ اچھی طرح واقعہ کی چھان بین کرے کہ اس شخص نے جرم کیا ہے یا نہیں؟اس کے لیے ظاہر بات ہے کہ عدالتی نظام ہوگا‘ گواہی کا معاملہ ہوگا اور مختلف طریقوں سے اس کا ثبوت فراہم کیا جائے گا۔یہ وہ عدل ہے جو عدالت کی سطح پر ہوتا ہے‘ جسے عدل وانصاف کی فراہمی کہتے ہیں۔

عدالتی نظام کے اصول وضوابط کے حوالے سے امام نووی دو بہت پیاری احادیث لائے ہیں۔پہلی حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)) یعنی نہ کوئی ظلم کرو اور نہ کسی قسم کا ظلم برداشت کرو۔یہ ایک سنہرا اصول ہے‘ نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ خود نقصان اٹھاؤ!

قصاص میں زندگی ہے!

زیر مطالعہ حدیث میں بیان کی گئی دوسری بات بظاہر بڑی عجیب لگتی ہے۔عام طور پر اخلاقی تعلیمات میں یہ تو کہا جاتا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو‘ لیکن یہ دوسرا پہلو نہیں بیان کیا جاتا کہ اللہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم اپنے اوپر بھی کسی قسم کا ظلم برداشت نہ کرو۔اپنے حق کے لیے پوری جدوجہد کرو اور پھر بھی بات نہ بنے تو اپنے حق کے لیے جھگڑو‘ کیونکہ اگر تم ڈھیلے پڑ گئے تو ظالم کی ہمت افزائی ہوجائے گی۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرة:۱۷۹)

’’اے ہوش مندو!تمہارے لیے قصاص میں (یعنی بدلہ لینے میں) زندگی ہے۔‘‘

عام طور پر اخلاقی تعلیمات میں کہا جاتا ہے کہ معاف کر دیا کرو۔قرآن بھی کہتا ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التغابن) ’’اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت مہربان ہے‘‘۔اگر تم اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہو تو انسانوں کی زیادتیوں

کو بھی معاف کیا کرو۔ تو یہ ہے اخلاقی سطح پر تعلیم، لیکن قانونی سطح پر یہ بھی تعلیم ہے کہ تمہارے لیے بدلہ لینے میں زندگی ہے۔

یہ توازن آپ کو صرف آسمانی ہدایات میں مل سکتا ہے۔ عام انسان یا تو اِدھر انتہا کو نکل جائیں گے یا اُدھر انتہا کو نکل جائیں گے۔ آپ پر کسی نے ظلم کیا ہے، زیادتی کی ہے، آپ کو کسی نے تھپڑ مار دیا ہے۔ اگر تو آپ میں جوابی تھپڑ رسید کرنے کی ہمت نہیں تو پھر صبر کے سوا آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے، لہٰذا ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کے مصداق صبر کرو — اور اگر آپ میں طاقت ہے تو آپ کے سامنے دو راستے ہیں، یا تو آپ معاف کر دیں یا بدلہ لے لیں۔ معاف کرتے وقت بھی انسان کو دیکھنا چاہیے کہ آیا معاف کرنے میں مصلحت زیادہ ہے یا بدلہ لینے میں۔ اس حوالے سے ہر کیس کا معاملہ علیحدہ ہو جائے گا۔ اگر کسی شریف انسان نے اتفاقاً کوئی غلطی کر دی ہے تو معاف کر دینے میں فائدہ ہے، لیکن اگر کسی عادی مجرم نے ایسا کیا ہے، مثلاً کسی نے اپنی دھونس جمانے کے لیے جان بوجھ کر زیادتی کی ہے تو اس صورت میں اگر بدلہ نہیں لو گے تو اس کی ہمت افزائی ہو گی۔ اس نے آج تمہیں تھپڑ مارا ہے تو کل کسی اور کو مارے گا۔ لہٰذا Nip the evil in the bud کے مطابق اس کے تھپڑ کے جواب میں آپ بھی اس کو ایک تھپڑ رسید کریں تاکہ اس کی عقل ٹھکانے آ جائے اور کل کلاں وہ کسی اور کو تھپڑ مارنے کی جرأت نہ کر سکے۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے سزاؤں کا نفاذ

آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جو تبلیغ ہے وہ نظری تبلیغ ہے، اور اس پر عمل درآمد اس دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو تم بایاں گال بھی پیش کر دو۔ پھر یہ کہ کوئی نالش کر کے تم سے تمہارا جُبّہ لینا چاہے تو جُبّہ کے ساتھ اپنا کُرتا بھی اُتار کر اس کو دے دو۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تعلیم ہے — لیکن اس میں عدم توازن ہے۔ عدم توازن کیوں ہے؟ یہ بھی سمجھ لیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، وہ معاذ اللہ کوئی غلط بات تو

نہیں کہہ سکتے! اصل میں نبی کی دعوت میں ایک خاص دور ہوتا ہے جب دعوت وتحریک کا تقاضا اور مصلحت اس میں ہوتی ہے کہ ظلم وزیادتی کو جھیلو' برداشت کرو اور جوابی کارروائی مت کرو۔ بارہ برس تک مکہ مکرمہ میں حضورﷺ کا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہی حکم تھا کہ کفارِ مکہ تمہیں ماریں تو برداشت کرو' تمہیں گالیاں دیں تو جوابی گالی مت دو' پتھر ماریں تو تم پھول پیش کرو۔ لیکن یہ اس دعوت وتحریک کی ایک مصلحت تھی' قانون نہیں تھا۔ قانون تو مدینہ منورہ میں آ کر اترا ہے کہ اگر تمہارے اوپر کسی نے زیادتی کی ہے تو اسی کے برابر اس سے بدلہ لو! یہ معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت ضروری ہے۔ حدود اللہ اور سزاؤں کا نفاذ بھی اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ حدود اللہ کا نفاذ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ کو مجرم سے دشمنی ہو جاتی ہے' بلکہ کسی شخص نے چوری کی ہے تو اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم اس لیے ہے تاکہ لوگوں کو ہوش جائے اور پھر کوئی چوری نہ کرے۔

یہ معاملہ ہم بہت عرصے سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ سعودی عرب میں جرائم کی شرح بہت ہی کم ہے' کوئی چوری نہیں' کوئی ڈاکہ نہیں' اس لیے کہ وہاں چوروں کے ہاتھ کٹتے ہیں' ڈاکوؤں کو شرعی سزا ملتی ہے' قاتل کی گردن اڑائی جاتی ہے۔ جمعہ کے روز ریاض کی جامع مسجد کے باہر میدانِ عدل میں جلاد سب کے سامنے قاتل کی گردن اڑا دیتا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے تاکہ لوگوں کو ہوش آ جائے اور آئندہ پھر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی معاشرے کے اندر جرم نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر ہم نے یہی معجزہ اپنے پڑوسی اور برادر ملک افغانستان میں اُس وقت دیکھا جب طالبان نے وہاں اسلامی شریعت اور اسلامی سزاؤں کو نافذ کیا۔ طالبان کو موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وہاں اسلامی نظام آگے بڑھتا اور اس کی برکات کا ظہور پورے طور پر ہوتا جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا تھا۔ حضور اکرمﷺ کے دور میں تو جہاد اور قتال کا مرحلہ جاری رہا' اس لیے اس نظام کی برکات ابھی پورے طور پر ظاہر نہیں ہو رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اسلامی انقلاب کے خلاف مزاحمتی اور انسدادی تحریکیں (counter-revolutionary movements)

اُٹھیں اوران کو دبانے میں ساری توجہ صرف ہوئی۔ لیکن پھر جب عرب کے اندر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں امن قائم ہوا' حکومت مستحکم ہوگئی اور حکومتی رٹ مکمل طور پر نافذ ہوگئی تو پھر اسلام کی برکات کا مکمل طور پر ظہور ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ افغانستان میں ابھی صرف چند شرعی سزائیں نافذ کی گئی تھیں کہ چوری اور ڈاکے جیسے جرائم یکسر ختم ہو گئے۔ ہمارے ہاں کہہ دیتے ہیں کہ اگر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا تو آدھا ملک ہاتھ کٹوں کا ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں' یہ غلط پروپیگنڈا ہے۔ اس وقت واقعتاً حال یہی ہے کہ خیانت' چوری' دھوکہ دینا' ڈاکے ڈالنا یہ سب ہو رہا ہے' لیکن اگر شرعی سزائیں نافذ ہو جائیں تو چند ہاتھ کٹیں گے اور بعد میں جرم ختم ہو جائے گا۔ ورنہ امریکہ جیسے ملک میں' جہاں تعلیم انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور وہ اپنے آپ کو مہذب ترین سمجھتے ہیں' وہاں بھی انتہائی گھناؤنے جرم ہو رہے ہیں۔ کسی بھی معاشرے سے جرم کو دیس نکالا نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ناممکن ہے' بلکہ جرم تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسلام میں سزاؤں کا سارا نظام معاشرے کی مصلحت کے لیے ہے۔ اگر ایک شادی شدہ شخص نے زنا کیا ہے تو اسے رجم کیجیے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد زنا کا معاملہ بہت مشکل ہو جائے گا اور معاشرے میں خود بخود بہتری آ جائے گی۔ اسی لیے یہ تعلیم دی گئی کہ معاف کرنا اپنی جگہ بہتر ہے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور بہتری کے لیے قصاص میں' بدلے میں' سزا دینے میں زندگی ہے۔ اس کو ایسے سمجھیں کہ جیسے کسی کے ہاتھ میں گنگرین ہو گیا' ہاتھ جل گیا' سڑ گیا تو پورا بازو کاٹ دیتے ہیں۔ بازو جسم کا حصہ ہے' لیکن پورے جسم کو بچانے کے لیے بازو کو کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے' ورنہ جسم میں زہر پھیل جائے گا اور موت واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک مجرم کی وجہ سے پورے معاشرے میں گند پھیل سکتا ہے' لہٰذا شادی شدہ زانی کو اگر آپ نے رجم کیا ہے یا قاتل کو جواباً قتل کیا ہے یا چور کا ہاتھ کاٹا ہے تو اس سے پورا معاشرہ ٹھیک رہے گا۔

الغرض زیر مطالعہ روایت میں یہ اصول دے دیا گیا کہ نہ کوئی ضرر پہنچاؤ اور نہ کوئی ضرر برداشت کرو۔ اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرو اور اگر کوئی ظلم اور

زیادتی ہوئی ہے تو پھر اس کے لیے قصاص لو۔ یہ نہ ہو کہ آپ ہر بار اخلاقی تعلیم کے باعث ہمیشہ درگزر سے ہی کام لیں اور قصاص کو سرے سے ہی چھوڑ دیں۔ انفرادی معاملات میں معافی اور درگزر والا معاملہ بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ ایک آدمی نے آپ کے خلاف کوئی اقدام کیا ہے، لیکن اسے خود ہوش آ جائے گا، اسے خود احساس ہو جائے گا کہ میں نے زیادتی کی ہے تو ٹھیک ہے آپ اسے معاف کر دیں، لیکن اصول یہ نہیں ہے۔ اصول یہ ہے کہ آپ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگائیں، دلائل دیں، اس کے لیے ثبوت پیش کریں۔ اس سے معاشرہ صحیح سطح پر برقرار رہے گا اور درحقیقت اسی سے معاشرے کے اندر صحت مند روایات پروان چڑھیں گی۔

وکالت جھوٹ پر مبنی ہو تو حرام ہے!

عدالتی نظام میں ایک معاملہ وکالت کا ہوتا ہے۔ اگر وکالت میں جھوٹ نہ بولا جائے تو یہ پیشہ جائز ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کے لوازم ہی یہ ہیں کہ جھوٹ بولو، جھوٹ بلواؤ اور خلافِ واقعہ بیان دلواؤ۔ یہ حرام ہے۔ فرض کیجیے مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرے ملکی قانون یا اسلامی شریعت میں میرے لیے کیا کیا رعایات ہیں۔ چنانچہ میں ایک وکیل کرتا ہوں اور وہ وکیل عدالت میں جا کر ان رعایتوں کو واضح کر دیتا ہے اور میں بچ جاتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے، کیونکہ عام آدمی تو قانون اور شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتے، لہٰذا قانونی ماہرین عدالت میں جا کر مقدمہ کو آگے چلاتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں قانون کے ماہرین ''فقہاء'' کہلاتے ہیں جو کسی کی طرف سے دفاع کر سکتے ہیں، کسی فریق کی طرف سے جا کر اس کے مقدمے کو پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں عدالتی نظام میں یہ قانونی معاونت وکیل حضرات کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا کوئی مقدمہ ہے، لیکن آپ اس کو صحیح طور پر عدالت میں پیش کرنے کی استطاعت اور صلاحیت نہیں رکھتے تو آپ ایک وکیل کی مدد حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اس میں جھوٹ نہیں ہونا چاہیے، ورنہ یہ حرام ہو جائے گا۔

اثباتِ دعویٰ کے اصول

اب ہم دوسری حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے بیٹے ہیں ـــــ اور انہیں ''حِبْرُ الْاُمَّۃ'' کہا گیا ہے کہ یہ امت میں قرآن مجید کے بہت بڑے عالم تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کررہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاھُمْ ' لَادَّعٰی رِجَالٌ اَمْوَالَ قَوْمٍ وَّدِمَاءَ ھُمْ، وَلٰکِنَّ الْبَیِّنَۃَ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ))

''اگر لوگوں کو ان کے دعویٰ کے مطابق (بلاتحقیق) دے دیا جائے تو لوگ دوسروں کے اموال اور خون پر دعویٰ کرنے لگیں' لہٰذا اصول یہ ہے کہ مدعی ثبوت پیش کرے اور مدعا علیہ اگر انکاری ہو تو قسم اٹھائے۔''

اس روایت میں اثباتِ دعویٰ کے حوالے سے ایک سنہری اصول دیا گیا کہ جس نے کسی چیز کا دعویٰ کیا ہے تو وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل یا ثبوت پیش کرے گا اور جو مدعا علیہ ہے' اس کے لیے قسم اٹھالینا کافی ہو جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی دعویٰ کرے کہ یہ مکان میرا ہے' خدا کی قسم میرا ہے! تو اسے کہا جائے گا کہ یہ قسم یہاں نہیں چلے گی۔ اگر تم نے اس مکان کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہے تو کوئی دلیل یا ثبوت یا گواہ لاؤ۔ بغیر دلیل اور ثبوت کے تمہارا دعویٰ قابل قبول نہیں ہے۔ دوسری طرف جو مدعا علیہ ہے اس کے لیے دلیل ضروری نہیں ہے' اگر وہ حلف اٹھالے تو بھی فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے قبضہ کا دعویٰ کیا ہے تو آپ کو اپنے قبضے کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ یہ میری چیز ہے' جبکہ جس کے قبضے میں ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ثبوت پیش کرے' لہٰذا اگر وہ قسم کھالے' حلفیہ بیان دے دے تو دعویٰ باطل ہو جائے گا۔

زیر مطالعہ روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے پیش نظر ـــ جو وہ مانگ رہے ہوں' جو وہ دعویٰ کر رہے ہوں' جس چیز پر اپنا حق جتلا رہے ہوں ـــ دے دیا جائے تو اس طرح سارے لوگ دوسرے لوگوں کے اموال کے اوپر

قبضہ کرنے کے لیے دعوے لے کر کھڑے ہو جائیں گے' بلکہ ان کی جانوں کے بھی مدعی بن جائیں گے۔ مثلاً قتل کا معاملہ ہے اور آپ نے جھوٹے طور پر قسم کھالی ہے کہ میں نے اسے فلاں شخص کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا تو آپ کے بیان پر اُس شخص کو پھانسی پر نہیں لٹکا دیا جائے گا' بلکہ گواہ پر جرح ہوگی اور دیکھا جائے گا کہ واقعتاً یہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ اس کے بیان میں کوئی تضاد تو نہیں ہے۔ صرف قسم کھانے کی بنیاد پر کسی کا جرم ثابت نہیں ہو جائے گا۔ اسی طرح زنا کے معاملہ میں بھی جب تک چار گواہ نہیں آئیں گے تو وہ ثابت نہیں ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ دلیل اور ثبوت نہ ہونے کی بنا پر قاضی شریحؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقدمہ خارج کر دیا تھا۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہوگئی اور ایک یہودی کے ہاں سے برآمد ہوگئی۔ مقدمہ عدالت میں آیا۔ حضرت علیؓ مدعی اور یہودی مدعا علیہ ہے۔ ایک طرف امیر المؤمنین' بہت بلند مرتبہ صحابیؓ' حضور ﷺ کے داماد اور حضور ﷺ کے چچازاد بھائی' جبکہ دوسری طرف ایک عام یہودی تھا۔ قاضی شریح نے کہا: اے ابوالحسن! آپ اپنا دعویٰ پیش کیجیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: قاضی صاحب! آپ نے پہلی ناانصافی تو یہیں کر دی۔ آپ کو کہنا چاہیے تھا: اے علی! اپنا دعویٰ پیش کرو' جبکہ آپ نے مجھے ابوالحسن کہہ کر پکارا ہے' حالانکہ کنیت کے ساتھ پکارا جانا عزت وتکریم کے لیے ہوتا ہے۔ اس وقت نہ تو میں خلیفۃ المسلمین ہوں اور نہ میں کوئی بلند مرتبہ صحابی۔ اس وقت میری حیثیت تو بس ایک مدعی کی ہے۔ پھر آپؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہ زرہ میری ہے۔ قاضی نے کہا: گواہ لائیے! آپؓ نے کہا: گواہ حاضر ہیں۔ ایک گواہ میرا بیٹا حسن ہے اور دوسرا گواہ میرا غلام قنبر ہے۔ اب سنیے' قاضی صاحب کہتے ہیں کہ دعویٰ کے ساتھ بیٹے اور غلام کی گواہی قبول نہیں ہے' کوئی اور ہے تو لائیے! چونکہ یہ امکان موجود ہے کہ بیٹا اور غلام طرف داری کرسکتا ہے' لہٰذا ان کی گواہی قبول نہیں ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو کوئی اور گواہ نہیں ہے۔ اس پر قاضی صاحب نے فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیا اور اُن کا دعویٰ خارج کر دیا۔

آزاد عدلیہ ہی کرپشن روک سکتی ہے!

یہ ہے آزاد عدلیہ کی مثال کہ قاضی نے وقت کے خلیفہ کے خلاف فیصلہ دیا اور خلیفہ نے بھی بغیر کسی تردّد کے اس فیصلہ کو قبول کیا۔ آج کل ہمارے ملک میں بھی آزاد عدلیہ کی تحریک چل رہی ہے۔ انتظامیہ اگر عدلیہ کے تابع نہ ہو تو وہ لازماً ظلم کرے گی' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نہ کرے۔ کیونکہ اصول آپ کو معلوم ہے کہ

Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely.

یعنی جہاں اختیار ہوتا ہے' طاقت ہوتی ہے تو وہاں کرپشن کا امکان پیدا ہو جاتا ہے اور جہاں انسان کو مکمل اختیار حاصل ہو جائے تو وہاں کرپشن کا امکان بھی لامحدود ہوگا۔ اس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح کروڑوں کے غبن ہوئے ہیں اور کس طرح ہماری بہترین کمپنیوں اور اداروں کو نجکاری کے نام پر کوڑیوں کے دام بیچا گیا ہے۔ اس ساری لوٹ مار سے قوم کو بے حد وحساب نقصان پہنچایا گیا ہے۔ غریب آدمی پس رہا ہے' لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ ایک ماں نے اپنی تین بچیوں سمیت ریلوے انجن کے سامنے کود کر اپنی جان کیوں دے دی؟ اس لیے کہ یہاں معاشی ظلم ہے اور یہاں سماجی عدل نہیں ہے۔

ایک تو اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی ہے' اور ایک عدالتی نظام اور اس سطح پر عدل کے تقاضے ہیں۔ حضور ﷺ نے اس کے لیے بھی بہترین اصول بتائے ہیں جو آج بھی دنیا میں مانے جاتے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ دونوں فریقوں کی بات سنے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرو۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو پہنچے گا اور شک کی بنا پر آپ کسی کو سزا نہیں دے سکتے۔ یہ تمام اصول محمد رسول اللہ ﷺ نے دیے ہیں۔ اسی طرح ایک اصول یہ ہے کہ اگر آپ نے کوئی دعویٰ کیا ہے تو ثبوت پیش کرنا آپ کے ذمے ہے' ورنہ وہ دعویٰ خارج ہو جائے گا' البتہ مدعا علیہ کی قسم کا بھی اعتبار ہوگا۔

متذکرہ بالا مقدمہ میں حضرت علیؓ مدعی تھے کہ یہ زرہ میری ہے اور یہودی کہہ رہا تھا کہ یہ میری ہے' وہ مدعا علیہ تھا۔ اب پہلا مرحلہ یہ تھا کہ دلیل لائیے' گواہ لائیے' نہیں ہے

تو دعویٰ خارج۔فرض کیجیے کوئی گواہ بھی آ جاتا ہے مگر مدعا علیہ قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے تو اس صورت میں بھی مدعا علیہ کی قسم کو تسلیم کیا جائے گا اور دعویٰ خارج کر دیا جائے گا۔اس لیے کہ قبضہ فی نفسہ ایک دلیل ہے۔آج بھی دنیا میں مانا جاتا ہے کہ ملکیت کے دس میں سے نو حصے قبضہ ہے۔چنانچہ آپ مدعی بن کر آ گئے ہیں تو آپ دلائل لائیں اور جو قابض ہے اُس کے پاس تو قبضہ خود ایک دلیل موجود ہے۔

قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف وارثین کو ہے!

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے عدالتی نظام میں قتل کے مقدمے میں مقتول کے ورثاء کو مدعی نہیں مانا جاتا' بلکہ یہاں یہ اصول رائج ہے کہ ایسے مقدمات میں مدعی حکومت ہے۔یہ بات اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔اسلامی تعلیمات کے مطابق قتل کے مقدمہ میں مقتول کے ورثاء ہی مدعی ہیں اور انہیں ہی یہ حق حاصل ہے کہ خواہ وہ قاتل کو بغیر کچھ لیے چھوڑ دیں یا خون بہا لے کر چھوڑ دیں۔اس صورت میں حکومت' عدالت اور ریاست کا سربراہ کچھ نہیں کر سکتا۔لیکن ہمارے دستور میں یہ دفعہ موجود ہے کہ ریاست کا سربراہ قاتل کو معاف کر سکتا ہے' جو کہ سراسر غلط اور بالکل خلافِ اسلام ہے۔

فرض کیجیے ایک قتل کا مقدمہ ہے۔عام عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ ہاں یہی شخص مجرم ہے۔پھر سیشن کورٹ میں بھی ثابت ہو گیا۔ہائی کورٹ میں گئے تو وہاں بھی ثابت ہو گیا۔پھر سپریم کورٹ نے بھی یہی فیصلہ سنایا کہ یہی شخص قاتل ہے۔اس سب کے باوجود اب بھی صدرِ مملکت اسے معاف کر سکتا ہے۔یہ قطعاً غلط ہے اور اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قاتل کو معاف کرتا پھرے۔ہاں مقتول کے وارثوں کو حق حاصل ہے کہ تمام فیصلوں کے بعد بھی اسے معاف کر سکتے ہیں اور اس کے اندر بہت بڑی حکمت ہے۔ آپ اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ دو پارٹیوں کے درمیان دشمنی چل رہی ہے' کچھ ان کے قتل ہو گئے تو مقتولین کے لوگوں نے قاتلوں کے کچھ لوگ مار ڈالے۔دیہات میں اکثر خاندانی بنیادوں پر قتل در قتل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جو کسی صورت رکنے کا نام نہیں لیتا۔اس کو روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص قاتل ثابت ہو چکا ہے تو اب اس کی

جان مقتول کے ورثاء کے ہاتھ میں دے دی جائے' کہ چاہے تو بخش دیں' چاہے تو جان لے لیں۔ اب اگر مقتول کے ورثاء اس قاتل کو بخش دیتے ہیں اور معاف کر دیتے ہیں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قاتل اور اس کے خاندان کے اوپر کتنا گہرا اثر ہوگا اور وہ ان کے کس قدر ممنونِ احسان ہو جائیں گے۔ اس طرح قتل در قتل کا نہ رُکنے والا سلسلہ خود بخود رک جائے گا اور پھر جوابی قتل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ قتل کے مقدمے میں مدعی حکومت نہیں' بلکہ مقتول کے ورثاء ہیں۔

الغرض رسول اللہ ﷺ نے عدالتی سطح پر انصاف کے حوالے سے بہت بیش بہا اور قیمتی اصول بتائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہی انسان عدل کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں کو اپنی زندگیوں میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
34

امر بالمعروف و نہی عن المنکر
اور اس کی اہمیت

۲۰ جون ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمٰن)

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ (آل عمران:۱۱۰)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران)

لَوْلَا يَنْھٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (المائدة)

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المائدة)

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (الاعراف)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي

الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ (ھود:١١٦)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ :

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (۱)

سیدنا ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ (طاقت) سے بدلے' اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے (برا جانے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

معزز سامعین کرام!

امام یحییٰ بن شرف الدین النووی ؒ کے مشہور مجموعہ احادیث ''اربعین نووی'' کا سلسلہ وار مطالعہ جاری ہے اور اس ضمن میں آج حدیث ۳۴ ہمارے زیر مطالعہ آئے گی۔ یہ حدیث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے ہے اور معاشرے کے اندر اچھائی کو برقرار رکھنے اور برائی کو دبانے کے لیے قرآن مجید کا میکنزم واضح کرتی ہے۔ ایک تو جرم کا معاملہ ہے' لیکن بہت سی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس نہیں ہوتیں۔ فرض کیجیے' ایک شخص نماز نہیں پڑھتا تو پولیس اسے نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کر سکتی' البتہ معاشرے کے اندر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ایسے شخص کو نماز کی تلقین کرتے رہیں اور نہ پڑھنے پر ملامت کرتے رہیں۔ مزید یہ کہ اگر آپ کے پاس کوئی اختیار ہے تو آپ اسے سزا بھی دیجیے' مثلاً آپ کا اپنا بچہ دس سال سے زائد کا ہو گیا ہے لیکن وہ نماز میں سستی کرتا ہے تو آپ اسے مار سکتے ہیں اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ دس سال کی عمر کے بعد بھی اگر بچہ نماز نہ پڑھے تو باپ کو اجازت ہے کہ وہ اسے مار کر نماز کا پابند بنائے۔

آج مغربی معاشروں میں تو اس کا تصور بھی نہیں ہے۔ بڑے بچے تو درکنار آپ اپنے چھوٹے سے چھوٹے بچے کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو وہ فوراً

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان...... وسنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب۔

کال کر کے پولیس کو بلالے گا اور پھر پولیس آپ کو لے جائے گی اور آپ کے بچے کو بھی۔ پھر بچہ مستقل طور پر آپ سے لے لیا جاسکتا ہے کہ آپ اس قابل نہیں ہیں کہ بچے کی پرورش کر سکیں' اس لیے کہ آپ نے بچے کو مارا ہے اور بچوں کی مار پٹائی ان کے ہاں بہت بڑا جرم ہے۔ خدانخواستہ کسی کی بیٹی آوارہ ہوگئی ہے تو وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کوئی سزا دینا تو دور کی بات ہے' اسے دھمکا بھی نہیں سکتے۔ لیکن اسلام میں یہ تصور ہے کہ آپ خاندان کے سربراہ ہیں اور آپ اپنی اولاد کو جسمانی سزا دے سکتے ہیں۔

اگر آپ کے پاس حکومتی سطح پر اختیار ہے تو پھر آپ کا فرض ہے کہ اجتماعی سطح پر ایک ایسا ادارہ بنائیں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ اسلامی ریاست کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے۔ ہم نے یہ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سعودی عرب کے اندر نماز کا وقت ہوا اور اذان ہوتے ہی سارے بازار بند ہوگئے۔ وہاں ان کا ایک علیحدہ محکمہ ہے: الھیئۃ للامر بالمعروف والنھی عن المنکر' جس کا کام ہی لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ وہاں کے ''شُرطے'' مشہور ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ کسی سے کچھ کہتے نہیں تھے' بس اپنی لاٹھی ٹھک ٹھک کرتے ہوئے آتے تھے اور جیسے جیسے ٹھک ٹھک کی آواز آتی تھی تو سب لوگ دکانیں بند کر کے نماز کے لیے جا رہے ہوتے تھے۔ یہ میں ۱۹۶۲ء کی بات کر رہا ہوں جب مجھے پہلی مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی کہ وہاں منی ایکسچینجرز کے ٹیبل عین سڑک کے کنارے لگے ہوتے تھے' جن پر ڈالر' پاؤنڈ' ریال اور دیگر کرنسی نوٹ بڑی تعداد میں پڑے ہوتے تھے' اور جیسے ہی اذان ہوتی تو وہ لوگ ان کے اوپر صرف چادر ڈال کر مسجد کی طرف چل پڑتے۔ ان کو کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ چوری ہو جائے گی۔ میں نے گزشتہ جمعہ یہ بات عرض کی تھی کہ یہاں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا اگر نافذ ہو جائے تو پھر یہ فضا پیدا ہو جائے گی۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر' احادیث کی روشنی میں

زیر مطالعہ حدیث مسلم شریف کی ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے خود سنا: ((مَنْ رَاٰی

مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ)) ''جوشخص بھی تم میں سے کسی منکر (بدی) کو دیکھے' اس کا فرض ہے کہ اسے اپنی طاقت سے بدل دے''۔ غور کیجیے یہ فرض ہے۔ یہ نہیں کہ انسان سوچے کہ جو کوئی برائی کرتا ہے کرتا رہے' خود عذاب سہے گا۔ ہرگز نہیں! اسے برائی سے روکنا آپ پر فرض ہے اور اگر آپ نہیں روک رہے تو آپ گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں آپ کا اختیار ہو وہاں اپنے زورِ بازو سے برائی کو روکیں۔ حکومتی سطح پر تو طاقت موجود ہوتی ہے' چنانچہ حکومت وقت اپنے اہلکاروں کے ذریعے برائی کو بزور روک سکتی ہے اور اچھائی کا نفاذ کرا سکتی ہے۔ لیکن اگر طاقت نہیں ہے تو: ((فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ)) ''پھر اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے بدل دے''۔ یعنی اپنی زبان سے برائی کو روکے۔ غلط کام کرنے والے سے برملا کہے کہ خدا کے بندے' یہ غلط کام مت کرو' یہ حرام کام ہے' اس سے باز آجاؤ۔ اور اگر زبان سے روکنے کی بھی طاقت نہیں ہے' یعنی معاشرے میں زبانوں کے اوپر بھی اس طریقے سے تالے ڈال دیے جائیں کہ بولنا بھی گویا جرم شمار ہو رہا ہو اور آواز اُٹھانے پر زبان کھینچ دی جاتی ہو تو اس صورت میں یہ ہے کہ: ((فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ)) ''پھر اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم سے کم اپنے دل میں (اس کے خلاف) ایک نفرت کا معاملہ رکھے''۔ ((وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) ''اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔ اگر دل میں بھی گناہ اور بدی سے نفرت کا معاملہ نہ ہو تو پھر ایمان کی مطلق نفی ہے۔

اس حدیث کی ہم مضمون ایک اور روایت ہے جو ذرا مفصل انداز میں ہے' وہ بھی آپ سن لیجیے۔ اسے بھی امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کوئی نبی کسی اُمت میں نہیں بھیجا مگر اس کے لیے اس کی امت میں سے کچھ نہ کچھ حواری اور اصحاب ہوتے تھے''۔ وہ خصوصی طور پر دو کام کرتے تھے' پہلا کام یہ تھا کہ: ((يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ)) ''وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے'' اور دوسرا کام یہ

تھا کہ ((وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ)) ''اور وہ اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے''۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور نئی نسل کے آجانے سے جذبہ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر ناخلف اور نافرمان لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو بایں الفاظ فرمایا: ((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ)) ''پھر ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ ان نبیوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے رہے''۔ ان کے دو کام یہ تھے کہ: ((يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ)) ''جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا''۔ آگے فرمایا: ((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''تو جو شخص ان (ناخلف لوگوں) کے خلاف اپنی طاقت سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے'' ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو کوئی ان کے خلاف اپنی زبان سے جہاد کرے وہ بھی مؤمن ہے'' ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو ان کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے (یعنی نفرت رکھے) وہ بھی مؤمن ہے''۔ ((وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))[1] ''اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر' ایک جامع اصطلاح

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے متعلق یہ بات بہت اہم ہے کہ یہ قرآن حکیم کی ایک جامع اصطلاح ہے اور یہ قرآن میں ایک وحدت کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے دس مقامات پر یہ دونوں ایک جامع اور مربوط اصطلاح کی شکل میں آئے ہیں اور ان میں سے چند آیات میں نے ابتدا میں آپ کو سنائی ہیں۔ سورۂ لقمان میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحتوں کا تذکرہ ہے' جس میں سے ایک نصیحت یہ ہے:

﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٧﴾﴾ (لقمٰن)

''اے میرے بچے! نماز قائم رکھ' نیکی کا حکم دے اور بدی سے روک' اور پھر جو کچھ تجھ پر بیتے اسے برداشت کر۔ یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان......

ظاہر بات ہے کہ بدی سے روکنے پر اشرار' بدمعاش اور بدقماش لوگ اس کی شدید مخالفت کریں گے۔ اب یہ مخالفت زبانی کلامی (verbel) بھی ہو سکتی ہے اور بالفعل اقدام کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے' لہٰذا اس مخالفت کو برداشت کرو اور اس پر صبر کرو۔

سورۃ الحج میں یہ آیت آئی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (آیت ۴۱)

''وہ لوگ جنہیں ہم زمین میں اقتدار عطا کر دیں تو وہ (۱) نماز کا نظام قائم کریں گے اور (۲) زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور (۳) بدی سے روکیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے۔''

سورۂ لقمان کی آیت گویا حکمت اور فطرت کا تقاضا ہے' اس لیے کہ حضرت لقمان نہ نبی تھے اور نہ کسی نبی کے پیروکار تھے۔ وہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان تھے اور وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں وہ گویا انسانی فطرت اور حکمت کا تقاضا ہے' اس لیے وہاں یہ اصطلاح واحد کے صیغے میں آئی ہے' جبکہ اس کی ایک بلندترین سطح یہ ہو سکتی ہے کہ جو لوگ یہ کام کرنے والے ہیں' اگر اللہ ان کو زمین میں اقتدار عطا فرما دے تو وہ حکومتی سطح پر بھی انہی کاموں کو جاری رکھیں گے۔ اس کا ذکر سورۃ الحج کی مذکورہ آیت میں ہوا ہے۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن مجید کے دس مقامات پر ایک اصطلاح کے طور پر لازم و ملزوم کی حیثیت سے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار احادیث بھی ایسی ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک جامع اصطلاح کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ اس کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں' وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَیُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَكُمْ))(۱)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' (اے مسلمانو!) تم

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ماجاء فی الامر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

لازماً نیکی کا حکم دو گے اور بدی سے روکو گے' ورنہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسا عذاب بھیجے گا کہ پھر تم دعائیں مانگو گے لیکن اللہ تمہاری دعا قبول نہیں کرے گا۔''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر' اُمت کا فرضِ منصبی

ابتدا میں' میں نے جن آیات کی تلاوت کی ان میں دو آیات سورۂ آل عمران کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا' یہ اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط﴾ (آل عمران: ١١٠)

''تم بہترین اُمت ہو جو نوعِ انسانی کے لیے نکالی گئی ہے (اور تمہارا کام یہ ہے کہ) تم نیکی کا حکم دو' بدی سے روکو' اور اللہ پر اپنے یقین کو پختہ رکھو۔''

جو انسان بھی امر بالمعروف اور خاص طور پر نہی عن المنکر کا علم لے کر کھڑا ہوتا ہے تو اسے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غیر تو پھر غیر ہیں' اپنے ہی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین بہت ضروری ہے' اس لیے کہ اسی یقین ہی کی بدولت انسان کے اندر وہ قوت پیدا ہو گی جس سے وہ مخالفت کو برداشت کر سکے گا' تشدد کو جھیل سکے گا اور زیادتی کو سہہ سکے گا۔

سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت میں تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو امتِ مسلمہ کا اجتماعی فرض قرار دیا گیا ہے' جبکہ آیت ۱۰۴ میں اسی حوالے سے ایک اور شکل بھی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرض کیجیے' اُمت اپنے اس فرضِ منصبی کو بھول گئی ہو ــــــ ویسے تو یہ پوری اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے اور اسے پوری نوعِ انسانی کے اوپر اسی لیے اٹھایا گیا ہے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ گویا اس امت کو خدائی فوجدار کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ اُمت اس فرضِ منصبی کو بھول گئی ہے اور غفلت کی نیند سو گئی ہے تو ایسی صورتِ حال میں پھر یہ ضرور ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو بیدار رہوں اور سوئی ہوئی امت کو جگانے کا کام کریں۔ جیسے حکیم محمد سعید مرحوم کے ادارے نے ایک سلوگن اختیار کیا تھا: ''جاگو اور جگاؤ!'' یہ بڑا اچھا

سلوگن ہے کہ اس امت میں سے جو جاگ گئے ہیں یا جاگے ہوئے ہیں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں' بلکہ دوسروں کو جگائیں۔ پھر جاگے ہوئے مل کر ایک امت بن جائیں۔ یعنی ایک اُمت تو سوئی ہوئی ہے —— ہے تو وہ بھی اُمت' اس لیے کہ نام لیوا تو محمد ﷺ کے ہیں —— پھر اس سوئی ہوئی اُمت میں سے کچھ لوگ لازماً جاگیں اور مل جل کر ایک امت بن کر باقی سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کا کام اجتماعی طور پر کریں۔ اس کو انگریزی میں party within party یعنی ایک جماعت کے اندر ایک جماعت کہا جاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۴ میں اسی کا ذکر ہے کہ ویسے تو یہ ساری اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے کہ اس نے دعوت وتبلیغ' شہادت علی الناس اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنا ہے' لیکن اگر اُمت مسلمہ اپنا یہ فرض بھول جائے تو پھر کم از کم کچھ لوگوں کو ضرور یہ کام کرنا چاہیے۔ فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾﴾ (آل عمران)

''تم سے ایک ایسی امت میں وجود میں آنی چاہیے (یا تمہارے اندر سے کم سے کم ایسی ایک امت تو قائم رہنی چاہیے) جو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور خیر کی طرف دعوت دے۔ اور وہی لوگ ہوں گے جو (اللہ تعالیٰ کے ہاں) کامیاب ہونے والے ہیں۔''

فلاح اور کامیابی کا وعدہ سوئی ہوئی امت سے نہیں ہے' ہاں ان سوئے ہوؤں میں سے جو جاگ جائیں اور اپنے فرضِ منصبی کو پہچانیں اور پھر اس کے لیے تن من دھن لگائیں' وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

اب تک میں نے آپ کے سامنے یہ بات رکھی کہ بحیثیت مجموعی یہ دونوں گویا ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دو پہیوں پر گاڑی چلتی ہے' ورنہ ایک پر تو گھومتی ہی رہے گی' آگے نہیں بڑھے گی۔ اس حوالے سے یہ بھی یاد رکھیے کہ ان دونوں میں سے نہی عن المنکر کی اہمیت زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں ایک بہت بڑے طبقہ کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ نہی عن

المنکر کی ضرورت نہیں ہے۔ بس نیکی کا حکم دیتے رہو' جب نیکی پھیلے گی تو منکر خود بخود مٹ جائے گا' جیسے روشنی آتی ہے تو اندھیرا خود بھاگ جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اگر صرف وہی کافی ہوتا تو قرآن مجید کی دس آیات میں دونوں کا تذکرہ ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) کے طور پر کیوں ہوتا؟ قرآن مجید (معاذ اللہ!) کوئی شاعری کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس میں لفاظی اور مبالغہ آمیزی ہے۔ اس میں جو لفظ اور جو بھی حرف آیا ہے' وہ اٹل اور لازم ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ درحقیقت یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں' لیکن ان کو اگر علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھیں گے تو از روئے قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ نہی عن المنکر اہم تر ہے۔

اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث میں بھی صرف نہی عن المنکر کا ذکر ہے' اس میں امر بالمعروف کا تو ذکر سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اب تک جو دو احادیث آپ کے سامنے بیان کیں' پہلی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسری حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی' ان میں بھی صرف نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔

نہی عن المنکر کے مراحل

زیر مطالعہ اربعین کی روایت میں نہی عن المنکر کے تین مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ تم میں سے جو کوئی بھی بدی کو دیکھے' اس کا فرض ہے کہ قوت سے اور بزورِ بازو اسے روکے۔ اگر آپ کے پاس قوت ہے تبھی تو قوت استعمال ہو گی۔ عام حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں بھی آپ کو قوت حاصل ہے وہاں یہ کام کرنا آپ کے لیے لازم ہو جائے گا۔ آپ اپنے گھر کے سربراہ ہیں تو اپنی فیملی کے اندر آپ پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ لازم ہو گا اور اگر آپ نہیں کرتے تو آپ مجرم شمار ہوں گے۔ البتہ آپ کا دوسروں کے اوپر ظاہر بات ہے کوئی زور نہیں چل سکتا تو وہاں آپ پر فرض نہیں ہو گا' اس لیے کہ آپ کو قوت حاصل نہیں ہے۔ آپ کا بچہ نماز نہیں پڑھتا' حالانکہ اس کے اوپر نماز فرض ہو چکی ہے تو آپ اسے مار سکتے ہیں' سزا دے سکتے ہیں' لیکن کسی دوسرے کے بچے کو آپ نہیں مار سکتے۔

اگر انسان میں بزورِ بازو برائی کو روکنے کی استطاعت نہ ہو تو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان زبان سے برائی کو برا کہے۔ واضح رہے کہ عدمِ استطاعت کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ میں ہمت نہیں ہے کہ آپ کھڑے ہو کر اس باطل کا مقابلہ کر سکیں تو کم ہمتی کی وجہ سے بھی عدمِ استطاعت ہو سکتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ماحول ایسا ہے کہ جس میں بولنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو' زبانوں پر تالے پڑ گئے ہوں تو اس صورت میں کم سے کم زبان سے تو بات کرو۔ یعنی اگر اس کے خلاف تمہارے پاس طاقت نہیں ہے تو زبان سے تو اسے برا کہو۔ اسی لیے فرمایا گیا: ((اَلَا اِنَّ اَفْضَلَ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))(۱) ''سن لو کہ افضل ترین جہاد یہ ہے کہ ایک ظالم حکمران کے سامنے حق کی بات کی جائے''۔ اس کے افضل ہونے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں اندیشہ ہوگا کہ وہ تمہاری گردن اڑا دے گا۔

نہی عن المنکر کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کے پاس نہ بزورِ بازو برائی کو روکنے کی طاقت ہے اور نہ زبان سے برائی کو برا کہنے کی ہمت ہے۔ اب اس عدمِ استطاعت کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص گونگا ہے اور وہ بول ہی نہیں سکتا اور اس میں یہ بھی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ لکھ کر بات کر سکے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ مصائب کو برداشت کر سکے' تو اس صورت میں وہ کم از کم دل میں تو برائی کو برا جانے۔ آپ کسی اور کو تو بدل نہیں سکتے' لیکن دل کے اندر برائی کے خلاف نفرت کے ہونے سے کم از کم آپ اور آپ کے اہل وعیال اس برائی سے بچ جائیں گے اور آپ اس ماحول کے رنگ میں نہیں رنگے جائیں گے۔ لیکن اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ کمزور ترین ایمان کے بعد تو باقی نتیجہ یہی ہے کہ اس کے بعد ایمان نہیں ہے۔ یعنی آپ بدی کو دیکھیں اور آپ کو رنج و افسوس بھی نہ ہو' آپ کے احساسات پر جوں بھی نہ رینگے' آپ کو کوئی صدمہ بھی نہ ہو تو پھر ایمان سرے سے موجود نہیں ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ماجاء فی الامر بالمعروف ونھی عن المنکر۔

اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ کا بچہ شدید بیمار ہے۔ آپ نے ہر طرح کا علاج کرا لیا ہے‘ ڈاکٹری علاج بھی کرا لیا‘ حکیموں سے علاج بھی کرا لیا‘ ٹونے ٹوٹکے سے بھی مدد لے لی‘ لیکن شفا نہیں ہو رہی۔ آپ بالکل بے بس ہیں اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا وہ بچہ اگر درد میں تڑپ رہا ہو تو آپ آرام سے سو جائیں گے؟ یہ تو نہیں ہوگا نا! اسی طرح اگر آپ بدی کو قوت کے ساتھ نہیں روک سکے یا بدی کے خلاف زبان سے بھی جہاد نہیں کر سکے تو کم سے کم دل سے تو نفرت کیجیے‘ جیسے کہ اپنے بچے کو دیکھ کر آدمی کو رنج ہوتا ہے‘ افسوس ہوتا ہے‘ صدمہ ہوتا ہے‘ کم سے کم یہ تو ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر آپ اپنے ایمان کی خیر منایئے۔

ناخلف لوگوں سے جہاد کے مراحل

قبل ازیں میں آپ کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ترجمہ سنا چکا ہوں‘ اب میں چاہتا ہوں کہ اس حدیث کو ذرا وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں‘ اس لیے کہ اس میں نہی عن المنکر کے مراحل کا بہت تفصیل سے تذکرہ ہے اور اس میں اُمت کے لیے اس ضمن میں واضح راہنمائی آ جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ)) ”کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو“ ((اِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ”مگر یہ کہ لازماً اس کی اُمت میں سے کچھ نہ کچھ اصحاب اور کچھ نہ کچھ حواری ضرور ہوتے تھے“۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواری تھے اور حواری کا لفظ خاص طور پر حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا‘ جبکہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھیوں کے لیے صحابہ کا لفظ آیا ہے اور یہاں پر دونوں الفاظ اکٹھے آ گئے ہیں۔ یہ حواری اور اصحاب کیا کرتے تھے‘ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا وہ بلاغت وفصاحت کی بہت اونچی مثال ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ دو کام کرتے تھے‘ پہلا کام یہ کرتے تھے: ((يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ)) ”اپنے نبی کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے“ —— جیسے ہم حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان پڑھ چکے ہیں: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ

الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ ، تَمَسَّکُوْا بِھَا، وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ)) ''پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑنا اور اسے داڑھوں سے قابو کرنا'' —— دوسرا کام یہ کرتے تھے: ((وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ)) ''اور اپنے نبی کے حکم پر عمل پیرا ہوتے تھے۔''

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ)) ''پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ناخلف لوگ آ جاتے تھے''۔ دیکھئے یہ عمرانیات کا بہت بڑا قاعدہ بیان ہو رہا ہے کہ ہر کمال کے بعد زوال بھی آتا ہے۔ ہر نبی کی آمد پر اس کے کچھ ساتھی بن گئے۔ ان کی کاوشوں سے معاشرے میں بہت نیکی پھیل گئی اور معاشرے میں بہت اچھائی آ گئی۔ وقت گزرتا گیا اور رفتہ رفتہ شیطان اپنا کام کرتا رہا۔ شیطان کے ایجنٹ انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنات میں سے بھی' تو ان کی کارروائیوں سے پھر زوال تو آتا ہی ہے۔ جیسے حضور ﷺ کی جماعت کو بھی زوال آیا۔ خلافت راشدہ تیس برس تک قائم رہی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ملوکیت آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ناخلف لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ کرتے کیا ہیں؟ دیکھئے رسول اللہ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کہ آپؐ نے ان کے بھی دو ہی کام بتائے۔ پہلا یہ کہ: ((یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ)) ''وہ کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے''۔ یعنی نیکی کی ڈینگیں مارنا' اپنے تقویٰ اور تدین کا اشتہار دینا' یا لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا لیکن خود اس پر عمل نہ کرنا۔ اور دوسرا کام یہ تھا کہ: ((وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ)) ''اور وہ کرتے وہ کام تھے جن کا حکم ہی نہیں ہوا تھا''۔ یعنی نئی سے نئی بدعات و رسومات' نئی سے نئی تقریبات' نئے سے نئے جشن۔

جب یہ ناخلف لوگ پیدا ہو جائیں تو پھر نبی کے بچے کھچے اصحاب و حواریوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے' اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ''پس جو بھی ان کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے گا تو وہ مؤمن ہے''۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور میں نے اپنی کتاب میں اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ کیا کسی

فاسق اور فاجر حاکم کے خلاف بغاوت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک بڑا احساس معاملہ ہے۔ علماء کی اکثریت اسی بات کی قائل ہے کہ فاسق اور فاجر حکمران کے خلاف تب تک بغاوت جائز نہیں جب تک کہ وہ بدی کا حکم نہ دے۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ خود بدی کا ارتکاب کر رہا ہے' اس کے قول و فعل میں تضاد ہے' اس نے مختلف بدعات ایجاد کر لی ہیں اور وہ اپنے محل کے اندر عیاشیاں کر رہا ہے' لیکن وہ کسی کو بدی کا حکم نہیں دے رہا تو اس وقت تک اس کے خلاف خروج اور مسلح بغاوت کو علماء کی اکثریت صحیح نہیں سمجھتی۔ لیکن میں اس معاملے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کا قائل ہوں کہ فاسق و فاجر حکمران کے خلاف بغاوت ہوسکتی ہے' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پہلے اتنی طاقت مہیا ہو جائے کہ کم سے کم ظاہری حالات و واقعات کے مطابق کامیابی یقینی نظر آئے۔ پھر کامیابی ملے یا نہ ملے' یہ بعد کی بات ہے ؎

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

اگر آپ ایسے ناخلف لوگوں کے خلاف جہاد بالید یعنی قتال نہیں کر سکتے تو پھر اس کا اگلا درجہ یہ ہے: ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے تو وہ بھی مؤمن ہے''۔ قتال سے کم تر درجہ یہ ہے کہ زبان سے جہاد کرو' تنقیدیں کرو' برملا کرو' جلسوں میں کرو' سرعام کرو' چوکوں میں کھڑے ہو کر کرو' نعرہ لگاؤ کہ یہ غلط ہے! اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے قوت بہم پہنچے گی۔ اگر یہ نہیں کریں گے تو لوگ کیسے جمع ہوں گے اور بدی کا استیصال کرنے لیے طاقت کہاں سے آئے گی؟ اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ: ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو ان کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا تو وہ بھی مؤمن ہے''۔ دل سے جہاد یہ ہے کہ آپ کے دل میں اس کے لیے نفرت ہے۔ اگر آپ کے دل کے اندر واقعتاً نفرت ہوگی تو آپ کے وجود سے وہ ظاہر ہوگی۔ آپ تو خاموش رہیں گے' لیکن آپ کے وجود سے ظاہر ہوگا کہ آپ کو اس چیز سے نفرت ہے۔ آپ کا طرزِ عمل بتائے گا کہ آپ اس باطل کے ساتھ

تعاون تو نہیں کر رہے' آپ اس باطل کے تحت آرام سے پاؤں پھیلا کر تو نہیں سوتے۔ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کا جہاد ہے۔

اس آخری درجے کو بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:((وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ''اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے''۔اس سے آپ اندازہ کیجیے کہ اگر یہ نہیں ہے تو پھر ایمان نہیں ہے۔کم سے کم دل سے نفرت' دل میں گھٹن' دل میں رنج وغم اور صدمہ تو ہونا چاہیے کہ یہ ماحول کدھر جا رہا ہے اور یہ کیا رنگ ہے جو ہمارے معاشرے پر چڑھتا جا رہا ہے۔ہمارے معاشرے میں بے حیائی' عریانی اور منکرات کا طوفان آ رہا ہے (آج کل تو منکرات اور بے حیائی و فحاشی کو ثقافت اور آرٹ کے بڑے خوبصورت نام دیے جا رہے ہیں) ان پر آپ کو رنج و صدمہ تو کم سے کم ہونا چاہیے۔اگر یہ بھی نہیں ہے تو آپ کے اندر ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔

نہی عن المنکر نہ کرنے والے عابدوں کا انجام

آج کے موضوع کے حوالے سے ایک حدیثِ قدسی بہت چونکا دینے والی ہے۔ یہ حدیث مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرتب کردہ ''خطباتِ جمعہ'' میں موجود ہے۔اکثر تھانوی مساجد میں یہ خطبے پڑھے جاتے ہیں اور خطبہ ثانیہ میں یہ حدیث پڑھی جاتی ہے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرِيْلَ علیہ السلام: اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا)) ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی کی کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں پر الٹ دو''۔ ایسا عذابِ الٰہی قومِ لوط اور بہت سی قوموں پر آیا ہے۔((قَالَ: يَارَبِّ! اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ)) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ''اس پر حضرت جبرائیلؑ نے عرض کیا: پروردگار! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے (جو اتنا نیک' اتنا زاہد اور اتنا عبادت گزار ہے) کہ اس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی''۔اب کسی کی نیکی' تقویٰ اور زہد کا اندازہ آپ اس سے کیجیے کہ یہ گواہی دینے والے

حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں اور اللہ کی جناب میں گواہی دے رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کی جناب میں تو ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بولے گا' اور فرشتے کے جھوٹ بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قَالَ ((فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ' فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ))(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الٹو ان بستیوں کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بدلا''۔ فرض کیجیے آپ کو کوئی گالی دے اور آپ میں تھوڑی سی بھی طاقت ہے تو کیا آپ اسے جانے دیں گے؟ اگر طاقت نہیں ہے' گالی دینے والا بہت طاقتور ہے اور آپ کمزور ہیں تو کم سے کم آپ کا چہرہ تو سرخ ہو جائے گا نا! اس لیے کہ غیرت وحمیت کا بھی کچھ تقاضا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث قدسی میں بھی اللہ عزوجل نے یہی فرمایا کہ اس کے چہرے کا رنگ تک کبھی نہیں بدلا' حالانکہ ان بستیوں کے اندر بدی پھیلتی رہی' ان میں منکرات کی اشاعت ہوتی رہی اور یہ آرام سے اپنی عبادت میں لگا رہا: ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

معاشرے میں کیا ہو رہا ہے' اسے پتا ہی نہیں ہے۔ بس اپنی خانقاہ میں بیٹھا ہوا ہے' کوئی اگر آ گیا تو اسے کلمہ خیر سنا دیا' ورنہ کچھ نہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا! یعنی جو اس کے مرید ہو گئے ان کا تزکیہ تو وہ کر رہا ہے لیکن باقی ماحول سنسان ہے۔ باہر نکل کر وہ اپنا کردار ادا نہیں کر رہا' جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری!

(۱) رواه البيهقى فى شعب الايمان۔ بحواله مشكاة المصابيح' كتاب الآداب' باب الامر بالمعروف' الفصل الثالث

نہی عن المنکر نہ کرنے والے عذاب سے مستثنیٰ نہیں!

اب میں تیسری بات آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ کسی معاشرے میں اگر کوئی بدی جڑ پکڑ جائے اور اتنی پھیل جائے کہ پھر وہ معاشرہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو جائے تو اس صورت میں جو عذاب آتا ہے' قرآن مجید کے دو مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوتے ہیں جو بدی کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں' حکم دیتے رہیں' اپنی سی کوشش کرتے رہیں' باقی سب اس عذاب کی پکڑ میں آ جاتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں بنی اسرائیل کے ایک خاص قبیلے کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ وہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ آباد تھا اور ان کا ذریعہ معاش ماہی گیری تھا' یعنی مچھلی پکڑنا' اسے کھانا بھی اور بیچنا بھی۔ یہودیوں کے ہاں چونکہ یوم السبت کی حرمت ہے —— اصل میں تو ان کے لیے حرمت والا دن یوم الجمعہ ہی تھا' لیکن انہوں نے خود اپنی شرارتِ نفس سے یوم السبت اپنا لیا' اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اسی کی حرمت لازم قرار دے دی —— چنانچہ ہفتہ کا پورا دن ان کے لیے ہر قسم کا کاروبارِ زندگی حرامِ مطلق تھا۔ اس قدر سخت حکم تھا' جبکہ ہمارے ہاں یہ حکم صرف جمعہ کی اذان سے لے کر نمازِ جمعہ کی ادائیگی تک ہے۔ بمصداق:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الجمعة)

''اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو یاد کرو کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

یعنی جب اذان ہو جائے تو تمام کاروبار چھوڑ کر جمعہ کے لیے نکل کھڑے ہو اور جب جماعت سے فارغ ہو جاؤ تو کاروبار جائز ہے' بلکہ امر کے صیغہ میں فرمایا کہ جاؤ اللہ کا

فضل تلاش کرو! کس قدر آسانیاں ہیں شریعتِ محمدیؐ میں۔ یہی حکم اگر چوبیس گھنٹوں پر پھیلا دیا جائے کہ جمعرات کے غروبِ شمس سے اگلے دن کے غروب تک ہر طرح کا کاروبار حرام ہے تو یقیناً یہ سخت حکم ہوگا۔ یہودیوں پر یہ حکم ہفتہ کے دن کے لیے تھا کہ پورا دن کوئی کاروبار نہیں کرنا۔ وہاں معاملہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی شعور دیا ہے تو مچھلیوں کو اندازہ ہوگیا کہ ہفتہ کا ایک دن ایسا ہے جس میں یہ ہمیں پکڑتے ہی نہیں، جبکہ باقی چھ دن تو ہماری جان پر بنی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہفتے کے دن مچھلیاں ساحل کے قریب اس شان سے آتی تھیں کہ اٹھلا رہی ہیں، چھلانگیں لگا رہی ہیں اور یہ بیچارے ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کے مصداق دیکھ رہے ہیں، لیکن پکڑ نہیں سکتے، اس لیے کہ یہ حرام ہے۔

اس پر شیطان نے انہیں ورغلایا کہ کوئی حیلہ کرو تو انہوں نے یہ حیلہ کیا کہ ہفتہ کے دن ساحل سمندر کے قریب بڑے بڑے گڑھے کھودتے اور نہر کی شکل میں سمندر کا پانی ان میں لے آتے تو مچھلیاں بھی پانی کے ساتھ ان گڑھوں میں آ جاتیں اور شام کو ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیتے۔ مچھلیاں ان تالاب نما گڑھوں میں محصور ہو کر رہ جاتیں اور وہ اگلے روز اتوار کو جا کر انہیں پکڑ لیتے تھے۔ یہ ہوتا ہے حیلہ۔ یوم السبت کی اصل حکمت تو یہ تھی کہ ہفتہ کا پورا دن تم یادِ الٰہی، عبادت و ریاضت اور دعا و مناجات میں بسر کرو، تورات کی تلاوت کرو۔ یعنی اس دن دنیوی کاروبار نہ کرو اور یہ کام کرو! لیکن وہ کام تو تم نے کیا نہیں۔ ٹھیک ہے تم نے مچھلیاں نہیں پکڑیں، لیکن سارا دن تو لگے رہے گڑھے کھودنے، مچھلیوں کو ادھر لانے اور یہاں پر انہیں بند کرنے میں۔ اس حیلہ پر قوم تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو دھڑلے سے یہ کام کر رہے تھے۔ ایک وہ تھے کہ جو خود تو یہ نہیں کر رہے تھے لیکن کرنے والوں کو روکتے بھی نہیں تھے۔ خاموش تھے کہ دفع کرو انہیں، جو کرتے ہیں کرتے رہیں، ہمیں کیا! ایک وہ تھے جو خود یہ کام کرتے بھی نہیں تھے اور کرنے والوں کو روکتے بھی تھے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۝۱۶۵﴾ (الاعراف)

''پھر جب انہوں نے نظر انداز کر دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی' تو ہم نے بچا لیا ان کو جو برائی سے روکتے تھے اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جو ظلم کے مرتکب ہوئے تھے بہت ہی برے عذاب میں' ان کی نافرمانی کے سبب۔''

اب یہاں پر ایک تفصیل طلب نکتہ ہے۔ بعض لوگ جو رجائیت پسند ہیں اور روشن پہلو لوگوں کے سامنے زیادہ رکھنا چاہتے ہیں' ان کا کہنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے واقعی حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی ان پر تو عذاب آیا اور جنہوں نے ان کو روکا ان پر نہیں آیا' لیکن جنہوں نے روکا نہیں ان کا ذکر یہاں پر نہیں ہے۔ گویا ان کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے روکا تو نہیں' لیکن ظاہر بات ہے انہوں نے خود تو گناہ کا ارتکاب نہیں کیا' لہٰذا ان کے لیے بھی بچاؤ کا ایک راستہ نکل آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے ان کو بھی بچا لے گا۔ لیکن اکثر مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور نہی عن المنکر نہ کرنے والوں کے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ انہوں نے نہی عن المنکر نہ کر کے گناہ کا ارتکاب کیا' اس لیے کہ انہیں حکم تھا کہ بدی سے روکیں' لیکن جب نہیں روکا تو انہوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی' تو فسق (نافرمانی) کا ارتکاب کرنے والوں کے اندر یہ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ جنہوں نے روکا نہیں ان پر بھی وہ عذاب آیا۔ چنانچہ سورۃ الانفال میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ (آیت ۲۵)

''اور بچو اُس عذاب سے جو خاص طور پر صرف گناہ گاروں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔''

یعنی پھر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ یہی بات سورۂ ہود میں بایں الفاظ کہی گئی ہے:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۱۶)

''تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں حق کے ایسے علمبردار ہوتے جو (اپنی اپنی قوموں کے لوگوں کو) روکتے زمین میں فساد مچانے سے' مگر بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے' جنہیں ہم نے اُن میں سے بچا لیا۔''

معلوم ہوا کہ عمومی عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ بدی سے روکنے کا عمل جاری رکھیں' ورنہ آپ بھی عذابِ الٰہی کی زد میں ہوں گے۔

صدیقین کے درجے کے مستحق کون؟

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' بدی سے روکنے میں تینوں درجے شامل ہو جائیں گے۔ دل میں بدی سے حقیقتاً نفرت ہو تب بھی اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا' لیکن زبان سے بات کرنا اس سے اوپر کا درجہ ہے اور قوت کے ساتھ روکنا بلند ترین کا درجہ ہے۔ قوت موجود نہیں ہے تو اس مقصد کے لیے قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ جیسے کہ حدیث میں آیا ہے:

((مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ))(۱)

''جس شخص کو موت آ گئی اس حال میں کہ وہ اس نیت کے ساتھ علم حاصل کر رہا تھا کہ اس کے ذریعے دین اسلام کو زندہ کرے گا تو جنت میں اُس کے اور نبیوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔''

ظاہر بات ہے کہ اس علم سے ایمان اور شریعت والا علم ہی مراد ہوگا جس کے ذریعے سے شریعت کو زندہ کیا جائے' نافذ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ علم حاصل کر رہا تھا اور ابھی وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوا تھا' لیکن احیاءِ دین کی نیت سے پورے تن من دھن کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس حال میں اس کو موت آ گئی تو اس کے لیے اتنی بڑی خوشخبری ہے کہ جنت میں اس کے اور نبیوں کے درمیان ایک درجہ کا فرق ہوگا۔ یعنی وہ صدیقین میں شمار ہوگا' اس لیے کہ انبیاء کے بعد صدیقین کا درجہ ہے۔

فریضہ نہی عن المنکر سے پہلوتہی پر بنی اسرائیل کا انجام

آخر میں' میں آپ کے سامنے بنی اسرائیل کا تذکرہ کروں گا۔ نہی عن المنکر سے پہلوتہی اور اعراض کا معاملہ اہل کتاب میں بھی ہو گیا تھا اور اسے اُمتِ مسلمہ کے لیے گویا تنبیہہ کے طور پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا:

﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ

(۱) رواہ الدارمی' عن الحسن مرسلاً۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب العلم' الفصل الثالث۔

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾ (المائدۃ)

''کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے درویش (صوفی اور پیر و مرشد) اور علماء و فقہاء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے؟ بہت ہی برا ہے وہ کام جو وہ کر رہے ہیں۔''

یعنی بنی اسرائیل کے اولیاء اللہ' صوفیاء' مشائخ' احبار یا بڑے بڑے علماء نے اپنے لوگوں کو گناہ کی بات زبان سے کہنے اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکا؟ جب انہوں نے اپنے فرضِ منصبی کو ادا کرنے سے اعراض کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو اس مقام و منصب سے معزول کر دیا جو ان کو عطا ہوا تھا اور پھر ہماری اُمت کو اُمتِ مسلمہ کا درجہ دے دیا گیا۔ اسی منصب پر ہم سے پہلے بنی اسرائیل دو ہزار برس تک فائز رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اب ہمیں بھی چودہ سو برس ہو گئے ہیں۔ بحیثیتِ اُمت ان کی تاریخ شروع ہوتی ہے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام تک چودہ سو برس کا عرصہ تھا۔ بنی اسرائیل کے خلاف قرآن مجید میں جو فردِ جرم آئی ہے' ان جرائم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے راہب اور علماء اپنی قوم سے نذرانے لیتے رہے' ان سے خدمتیں اور اکرام کراتے رہے' لیکن انہیں بدی سے نہیں روکا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ان کے جرائم میں سے ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾﴾ (المائدۃ)

''(ان لوگوں کے جرائم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ) وہ نہیں روکتے تھے ایک دوسرے کو اس منکر سے جو وہ کرتے تھے۔ بہت ہی بری ہے وہ بات جو وہ کر رہے تھے۔''

اس ضمن میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے جو خرابی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ ان کے علماء لوگوں کو روکتے تو تھے کہ یہ غلط کام ہے' یہ برا کام ہے' لیکن ان کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے سے احتراز نہیں کرتے تھے' ان کے دستر خوانوں پر جا کر بہترین' لذیذ اور مرغن کھانے کھاتے تھے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی ویسا ہی خراب کر دیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ فِی الْمَعَاصِیْ نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ یَنْتَهُوْا' فَجَالَسُوْهُمْ فِیْ مَجَالِسِهِمْ وَوَاکَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ' فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلٰی لِسَانِ دَاوُدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ' ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ))(۱)

''جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے تو (ابتدا میں) اُن کے علماء نے اُن کو ان سے روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے' لیکن (اس کے باوجود) انہوں نے اُن کی ہم نشینی اور ان کے ساتھ باہم کھانا پینا جاری رکھا تو (اس کے نتیجے میں) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا اور پھر ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم (علیہا السلام) کی زبانی لعنت فرمائی' اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے۔''

الغرض منکرات سے دل میں نفرت' جسے کمزور ترین ایمان قرار دیا گیا ہے' کا تقاضا یہ ہے کہ برائی کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کے ساتھ دوستی نہ رکھی جائے۔ آپ ہر رات کو دعائے وتر میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں: وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ یَّفْجُرُكَ ''اے اللہ! جو بھی تیری نافرمانی کرے ہم اس سے ترکِ تعلق کرتے ہیں اور اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں''۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ لیکن اگر بالفعل ان سے ترکِ موالات نہیں ہے' انہی میں گھل مل رہے ہیں' ہنسی اور گپ شپ ہو رہی ہے تو یہ ایمان کی نفی ہے۔ ان سے ملاقاتیں کرنی ہیں تو دعوتِ دین کی خاطر کریں' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے کریں —— ورنہ برائی سے نفرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ سوشل بائیکاٹ کیا جائے اور اس طرح کم سے کم اپنے آپ کو بچا لیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

(۱) سنن الترمذی' ابواب التفسیر' باب ومن سورۃ المائدۃ۔

حدیث

35

اسلامی معاشرت کے اصول

اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی بنیادیں

۴ جولائی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ (الحجرات)

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبة: ۷۱)

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝ (المائدة)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((لَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ، وَلَا يَخْذُلُهٗ، وَلَا يَحْقِرُهٗ، التَّقْوٰى هٰهُنَا)) وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ((بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ يَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ))(۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، (کوئی چیز خریدنے کا ارادہ نہ ہو اور کوئی دوسرا شخص

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم......

خریدر ہا ہوتو) خواہ مخواہ بولی میں حصہ لے کر قیمت نہ بڑھاؤ کہ (وہ چیز اسے مہنگی ملے)۔ آپس میں بغض نہ رکھو' ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو' کسی کی بیع پر کوئی شخص بیع نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' وہ اس (مسلمان بھائی) پر نہ تو ظلم کرتا ہے' نہ اس کی مدد ترک کرتا ہے اور نہ اسے حقیر سمجھتا ہے''۔ آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے تین بار فرمایا: ''تقویٰ یہاں ہے۔ (مزید فرمایا:) انسان کے لیے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے' یعنی اس کا خون' مال اور عزت و آبرو۔''

معزز سامعین کرام!

آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی ۳۵ ویں حدیث ہے اور اس کا موضوع ہے: اسلامی معاشرت کے اصول —— مسلمانوں میں باہمی اخوت' باہمی خلوص و اخلاص اور باہمی حمایت و تعلق کی جو کیفیت ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس کی تاکید موجود ہے اور ان میں سے تین آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں۔ پہلی آیت سورۃ الحجرات کی ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ⑩﴾ (الحجرات)

''یقیناً تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں' پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

حُریت' مساوات اور اخوت کا وسیع تر تصور

امر واقعہ یہ ہے کہ اخوتِ باہمی کا جو وسیع تر تصور اسلام نے دنیا میں پیش کیا ہے' یہ اور کہیں موجود نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اسے اپنے اشعار میں سمویا ہے:

کُلُّ مُؤْمِن اِخْوَةٌ اندر دلش حُریت سرمایۂ آب و گِلش

یعنی مؤمن کے دل میں یہ بات موجود ہوتی ہے کہ تمام مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور بندہ مؤمن کی سرشت میں حریت و آزادی موجود ہے۔ انسان اگر ایک اللہ کی

غلامی کر لے تو اسے تمام غلامیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے اخوت کا وسیع تر تصور اسلام کے سوا اور کہیں نہیں ملتا' اسی طرح حریت کا یہ وسیع تصور بھی آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی غلامی تو موجود ہوتی ہے' چاہے وہ بادشاہوں کی غلامی ہو یا جمہوریت میں اکثریت کی غلامی ہو۔ جمہوریت میں اکثریت کی رائے ماننے پڑے گی چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو اور اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کی رائے نہیں چلے گی' چاہے وہ صحیح ہو۔ اسی لیے اقبال نے جمہوریت پر طعن کرتے ہوئے کہا تھا ؎

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے!

ان غلامیوں سے بڑھ کر بھی ایک غلامی ہے اور وہ اپنے نفس کی غلامی ہے۔ سورۃ الفرقان میں اس حوالے سے فرمایا گیا: ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (آیت ۴۳) ''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟''—— ان تمام غلامیوں سے آزادی اہل ایمان کی سرشت اور فطرت میں شامل ہے۔

دینِ اسلام کے بغیر امتیازات کا خاتمہ ممکن نہیں

اخوت اور حریت کی طرح مساوات کا وسیع تر اور صحیح تصور بھی اسلام ہی نے پیش کیا ہے اور اسلام ہی تمام بنی نوعِ انسان میں ہر طرح کے امتیازات کو ختم کرتا ہے۔ ؎

ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ

بندۂ مؤمن انسانوں میں امتیازات کو اہمیت نہیں دیتا۔ یہ کالا یہ گورا' یہ مشرقی یہ مغربی' یہ اونچی ذات' یہ نیچی ذات —— ان تمام امتیازات سے آزاد کرنے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف اللہ کا دین ہے' اور کوئی نہیں ہے۔ ورنہ ہمیشہ امتیازات ہوں گے اور یہ کبھی ختم نہیں ہو سکیں گے۔ کالے گورے کا امتیاز آج بھی امریکہ میں ختم نہیں ہوا

ہے۔ اگرچہ قانونی اور دستوری اعتبار سے جتنی وہاں کوشش کی گئی اس سے زیادہ کوشش ناممکن ہے۔ وہاں پر امتیازی سلوک (discrimination) بہت بڑا جرم ہے۔ اس پر مقدمہ بنتا ہے' سزا ملتی ہے۔ لیکن قانون کی دل پر تو حکمرانی نہیں ہوتی۔ دل میں احساسات موجود ہوتے ہیں' جو صرف ایمان و یقین کے ذریعے بدلتے ہیں کہ تمام انسان چاہے کالے ہوں' گورے ہوں' سفید ہوں' سرخ ہوں' شرقی ہوں' غربی ہوں' پیلے ہوں' براؤن ہوں' سب اللہ کی مخلوق ہیں اور سب آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ ان سب کا باپ اور ماں مشترک ہے۔ انسانوں میں رنگ ونسل کا امتیاز تب تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک دو چیزوں پر ایمان نہ ہو: (۱) سب کا خالق اللہ ہے' اور (۲) ساری نوعِ انسانی ایک جوڑے آدم وحوا کی نسل ہیں۔ ڈارون کے نظریے نے تو انسان کی انسانیت ہی کا انکار کر دیا' چنانچہ اس نظریے کے مطابق انسانوں کے درمیان کوئی چیز مشترک ہے ہی نہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس وقت بھارت کو جمہوریت کی معراج پر سمجھا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ واقعی یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے جمہوریت پر تسلسل کے ساتھ عمل کر کے دکھایا ہے۔ وہاں شرح خواندگی انتہائی نچلے درجے (low literacy percentage) پر ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں پر شرح خواندگی زیادہ نہ ہو' وہاں جمہوریت نہیں چل سکتی۔ لیکن انہوں نے شرح خواندگی انتہائی کم درجے پر ہونے کے باوجود جمہوریت کو چلا کر دکھایا ہے اور یہ کسی معجزہ سے کم نہیں ہے' لیکن اونچ نیچ کا فرق وہاں ختم نہیں ہو سکا۔ برہمن اونچا ہے' اچھوت اور شودر نیچے ہیں' اور انہیں مذہبی تعلیمات سننے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ کسی محفل میں کوئی پنڈت بیان کر رہا ہو اور وہاں سے کوئی شودر گزرے اور اس کے کان میں کسی اشلوک کی آواز پڑ جائے تو سیسہ پگھلا کر اس کے کان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں بھی حکومتی سطح پر بڑی کوششیں ہوئی ہیں' لیکن آج بھی وہاں اونچ نیچ کا یہ فرق اسی طرح موجود ہے۔ ہمارے علم میں وہاں کے جو ہندو مسلم فسادات آتے ہیں' ان سے بڑھ کر فسادات وہاں اونچی ذات اور نیچی ذات کے ہندوؤں کے درمیان ہوتے ہیں۔ نچلی ذات کے ہندوؤں کی

تو پوری کی پوری بستیاں جلا دی جاتی ہیں۔

بہرحال بندۂ مؤمن کی سرشت میں مساوات موجود ہے کہ تمام انسان مساوی ہیں' پیدائشی طور پر کوئی اونچا نہیں' کوئی نیچا نہیں۔ عورت اور مرد میں بھی کوئی اونچ نیچ نہیں ہے اور وہ دونوں ہی اللہ کی مخلوق ہیں۔ دونوں اگر بہن بھائی ہیں تو دونوں ایک ہی باپ کے نطفے سے ہیں اور انہوں نے ایک ہی ماں کے رحم میں پرورش پائی ہے۔ ہاں معاشرتی نظام میں مرد و عورت میں فرق ہے۔ جیسے آپ کے دفتر میں بحیثیت انسان سب برابر ہیں' لیکن انتظامی معاملات میں چپڑاسی اور افسر برابر نہیں ہیں' اسی طرح گھر کے ادارے (institution) کے انتظامی معاملات چلانے کے لیے مردوں کو ایک طرح کا اختیار دیا گیا ہے اور ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ کے مصداق گھر کا سربراہ مرد کو بنایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزی کمانا مرد کے ذمے ہے' نہ کہ عورت کے۔

اللہ کے دوست اور ولی کون؟

دوسری آیت جو میں نے ابتدا میں تلاوت کی' وہ سورۃ التوبہ کی آیت ۷۱ ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان مرد و زن کو ایک دوسرے کے ولی قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ﴾ (التوبۃ: ۷۱)

''مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔''

ولی کا لفظ بہت گھمبیر ہے اور ایک لفظ میں اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مددگار' حامی' پشت پناہ' آپ یہ سارے الفاظ جمع کر لیجیے تو ولی بنے گا۔ اس آیت میں تو فرمایا گیا کہ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں' جبکہ اس سے قبل آیت ۶۷ میں منافق مرد و زن کو ایک دوسرے کا ولی قرار دیا گیا ہے: ﴿اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ﴾ ''منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے میں سے ہی ہیں''۔ یعنی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

تیسری آیت سورۃ المائدۃ کی ہے جس میں حزب اللہ کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں اور ان کا ایک وصف یہ بیان ہوا ہے: ﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴿۵۵﴾﴾ ''(دیکھو مسلمانو!)

تمہارے ولی تو اصل میں بس اللہ‘ اُس کا رسولؐ اور اہل ایمان ہیں جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں جھک کر‘‘۔اس دائرے سے باہر تمہاری ولایت نہیں جائے گی۔ کافروں‘ غیر مسلموں‘ یہودیوں اور نصرانیوں سے تمہاری ولایت اور دوستی نہیں ہونی چاہیے۔ البتہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ ہو سکتا ہے‘ وہ بھی صرف ان کے ساتھ جو ہمارے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف نہیں ہیں۔ سورۃ الممتحنہ میں یہ موضوع تفصیل سے آیا ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ ﴾(آیت ۸) ’’اللہ تمہیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے کبھی جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ کوئی بھلائی کرو یا انصاف کا معاملہ کرو‘‘۔ یعنی جن غیر مسلموں نے تمہارے خلاف کوئی محاذ آرائی نہیں کی‘ تم پر چڑھائی نہیں کی‘ تم سے لڑتے نہیں ہیں‘ تمہارے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے منع نہیں کرتا۔ لیکن ان کے ساتھ بھی ولایت‘ قلبی تعلق اور محبت نہیں ہوگی‘ صرف حسنِ سلوک تک کا معاملہ ہوگا‘ جبکہ ولایت اور محبت پہلے نمبر پر اللہ سے ہے‘ دوسرے نمبر پر رسول ﷺ سے ہے‘ اور تیسرے نمبر پر اہل ایمان سے ہے۔

اگلی آیت میں ایسے لوگوں کو اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) قرار دیا گیا ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶﴾(المائدۃ) ’’اور جو کوئی دوستی قائم کرے گا اللہ‘ اُس کے رسول (ﷺ) اور ایمان والوں کے ساتھ (تو وہ شامل ہو جائے گا اللہ کی پارٹی میں) پس سن لو کہ اللہ کی پارٹی ہی غالب رہنے والی ہے‘‘۔ یعنی جو اہلِ ایمان یہ تقاضے پورے کر دیں گے کہ ان کے ولی اللہ‘ اس کا رسول ﷺ اور اہلِ ایمان ہی ہیں تو یہ لوگ حزب اللہ بن جائیں گے اور حزب اللہ کے لیے یہ خوش خبری ہے کہ وہی بالآخر غالب ہونے والی ہے۔

حسد اور تکبّر کی ممانعت

قرآن مجید سے یہ تین مقامات میں نے ابتدا میں بیان کیے تھے‘ جن پر ایک نظر ہم

ڈال چکے ہیں۔اب آیئے حدیث کی طرف۔زیر مطالعہ حدیث میں کچھ منفی احکام آ رہے ہیں کہ یہ نہ کرو‘یہ نہ کرو‘جبکہ اس کے برعکس بعض احادیث میں مثبت احکام آئے ہیں کہ یہ کرو‘یہ کرو!

زیر مطالعہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((لَا تَحَاسَدُوْا)) ’’آپس میں حسد مت کرو‘‘۔حسد اور تکبر بدترین گناہ ہیں اور یہی وہ مرض تھے جن کی وجہ سے عزازیل (شیطان) راندۂ درگاہ ہوا۔وہ مقربین بارگاہ میں سے تھا اور اسے اللہ کا بہت قرب حاصل تھا۔جنوں اور ملائکہ میں واضح فرق موجود ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور جن آگ سے‘ جبکہ انسان کو آب وگل یعنی پانی اور مٹی کے ملغوبے اور گارے سے پیدا کیا گیا ہے۔پانی اور مٹی کا ملغوبہ کثیف شے ہے‘ جبکہ اس کے مقابلے میں نور بھی لطیف ہے اور نار بھی لطیف ہے۔نور اور نار میں مماثلت کی وجہ سے جنّات اور فرشتوں میں ایک طرح کا قرب ہے۔چنانچہ عزازیل نامی جن اپنی عبادت اور علم کی وجہ سے اتنا آگے بڑھا کہ فرشتوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ لیکن اُس نے حسد اور تکبر میں آ کر مار کھائی ہے کہ آدم کو خلافت کا یہ مقام کیوں دے دیا گیا‘ حالانکہ یہ تو میرا حق تھا‘ اس لیے کہ میں اس سے بہتر ہوں: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾﴾ (الاعراف) ’’میں اس سے بہتر ہوں‘ مجھے تو نے آگ سے بنایا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے (تو میں اسے کیسے سجدہ کروں)‘‘۔الغرض حسد اور تکبر نے اسے کہاں سے کہاں لا گرایا کہ یہ اسفل السافلین میں جا گرا۔

یہی حسد و تکبر کا معاملہ تھا جس کی وجہ سے یہودی بحیثیت مجموعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رہے۔صرف چند یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ان میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی تھے‘ جو ایک بہت بڑے یہودی عالم تھے۔لیکن اکثر یہودی ایمان نہیں لائے تھے‘ حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔قرآن کہتا ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرۃ:١٤٦) ’’وہ ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں‘‘۔لیکن ایمان نہ لانے کی اصل وجہ وہی حسد اور تکبر ہے کہ یہ نبوت تو ہماری جاگیر تھی۔آپ کو معلوم ہے کہ تقریباً دو ہزار برس تک

نبوت انہی میں رہی ہے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ چلا ہے' جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں تو نبوت تھی ہی نہیں۔ ان کی نسل سے تو بس آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں' جبکہ دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام نبی ہیں' ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام نبی ہیں' پھر ان کے بیٹے یوسف علیہ السلام نبی ہیں' پھر کچھ عرصے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام نبی ہیں۔ اس کے بعد چودہ سو برس تک ان میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں اور ان میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نبی موجود رہا ہے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ)) ''بنی اسرائیل کے سیاسی راہنما انبیاءؑ ہوا کرتے تھے''۔ یعنی سیاسی معاملات' حکومتی معاملات' انتظامی معاملات' سب کے سب انبیاء کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ ((كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ))(۱) ''جب بھی کوئی نبی فوت ہو جاتا تھا تو کوئی اور نبی اس کی جگہ آ جاتا تھا۔''

اس صورتِ حال میں انہوں نے یہ سمجھا کہ نبوت ہماری جاگیر بن گئی ہے۔ چنانچہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو انہوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ نبوت ان اُمیین میں کیسے چلی گئی۔ یہ تو اَن پڑھ لوگ ہیں' جن کے پاس نہ کوئی شریعت ہے' نہ کوئی کتاب ہے۔ یہود تو بنی اسماعیل کو کمتر سمجھتے تھے اور اَن پڑھ اور جاہل گردانتے تھے' لہٰذا وہ اسی حسد میں ماننے کو تیار نہیں تھے۔ پھر ان میں تکبر بھی تھا اور وہ کہا کرتے تھے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾ ''ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں''۔ چنانچہ حسد اور تکبر نے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا کہ اب اللہ تعالیٰ کی مغضوب ترین قوم یہود ہے۔ اگرچہ اس وقت اللہ نے انہیں عیسائیوں کے ہاتھوں کچھ سہارا دلوایا ہے۔ اس ضمن میں بڑی تلخ بات کہہ رہا ہوں کہ اس وقت یہود و نصاریٰ کا گٹھ جوڑ اسی لیے ہے تاکہ امتِ مسلمہ (خاص طور پر اس کے نیوکلیس عالمِ عرب) کو ان کے ہاتھوں سزا اور عذاب دلوایا جائے۔ اس حوالے سے میری ایک کتاب

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

موجود ہے: ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل‘‘۔ سابقہ اُمتِ مسلمہ بنی اسرائیل ہے جنہیں ہٹا کر اس امت (اُمتِ محمدیؐ) کو اُمتِ مسلمہ کا مقام دیا گیا۔ اسی بنا پر وہ حسد اور تکبر کی آگ میں جل گئے، لیکن وہ ابھی موجود ہیں، ختم تو نہیں ہوئے۔

بہرحال زیر مطالعہ حدیث میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ اس ضمن میں اس کی وضاحت ہو جانی چاہیے کہ حسد کے مقابلے میں ایک چیز رشک ہے اور وہ جائز ہے۔ آپ دیکھیں کہ کسی میں بڑی خوبی ہے تو آپ دعا کریں کہ اے اللہ! جیسے تو نے اس شخص کو خوبی عطا کی ہے، اسی طرح یہ خوبی مجھے بھی عطا کر دے! تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً کسی کو کوئی فضل حاصل ہوا، علم حاصل ہوا یا اسے تقویٰ زیادہ ملا ہے تو اللہ سے دعا کرنا کہ مجھے بھی اس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے دے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن دل میں یہ آرزو رکھنا کہ یہ خوبی اس سے سلب کر لی جائے اور مجھے دے دی جائے تو یہ حرامِ مطلق ہے اور اسی کا نام حسد ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

بولی پر بولی دینے کی ممانعت

زیر مطالعہ حدیث میں دوسری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَلَا تَنَاجَشُوْا)) ’’اور ایک دوسرے کی بولی پر بولی مت دیا کرو‘‘۔ کوئی نیلامی ہو رہی ہے اور آپ بالفعل خریدار نہیں ہیں، لیکن خواہ مخواہ آپ نے بولی دے دی تو یہ جائز نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل جب کسی چیز کی نیلامی (auction) ہوتی ہے تو نیلامی کرنے والوں کی طرف سے کچھ لوگ مجمع میں زیادہ قیمت بولنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب بولی شروع ہوتی ہے اور اصل خریداروں میں سے کوئی بولی لگاتا ہے تو نیلامی کرنے والوں کا کارندہ اس سے زیادہ بولی دے دیتا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا اس سے زیادہ بولی دے گا تو پھر ان کا کوئی دوسرا کارکن اس سے اوپر بولی دے دے گا۔ اس طرح اس چیز کی قیمت بڑھتی رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ یہ بہت غلط بات ہے کہ آپ بالفعل خریدار ہی نہیں ہیں اور بولی دیتے جا رہے ہیں۔ البتہ اگر آپ حقیقتاً خریدار ہیں تو آپ بولی دے سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ایک دوسرے سے بغض رکھنے اور پیٹھ پھیرنے کی ممانعت

زیر مطالعہ روایت میں تیسری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَلَا تَبَاغَضُوْا)) ''اور ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو''۔ دیکھئے ہوتا یہ ہے کہ لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ ایک کاروبار میں دو لوگ شریک ہیں اور ایک شریک دوسرے پر زیادتی کر رہا ہے' یا ایک بھائی دوسرے بھائی پر زیادتی کر رہا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی آیا ہے: ﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاۗءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ......﴾ (صٓ: ٢٤) ''اور یقیناً مشترک معاملہ رکھنے والوں میں سے اکثر ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔'' لیکن جب بھی ایسا ہو تو اسی وقت اس معاملے کی اصلاح اور تصفیہ ضروری ہے۔ یہ اُمت مسلمہ کی ذمہ داری لگائی ہے کہ جب مسلمانوں میں کوئی جھگڑا یا زیادتی کا معاملہ ہو تو ان میں صلح کرا دیا کرو۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (آیت ١٠) ''مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں' پس اپنے دو بھائیوں کے مابین صلح کرا دیا کرو''۔ جب معاملہ ختم ہو جائے تو پھر دل میں اس کی میل بھی باقی نہیں رہنی چاہیے۔ ہونا یہ چاہیے کہ آپ شعوری طور پر اس زیادتی کو معاف کر دیں اور کہیں کہ اے اللہ! اس نے مجھ پر زیادتی کی تھی تو میں نے اسے معاف کیا' پس تو بھی اسے معاف فرما دے۔ اب یہ معاف کرنا سچے دل سے ہونا چاہیے اور پھر کوئی کدورت دل میں نہیں رہنی چاہیے۔ سورۃ الحشر میں آیا ہے: ﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (آیت ١٠) ''(اے اللہ!) ہمارے دلوں میں کسی صاحبِ ایمان کے لیے کوئی کدورت پیدا نہ ہونے دینا''۔ اکٹھے رہتے ہوئے زیادتی ہو جاتی ہے اور کچھ نہ کچھ معاملہ ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل صف آرا ہوئے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے دلوں میں باہم کدورت پیدا نہ ہوئی ہو۔ لیکن ان دونوں حضرات کی تدفین سے فراغت کے بعد حضرت علیؓ نے کہا تھا: مجھے امید ہے کہ میں اور طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہم) ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ

غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴿۴۷﴾ ’’اور ہم نکال دیں گے ان کے سینوں میں سے جو کچھ بھی کدورت ہوگی‘ پھر وہ بھائی بھائی (بن کر بیٹھے) ہوں گے تختوں پر آمنے سامنے۔‘‘ بعض روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ: ’’مجھے امید ہے کہ میں‘ طلحہ‘ زبیر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) ان ہی لوگوں میں سے ہوں گے.....‘‘

رسول اللہ ﷺ نے اگلی بات یہ فرمائی: ((وَلَا تَدَابَرُوْا)) ’’اور ایک دوسرے سے پیٹھ نہ موڑو‘‘۔ جب کسی کے ساتھ آپ کی دوستی اور تعلق ہوتا ہے تو آپ رُو در رُو ہو کر بات کرتے ہیں اور جب کسی سے آپ کی دشمنی ہے‘ کوئی بغض ہے اور وہ آ رہا ہے تو آپ اس سے پیٹھ موڑ لیں گے۔ چنانچہ سورۃ الحجر کی درج بالا آیت میں فرمایا گیا ہے جب اہلِ ایمان کے دلوں سے غل اور کدورت نکل جائے گی تو جنت میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ چنانچہ یہاں رسول اللہ ﷺ نے چوتھی بات یہ فرمائی کہ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ۔

بیع پر بیع (سودے پر سودا) کرنے کی ممانعت

اگلی بات رسول اللہ ﷺ نے زیر مطالعہ حدیث میں یہ فرمائی: ((وَلَا یَبِعْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ)) ’’اور تم میں سے کوئی کسی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے‘‘۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخص کوئی چیز خرید رہا ہے اور آپ آگے بڑھ کر اس سے زیادہ قیمت لگا دیتے ہیں تو یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے۔ آپ انتظار کریں‘ اگر ان کا سودا ہو جائے تو ٹھیک ہے اور اگر ان کی بات نہیں بنتی تو پھر آپ سودا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر کہیں کسی کے رشتے کی بات چل رہی ہو تو وہاں آپ رشتے کی بات نہ کریں جب تک کہ ان کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ وہ رشتہ ہو گیا تو آپ کی زبان پر یہ دعا ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس رشتے میں برکت ڈالے۔ اہلِ ایمان کے لیے آپ کے جذبات یہی ہونے چاہئیں۔ اور اگر کسی وجہ سے ان کا رشتہ نہیں ہوتا تب آپ رشتے کا سوال کرنا چاہتے ہیں تو کر سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں باتوں کو اکٹھا بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ، فَلَا یَحِلُّ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یَبْتَاعَ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْهِ وَلَا یَخْطُبَ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ حَتّٰی یَذَرَ))(۱)

''ہر مؤمن دوسرے مؤمن کا بھائی ہے' پس اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے سودے پر سودا کرے اور نہ ہی یہ کہ وہ اس کے پیغام نکاح پر اپنا پیغامِ نکاح بھیجے' حتیٰ کہ وہ دست بردار ہو جائے۔''

اللہ کے بندو' باہم بھائی بھائی بن کے رہو!

زیر مطالعہ حدیث میں چار منفی باتوں کو بیان کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پانچویں بات یہ فرمائی: ((وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا))''اور اللہ کے بندو' آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ!'' اللہ کے بندے بن کر سب برابر ہو گئے تو اب کوئی حاکم نہیں رہا' کوئی محکوم نہیں رہا۔ جب ایران کا سفیر مدینہ منورہ آیا تو اِدھر اُدھر پھرا اور اسے کہیں کوئی محل نظر نہیں آیا تو اس نے پوچھا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ اسے جواب ملا کہ ہمارے ہاں بادشاہ نہیں ہوتا' بلکہ ہمارا ایک امیر ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا تو وہ امیر کہاں ہے' مجھے تو یہاں ان کا کوئی محل نظر نہیں آیا۔ اسے بتایا گیا کہ ہمارے بیت المال کے کچھ اونٹ گم ہو گئے تھے' لوگوں نے بہت تلاش کیے' لیکن وہ نہیں ملے تو ہمارے امیر ان اونٹوں کی تلاش میں صحرا کی طرف گئے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ اُس نے کسی شخص کو ساتھ لیا ہوگا تاکہ وہ امیر کو پہچان تو سکے اور صحرا کی طرف آپؓ کو ڈھونڈنے نکلا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اونٹ تلاش کر کے تھک گئے تھے اور اونٹ کہیں نہیں ملے تھے۔ دوپہر ہو گئی تھی اور دھوپ کی تمازت بھی تیز تھی۔ ایران کے سفیر نے آپؓ کو اس حال میں پایا کہ آپؓ ایک درخت کے سائے میں اپنے کوڑے کا تکیہ بنا کر لیٹے ہوئے ہیں' نہ کوئی گارڈ ہے' نہ کوئی محافظ ہے۔ تو اُس نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر یہ تاریخی بات کہی: اے عمر! تم انصاف کرتے ہو' لہٰذا تمہیں کوئی خوف نہیں' جبکہ ہمارے بادشاہ اپنی رعایا پر ظلم کرتے ہیں اور ان کا خون چوستے ہیں تو انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی بغاوت نہ ہو جائے' کہیں کچھ اور نہ ہو

(۱) صحیح مسلم' کتاب النکاح' باب تحریم الخطبة علی خطبة اخیه حتی یاذن او یترك۔

جائے‘ لہٰذا انہیں گارڈز کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اپنے محل کی فصیل بھی اونچی سے اونچی رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے بھی زیر مطالعہ حدیث میں فرمایا کہ سب کے سب اول تو اللہ کے بندے بن جاؤ اور پھر آپس میں بھائی بھائی بن کے رہو!

مسلمان پر ظلم کرنے اور اسے اکیلا چھوڑنے کی ممانعت

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ)) ’’ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے‘‘۔ یہاں مؤمن سے نیچے اتر کر مسلمان کی بات ہو رہی ہے۔ ایمان کا درجہ تو بہت اونچا ہے اور اس سے نچلا درجہ اسلام کا ہے‘ تو اس بارے میں بھی فرمایا کہ سب مسلمان بھی آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ جب بھائی ہیں تو ان پر چند ایک ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ: ((لَا یَظْلِمُهٗ)) ’’نہ تو وہ اس پر ظلم کرتا ہے‘‘۔ وہ آپ کا بھائی ہے تو ظلم کیسے کرے گا؟ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ: ((وَلَا یَخْذُلُهٗ)) ’’اور نہ کبھی اس کو (بے یارو مددگار) چھوڑتا ہے‘‘۔ یعنی کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ کہیں اس پر زیادتی ہو رہی ہو تو اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی حمایت اور مدد کرتا ہے۔ وہ اپنی جان بچا کر اس کو چھوڑ کر علیحدہ نہیں ہو جاتا کہ مجھے کیا ہے‘ اپنا معاملہ خود نبٹائیں۔ میں کسی ایک کی بات کروں گا تو دوسرا خواہ مخواہ میرا دشمن ہو جائے گا۔ یہ بے حسی اور بے اعتنائی (indifference) ہمارے معاشرے میں بہت عام ہو گئی ہے۔ دو بھائیوں میں جھگڑا ہے اور سگے بھائی بھی کسی کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتے‘ حالانکہ قرآن میں فرمایا گیا کہ تم پر لازم ہے کہ ان کے درمیان صلح کراؤ۔ جھگڑا تو کسی وقت بھی ہو سکتا ہے‘ لہٰذا تم فاصلے پر کھڑے ہو کر تماشا نہ دیکھو بلکہ ان کے درمیان صلح کراؤ۔ یہ تمہارا اخلاقی فرض ہے۔

مسلمان کی تحقیر کرنے کی ممانعت

ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر تیسری ذمہ داری یہ ہے: ((وَلَا یَحْقِرُهٗ)) ’’اور اسے حقیر نہیں سمجھتا‘‘۔ اب حقیر سمجھنے کی بہت سی بنیادیں ہوتی ہیں۔ کوئی غریب ہے اور آپ امیر ہیں تو آپ اس کو اس کی غربت کی وجہ سے حقیر سمجھ رہے ہیں۔ یا آپ عالم

ہیں اور وہ بے چارہ ناخواندہ ہے' پڑھا ہوا نہیں ہے تو آپ اپنے علم کی وجہ سے اپنے آپ کو اعلیٰ اور اسے کمتر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت آپ سے زیادہ ہو' تو سوچیے کہ اللہ کے ہاں اس کا کیا مقام ہو گا۔ آپ کو اگر اپنے علم کے اوپر غرہ ہو گیا' زعم ہو گیا تو آپ کا سب کیا دھرا زیرو ہو جائے گا۔ اگر آپ میں تکبر آ گیا تو سارا علم' سارا فضل' سارا تقویٰ' ساری نیکی زیرو سے ضرب کھا کر زیرو ہو جائے گی۔ ریاضی کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی رقم بھی صفر سے ضرب کھاتی ہے تو وہ صفر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کبھی بھی اپنی نیکی' تقویٰ اور علم کی بنا پر کسی مسلمان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اور ہمیشہ اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔ آج تو آپ دین پر ہیں اور صحیح راستے پر چل رہے ہیں' لیکن کل آپ کے ساتھ کیا ہو گا یہ کسی کو معلوم نہیں۔ کیا پتا کسی گندگی کے گڑھے میں پاؤں پڑ جائے اور پھر شیطان آپ کو اپنے پیچھے لگا کر کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ اور کیا پتا اللہ کل اسے ہدایت دے دے اور سیدھے راستے پر چل کر وہ سرخرو ہو جائے۔

ایک حدیث کے حوالے سے ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ ایک آدمی گناہ کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے' پھر اچانک اس میں تبدیلی آتی ہے اور اللہ اسے ایمان کی دولت سے نواز دیتا ہے۔ ایمان حاصل ہونے کے بعد وہ نیک اعمال کرتا ہے اور پھر اسی حالت میں اس کو موت آ جاتی ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص نیکی کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے' پھر کوئی بپتا ایسی پڑتی ہے کہ اس کا ایمان زائل ہو جاتا ہے اور وہ گندگیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر اسی حالت میں اسے موت آتی ہے اور وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ایک صاحبِ کرامت بزرگ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝۱۷۵﴾

''اور سنایئے انھیں خبر اُس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا تو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے۔''

اس واقعے کی تفصیل ہمیں تورات میں بھی ملتی ہے' جس کے مطابق یہ شخص بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اس کا نام بلعم بن باعوراء تھا اور یہ ایک بہت بڑا عابد' زاہد اور عالم تھا۔ لیکن یہ ایک عورت کی محبت میں گرفتار ہو کر اس مقام سے جو گرا تو پھر اسفل سافلین میں جا پہنچا۔ اسی طرح کیا پتا جو ہمیں بے عمل نظر آ رہا ہے اس کو اللہ ہدایت دے اور آپ کو آپ کے تکبر اور مسلمان بھائی کو حقیر جاننے کی وجہ سے بھٹکا دے۔ لہٰذا اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ استقامت کی دعا کیا کریں کہ اے اللہ! ہدایت تو تو نے دے دی ہے' اب ہمیں استقامت بھی نصیب فرما دے۔ آمین!

تقویٰ ظاہر کا نہیں' دل کا ہوتا ہے!

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ)) ''حضور ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے' تقویٰ یہاں ہے' تقویٰ یہاں ہے'' —— ہمارے ذہنوں میں متقی شخص کا ایک خاص تصور ہوتا ہے کہ اس کا ایک خاص لباس ہے' خاص وضع قطع ہے' داڑھی بھی لمبی ہے' عمامہ بھی پہنا ہوا ہے' شلوار یا پاجامہ ٹخنوں سے اوپر ہے' تہبند ہے تو نصف ساق پر ہے' وغیرہ۔ ایسے شخص کو ہم متقی سمجھتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اصل تقویٰ یہاں دل میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کسی کے اندر ان چیزوں پر ریاکاری موجود ہو اور یہ ساری پسندیدہ چیزیں زیرو سے ضرب کھا کر زیرو ہو جائیں' بلکہ ریاکاری کو تو آپ ﷺ نے شرک سے تعبیر فرمایا ہے:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ' وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ)) (۱)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا تو اس نے بھی شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے

(۱) مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث شداد بن اوس رضی اللہ عنہ۔

لیے خیرات دی اس نے بھی شرک کیا۔''

اس اعتبار سے تقویٰ ظاہری وضع قطع کا نام نہیں ہے' بلکہ تقویٰ دل کے اندر ہوتا ہے۔ یہی مضمون سورۃ البقرۃ کی آیت البر میں بھی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر' یومِ آخرت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور نبیوں پر۔''

جب تک آپ کو اپنے کسی نیک عمل کا صلہ صرف اللہ سے درکار نہیں ہے آپ کا وہ عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہے۔ اگر آپ کو اس عمل کے بدلے دنیا میں کچھ مطلوب ہے تو پھر آپ کی وہ نیکی زیرو ہو جائے گی' مثلاً آپ کو اس عمل سے شہرت' عزت یا دولت مطلوب ہے تو وہ عمل انجام اور ثواب کے حوالے سے صفر ہو جائے گا۔

اللہ کی رضا اور آخرت کی جزا' یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ' یہ نیت کی دو بنیادیں ہیں۔ اور پھر اس کی عملی شکل کیا ہے' یہ ایمان بالرسالت سے معلوم ہوگی۔ نیکی کا کامل عملی ہیولہ اور اور مجسمہ نیکی محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' لہٰذا ان کی سیرت میں دیکھو کہ کس چیز کا کتنا تناسب مطلوب ہے۔ نیکیوں میں بھی تناسب ہونا چاہیے' اگر ایک نیکی حد سے آگے بڑھ گئی ہے تو وہ بھی کہیں نہ کہیں بدی میں شامل ہو جائے گی۔ آپ روزے رکھتے جا رہے ہیں' رکھتے جا رہے ہیں تو آپ کا یہ طرزِ عمل نیکی کی حدود سے نکل جائے گا' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر روز روزہ رکھنے سے روک دیا ہے اور آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا: ((مَا صَامَ مَنْ صَامَ الْاَبَدَ))[1] ''جو شخص ہمیشہ روزہ رکھتا ہے تو اس کا کوئی روزہ نہیں ہے''۔ اس کی بڑی معقول وجہ ہے۔ آپ اگر روزانہ روزہ رکھتے ہیں تو گویا آپ نے کھانے کے اوقات بدل دیے اور اب آپ کو دن میں بھوک لگے گی ہی نہیں۔

(۱) سنن النسائی' کتاب الصیام' باب الصوم عشرۃ ایام من الشھر……

آپ کا نفس بھی اس بات کا عادی ہو جائے گا کہ مجھے تو سحری اور شام کے وقت میں ہی کھانے پینے کو ملے گا تو اس کے اندر طلب ہی نہیں ہو گی' اس لیے کہ وہ تو آپ کی عادت بن گئی ہے۔ پھر اس میں صبر اور بھوک پیاس سے رکنے والی کوئی بات نہیں رہے گی۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ عبادات کی آفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی عمل عادت بن جائے اور جب عادت بن جائے تو پھر اس کا وہ اجر و ثواب نہیں رہا۔ یہ ایک علیحدہ سبق ہے جو میں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھا۔

مسلمان کے جان' مال اور عزت و آبرو کی حرمت

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ يَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ)) ''کسی انسان کے شریر ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے''۔ یہ مفہوم ((وَلَا يَحْقِرُهُ)) کے اندر پہلے آ گیا تھا' لیکن اس بات کے اندر مزید زور (emphasis) دینے کے لیے اس کو پھر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کسی شخص کے شریر ہونے کے لیے اور اس کو برا بنا دینے کے لیے صرف ایک بات کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

روایت کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:((كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ ، دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ)) ''مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے' اس کا خون بھی' اس کا مال بھی اور اس کی عزت و آبرو بھی''۔ ہر مسلمان کی جان' عزت اور مال دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے' اس میں کسی قسم کی کوئی ڈنڈی نہ ماری جائے اور ان میں کوئی حق تلفی نہ کی جائے۔

حریت' مساوات اور اخوت: اسلامی معاشرت کی بنیادیں

یوں سمجھئے کہ یہ حدیث حسن معاشرت کے اصول' اخلاقیات کی تعلیم اور مسلمانوں میں باہمی مواخات کے حوالے سے نہایت جامع ہے۔ آج دنیا میں معاشرت کے لیے تین بنیادی اصول مانے جا رہے ہیں: مساوات (Equality)' آزادی (Freedom)' اور

اخوت (Fraternity)۔ ایچ جی ویلز نے حضور ﷺ کے بارے میں انہی تین چیزوں کا اقرار کیا ہے' حالانکہ وہ شاتم رسول ہے اور اس نے حضور ﷺ کی زندگی پر بہت شدید اور رکیک حملے کیے ہیں۔ اس کی انسانی تاریخ پر دو کتابیں ہیں: A Short Histor yof the World یہ ذرا مختصر ہے اور اس کے مقابلے میں ایک ذرا ضخیم کتاب ہے: A Concise History of the World۔ اس دوسری کتاب میں ایک باب حضور ﷺ کے بارے میں ہے اور اس میں اُس نے حضور ﷺ کی شانِ اقدس میں بڑا گستاخانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ لیکن آخری حصے میں جہاں اس نے خطبہ حجۃ الوداع کے اقتباسات پیش کیے ہیں وہاں وہ حضور ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (۱)

((اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ)) (۲)

''لوگو! کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں! اسی طرح کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں! کسی سرخ و سفید رنگ والے شخص کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور اسی طرح کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں! فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے..... تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔''

سورۃ الحجرات میں بھی یہی مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۭ﴾ (الحجرات:۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اور

---

(۱) مسند احمد' ح ۲۲۹۷۸۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب فی فضل الشام والیمن۔

جان لو کہ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں کی شکلیں ہی مختلف بنائی ہیں کہ دیکھتے ہی سمجھ جاؤ کہ یہ جاپانی چلا آ رہا ہے‘ یہ چینی ہے‘ یہ افغانی ہے‘ یہ پاکستانی اور یہ ہندوستانی ہے۔ یہ ساری تقسیم پہچان اور تعارف کے لیے ہے‘ جبکہ تخلیق کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔

بہر حال جی ایچ ویلز خطبہ حجۃ الوداع کے مندرجہ بالا جملوں کا حوالہ دے کر کہتا ہے:

> *"Although the sermons of human freedom, fraternity and equality were said before. We find a lot of these sermons in Jesus of Nazareth, but it must be admitted that it was Mohammad who for the first time in history established a society based on these principles."*

> ’’اگرچہ انسانی حریت‘ مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری (حضرت مسیحؑ کی جائے ولادت ناصرہ گاؤں تھا‘ اس لیے آپؑ مسیح ناصری کہلاتے ہیں) کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں‘ لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔‘‘

اس ضمن میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ بدقسمتی سے‘ جب کتابوں کے نئے ایڈیشن آتے ہیں تو ایڈیٹنگ از سرنو کر دی جاتی ہے۔ اس کتاب کے ساتھ بھی یہی ہوا اور اس کتاب کے نئے ایڈیشن سے یہ جملے نکال دیے گئے ہیں‘ کیونکہ بحیثیت عیسائی اُن کے حلق سے یہ جملے اتر نہیں رہے تھے۔ آپ اگر کسی لائبریری سے اس کتاب کا پرانا ایڈیشن حاصل کر سکیں تو اس میں آپ کو یہ جملے مل جائیں گے۔

اسلام اور امریکہ کے تصورِ مساوات میں فرق

قائداعظم محمد علی جناح نے بھی قیامِ پاکستان کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے انہی تین بنیادوں کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش

کر سکیں۔ مساوات کا ایک تصور امریکہ میں بھی ہے کہ مرد اور عورت بالکل برابر ہیں۔ اسلام کا تصورِ مساوات یہ نہیں ہے۔ مرد اور عورت بحیثیت انسان اور انسانی وقار (human dignity) کے حوالے سے دونوں برابر ہیں' لیکن مرد جب شوہر ہو گیا اور عورت بیوی تو اب وہ برابر نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بیٹی کا حق اور بیٹے کا حق وراثت میں برابر نہیں ہے' اس لیے کہ بیٹے نے شادی کرنے کے لیے مہر دینا ہے اور بیٹی کو شادی میں مہر ملنا ہے۔ اسی طرح بیٹے نے کنبے کی کفالت کرنی ہے' جبکہ بیٹی تو اپنے شوہر کی ذمہ داری (liability) ہوگی۔ ساری معاشی ذمہ داری مرد پر ہے' عورت پر تو معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لہٰذا امریکہ میں مرد و عورت کے درمیان جو مساواتی تصور ہے' اس کے بارے میں' میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مساوات نہیں ہے' بلکہ یہ تو ظلم ہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ کوئی وزنی چیزیں آپ نے کہیں لے کر جانی ہیں اور آپ ایک بچے اور ایک جوان کے سر کے اوپر برابر وزن ڈال دیں گے تو یہ انصاف نہیں ہوگا' بلکہ یہاں برابری غلط ہو جائے گی۔ چنانچہ عجیب بات ہے کہ قرآن نے انصاف کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا۔ انصاف عربی کا لفظ ہے' یعنی نصف نصف کر دینا' آدھا آدھا کر دینا۔ یہ لفظ نہ تو قرآن میں آیا ہے اور نہ احادیث میں آیا ہے' جسے ہم سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ قران وحدیث میں عدل اور قسط کے الفاظ آئے ہیں۔ ترازو کا ایک بازو اگر چھوٹا ہے اور دوسرا بڑا ہے تو چھوٹے والے میں دوسرے کی نسبتاً آپ زیادہ وزن ڈالیں گے تو وہ ترازو سیدھی رہے گی۔ اگر مرد کے برابر عورت پر وزن ڈال دیں گے تو اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ آج مظلوم ترین عورت آپ کو امریکہ میں نظر آئے گی۔ بہر حال اس وقت یہ میرا موضوع نہیں۔

مسلمانوں کے باہمی تعلق کی بنیادیں: احادیث کی روشنی میں

اب میں چاہتا ہوں کہ اسلامی معاشرت کے اصول اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی بنیادوں کے حوالے سے چند ایک احادیث آپ کو سنا دوں۔ پہلی حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک متفق علیہ روایت ہے' جس میں رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا :((إِنَّ الْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا ' وَشَبَّكَ أَصَابِعَهُ))[1] ''مؤمن (دوسرے) مؤمن کے لیے عمارت کی مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت دیتا ہے۔اور آپ نے اپنی انگلیوں میں پنجہ ڈال کر بتلایا''۔ دیواروں میں اینٹیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں اس طرح وہ ایک دوسرے کو مضبوط کرتی ہیں۔دیوار اگر اکیلی ہے' اس کے ساتھ کوئی دیوار نہیں ہے تو اس کو اس طرف سہارا دینا پڑ جائے گا۔لیکن اگر چاروں طرف سے دیواریں آپس میں جڑی ہوئی ہیں تو یہ ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں۔ پھر یہ دیواریں چھت کو سہارا دے رہی ہیں۔اسی طریقے سے اہل ایمان خواہ مختلف علاقوں اور قبائل سے تعلق رکھتے ہوں' لیکن وہ ایسے ہی ہیں جیسے ایک عمارت۔لہٰذا وہ ایک دوسرے کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔

دوسری حدیث بھی متفق علیہ روایت ہے۔حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ' إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى))[2]

''مؤمن بندوں کی مثال ان کی آپس میں محبت' اتحاد اور شفقت میں جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے اعضاء میں سے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارے جسم کو نیند نہیں آتی اور وہ بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث اور بھی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الْمُسْلِمُوْنَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ إِنْ اشْتَكَى عَيْنُهُ اشْتَكَى كُلُّهُ،وَإِنْ اشْتَكَى رَأْسُهُ اشْتَكَى كُلُّهُ))[3]

---

(۱) صحيح البخاری' كتاب الصلاة' باب تشبيك الاصابع فی المسجد وغيره۔ وصحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم۔

(۲) صحيح البخاری' كتاب الادب' باب رحمة الناس والبهائم۔ وصحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم۔

(۳) صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم۔

''مسلمان بندے ایک فردِ واحد کی طرح ہیں' اگر آدمی کی آنکھ دکھتی ہے تو اس کا سارا جسم دکھنے لگ جاتا ہے اور اگر اس کے سر میں تکلیف ہوتی ہے تو اس کے سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے۔''

ایک دوسرے سے مودت اور ایک دوسرے پر رحم کرنے کے حوالے سے اس سے جامع کوئی مثال ممکن نہیں ہے کہ اگر کسی ایک عضو میں کوئی تکلیف ہے' مثلاً آنکھ میں چبھن ہو رہی ہے' تو باقی جسم یہ نہیں کہے گا کہ آنکھ کو رہنے دو' میں تو سوؤں گا' بلکہ ایک آنکھ نہیں' سارا جسم جاگتا ہے۔ اسی طرح بخار ہوتا ہے تو پورے جسم کو ہوتا ہے۔ کسی ایک عضو کی انفیکشن کی وجہ سے سارا جسم بخار میں مبتلا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اہلِ ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ جسم کی مانند ہے کہ ایک کو تکلیف ہوگی تو دوسرا بھی اس تکلیف کو محسوس کرے گا۔

تیسری حدیث بھی متفق علیہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ' لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ' وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ' وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۱)

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' نہ تو اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو ظالم کے حوالے کرے (کہ وہ اس پر ظلم کرے)۔ اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کی فکر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت روائی کرتا ہے۔ اور جو شخص کسی مسلمان سے اس کی مصیبت کو دور کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت اس سے دور کرے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کی ستر پوشی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کرے گا۔''

یعنی جو شخص اپنے کسی مؤمن بھائی کی کسی تکلیف یا دکھ درد کو اس دنیا کے اندر رفع کرتا ہے

(۱) صحيح البخاري' كتاب المظالم' باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه۔ وصحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب تحريم الظلم۔

تو اللہ تعالیٰ اس کے آخرت کے دکھوں میں سے کمی کر دیتا ہے۔ آپ پر سختی آئی ہے اور کسی نے آپ کی مدد کی ہے تو اللہ عزوجل اس کی مدد کرے گا اور قیامت کی سختیوں میں سے اگر وہ کسی سختی کا حق دار بنا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بچا لے گا۔

((مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا)) کا لفظی ترجمہ ہوگا: ''جس نے کسی مسلمان کو لباس پہنایا۔'' اور مسلمان کو لباس پہنانے (ستر پوشی) کے دو مفہوم ہیں: (۱) اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب کو چھپانا' اور (۲) کسی کے پاس جسم چھپانے کے لیے لباس نہیں تو اسے لباس دے دینا۔ جو بھی یہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو بھی لوگوں سے چھپائے گا اور قیامت کے دن اسے لباس بھی عطا فرمائے گا۔

آخری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا)) فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُومًا أَفَرَأَيْتَ إِذَا كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ؟ قَالَ: ((تَحْجُزُهُ أَوْ تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَإِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ)) (۱)

''اپنے ظالم یا مظلوم بھائی کی مدد کرو''۔ ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں مظلوم کی مدد تو کرتا ہوں' فرمایئے کہ ظالم کی مدد کس طرح کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اسے ظلم کرنے سے روک دے' یہی اس کی مدد ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلامی معاشرت کے اصولوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی بنیادوں کو صحیح معنوں میں اپنانے اور ان کے مطابق ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی توفیق عطا فرمائے' جہاں حریت' اخوت اور مساوات کا دور دورہ ہو۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُولُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاکراہ' باب یمین الرجل لصاحبہ انہ اخوہ اذا خاف علیہ القتل۔

عِنْدَهُ ــــ وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ)) (۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص کسی مؤمن کی دُنیوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف رفع کرے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف رفع فرمائے گا۔ اور جو شخص کسی تنگدست پر آسانی کرے گا' اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانی فرمائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا' اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے ــــ اور جو شخص طلبِ علم کی خاطر کسی راستہ پر چلے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا۔ جب کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کتاب اللہ کی تلاوت اور تعلیم کے لیے جمع ہوتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر اپنے پاس موجود مخلوق میں کرتا ہے ــــ اور جسے اس کا عمل ہی پیچھے چھوڑ دے تو اس کا نسب اسے آگے نہیں لے جا سکتا۔''

معزز سامعین کرام!

گزشتہ جمعہ' ہم نے اربعین نووی کی ۳۵ ویں حدیث کا مطالعہ کیا تھا اور آج ہم ۳۶ ویں حدیث کا مطالعہ کریں گے۔ یہ دونوں حدیثیں ایک جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں اسلامی معاشرت کے بنیادی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث ۳۵ میں اس کا منفی پہلو پیش کیا گیا ہے اور اسی کا مثبت پہلو حدیث ۳۶ میں بیان ہو رہا ہے۔ مسلمانوں میں آپس میں محبت' مواخات' ہمدردی' نصرت اور حمایت کا جو تعلق ہونا چاہیے' اس کے ضمن میں پچھلی حدیث میں بعض کاموں سے روکا گیا تھا' کیونکہ وہ چیزیں اخوتِ باہمی کے منافی ہیں اور دلوں میں فاصلے اور ایک دوسرے کے خلاف کدورت پیدا

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن......

کرنے والی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ......)) یہ سب نہی کے صیغے ہیں کہ یہ نہ کرو' یہ نہ کرو۔

سورۃ الحجرات میں بیان کردہ حسنِ معاشرت کے اصول

اسی کا نقشہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۱ اور ۱۲ میں کھینچا گیا ہے۔سورۃ الحجرات کی آیت ۱۰ پچھلی مرتبہ میں نے تلاوت کی تھی' جس میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ''مؤمن سب آپس میں بھائی بھائی ہیں'' اور بھائی بندی کا بنیادی اوراولین تقاضا یہ ہے کہ اگر تمہارے دو بھائیوں میں اختلاف ہو جائے ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ ''تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح اور اصلاح کرا دیا کرو'' ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ایسے موقع پر غیر جانبداری کی روش صحیح نہیں ہے کہ میں کیا کروں' اپنا معاملہ ہے خود سے حل کریں۔ اگر میں ایک کی بات کروں گا تو دوسرا ناراض ہو جائے گا اور دوسرے کو حق پر قرار دوں گا تو پہلا ناراض ہو جائے گا' لہٰذا میں اس مسئلہ میں پڑتا ہی نہیں ہوں۔ ہرگز نہیں' یہ بہت غلط رویہ ہے۔ اہلِ ایمان کا فرض ہے کہ مسلمان بھائیوں میں اگر کوئی اختلاف ہو گیا ہے' کوئی چپقلش ہو گئی ہے تو اسے رفع کریں اور مصالحت کرائیں' صلح کرائیں۔

تمسخر اڑانے کی ممانعت: اس کے بعد آیت ۱۱ اور ۱۲ میں ''لائے نہی'' کے ساتھ چھ احکام آئے ہیں۔پہلی بات یہ فرمائی گئی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم میں سے کچھ مرد دوسرے مردوں کا تمسخر نہ کیا کریں' ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے) اُن (مذاق اڑانے والوں) سے (اللہ کی نگاہ میں) بہتر ہوں''۔ آپ نے کسی کو اس کے جسمانی عیب پر مذاق کا نشانہ بنایا' لیکن کیا پتا اس کے دل میں آپ سے کہیں زیادہ ایمان ہو اور وہ اللہ کی نگاہ میں آپ سے زیادہ محبوب ہو' لہٰذا کسی کا مذاق نہ اڑایا کرو۔ چونکہ یہ مرض خواتین میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا خصوصی طور پر عورتوں کو مخاطب کر کے اس سے منع کیا

گیا:﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾ ''اور نہ کچھ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (اللہ کے نزدیک)''۔قرآن حکیم میں عام طور پر مذکر کے صیغے میں ایک بات آتی ہے اور وہ مَردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہوتی ہے' لیکن جہاں خاص عورتوں کا معاملہ ہوتو وہاں بات کو دہرا کر لایا جاتا ہے۔ایک دوسرے پر فقرے چست کرنے اور مذاق اڑانے کی عادت چونکہ عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے اس لیے یہاں خاص طور پر عورتوں کا ذکر الگ سے بھی کیا گیا ہے۔

عیب چینی اور برے نام رکھنے کی ممانعت: دوسری بات یہ فرمائی گئی:﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے کو عیب نہ لگایا کرو''۔یعنی بہتان تراشی اور عیب چینی نہ کیا کرو۔ تیسری بات یہ فرمائی:﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ''اور ایک دوسرے کے چڑانے والے نام نہ رکھ لیا کرو''۔ یہ ایک مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے کہ آپ کسی فرد کسی فرد یا کسی گروہ کے اصل نام کو چھوڑ کر اس کے لیے کوئی ایسا نام رکھ لیں جو اسے پسند نہ ہو۔فرض کیجیے کہ جو لوگ اہلحدیث یا سلفی کہلواتے ہیں آپ نے ان کو وہابی کہہ دیا تو یہ چیز ان کے لیے تکلیف دہ ہے۔اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ ''ایمان کے بعد تو یہ برے نام بھی برے ہیں''۔عمل تو دور کی بات ہے' یہ جو تم زبانی کلامی بات کر دیتے ہو اس کی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی شدید گرفت ہوگی۔ہم وہ حدیث پڑھ چکے ہیں جس میں حضورﷺ نے حضرت معاذؓ سے کہا تھا: ((ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ' اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ)) ''اے معاذ! تجھے تیری ماں گم پائے' لوگوں کو ان کے چہروں (یا نتھنوں) کے بل جہنم میں ان کی زبانوں کی کھیتیاں ہی تو لے جائیں گی''۔زبان بے لگام ہوتی ہے اور زبان سے کوئی لفظ نکالنے میں کوئی طاقت نہیں لگتی' کچھ خرچ نہیں آتا' جو چاہا' جب چاہا بک دیا' لیکن ہر ہر لفظ جو انسان کے منہ سے نکلتا ہے وہ یا تو جنت میں جا کے پودا بن جائے گا یا جہنم کا کوئی جھاڑ جھنکاڑ بنے گا' جو اسے آخرت میں جا کے کاٹنا پڑے گا۔لہٰذا لوگوں کی عیب چینی اور ان

کے برے نام رکھنے سے باز رہنا چاہیے۔

سوئے ظن کی ممانعت: آیت ۱۲ میں چوتھی بات کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے اہل ایمان! زیادہ بدگمانی سے بچو' اس لیے کہ بعض گمان (اللہ کی نگاہ میں) گناہ بن جاتے ہیں''۔ بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے کسی کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ اگر تو کوئی واقعہ ہو گیا ہے' کوئی ثبوت ہے' تب تو ٹھیک ہے کہ آپ کوئی رائے قائم کریں۔ ایسے ہی بغیر کسی ثبوت اور واقعے کے آپ نے سوئے ظن قائم کر لیا تو یہ بہت بڑا گناہ بن جاتا ہے۔

عیب تلاش کرنے کی ممانعت: پانچویں بات یہ فرمائی: ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو''۔ کہا جاتا ہے کہ مکھی گندگی پر ہی بیٹھے گی' اس لیے کہ وہ اس کی فطرت ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ کھوج کرید میں رہتے ہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' وہاں کوئی دنگا فساد ہے یا نہیں؟ ذرا سی کوئی بات اگر مل گئی تو لے اڑے۔ یہ ان کا ذوق ہوتا ہے۔ تو اس سے روکا گیا ہے' بلکہ آج کی زیر مطالعہ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر تمہارے کسی مسلمان بھائی کا کوئی عیب تمہارے علم میں خود بخود آ جائے تو اسے بیان کرنا تو دور کی بات ہے' اس کے اوپر پردہ ڈالو۔ اس کے برعکس خود تجسس کر کے لوگوں کے عیوب تلاش کرنا یہ تو بہت بری بات ہے۔

غیبت کی ممانعت: چھٹی بات سورۃ الحجرات کی آیت میں یہ فرمائی گئی: ﴿وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا﴾ ''اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو''۔ کسی مسلمان بھائی کے پیچھے اس کی کوئی برائی بیان نہ کرو۔ اس حوالے سے حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر اس میں وہ برائی موجود ہو تو؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنْ کَانَ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَمْ یَکُنْ فِیْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ))(۱) ''اگر وہ عیب اس میں ہے جو تم کہتے ہو تبھی تو وہ غیبت ہے' اور اگر اس میں وہ عیب نہ ہو تو پھر تم نے اس پر بہتان لگایا ہے''۔ ایک شخص کے اندر اگر کوئی عیب ہے یا اس نے کوئی برائی کی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس کا ذکر مت

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم الغیبۃ۔

کرو‘ہاں اس کے سامنے اس انداز سے بات کروتا کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ پیٹھ پیچھے کرو گے تو یہ غیبت ہے اور اس کو اتنا برا کہا گیا کہ: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ؕ﴾ ”کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ یہ بات تو تمہیں بہت بری لگے گی“۔ یعنی کسی مسلمان بھائی کی غیبت کرنا اخلاقی سطح پر وہی فعل ہے جیسے کسی مسلمان بھائی کا گوشت کھانا۔ اس کے اندر مناسبت یہ ہے کہ مردہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا‘ آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اُڑا لیں۔ اسی طرح جو شخص موجود نہیں ہے تو وہ بھی اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ وہ موجود ہوتا تو بتاتا‘ نہیں بھئی ایسا نہیں ہے‘ بلکہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ بات میں نے نہیں کی ہے۔ اگر سامنے ہوگا تو وہ کچھ نہ کچھ دفاع تو کرسکتا ہے‘ لیکن جب موجود ہی نہیں تو وہ اپنی عزت کا دفاع نہیں کرسکتا‘ جیسے مردہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔

ایمان سے پہلے طاغوت کا کفر لازم ہے!

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قرآن مجید کا یہ انداز ہے کہ بالعموم پہلے ایک بات کا منفی پہلو بیان کیا جاتا ہے اور پھر مثبت! کلمۂ توحید کی ترتیب بھی یہی ہے کہ پہلے نفی اور پھر اثبات‘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ”نہیں ہے کوئی بھی معبود سوائے اللہ کے“۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ۚ﴾ (آیت ۲۵۶) ”تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا“۔ یعنی پہلے طاغوت کا کفر کرنا اور اس سے بغاوت کرنا لازمی ہے اور پھر اللہ پر ایمان کا مرحلہ آتا ہے۔

طاغوت سے مراد اللہ کے سرکش اور اللہ کے باغی ہیں جو اللہ کے بجائے اپنے آپ کو حاکم سمجھ بیٹھیں۔ چاہے وہ حاکم فرعون اور نمرود کی شکل میں ہو یا آج کے جمہوری دور میں عوام کی شکل میں۔ عوام چند لوگوں کو منتخب کر کے اپنے سروں پر اس انداز سے بٹھا لیتے ہیں کہ اب وہ جیسے چاہیں قانون بنائیں‘ ان کو مکمل آزادی ہے۔ چاہے تو شراب کو جائز قرار دے دیں‘ ہم جنس پرستی (homosexuality) کو جائز قرار دے دیں‘ ہم جنس

پرست شادی کے جواز کا فتویٰ دے دیں کہ ایک مرد شوہر ہے اور دوسرا مرد بیوی ہے یا ایک عورت شوہر ہے اور ایک عورت بیوی ہے۔قانون کی نگاہ میں تو یہ جائز قرار دے دیا گیا' حالانکہ یہ فطرت سے بغاوت کا معاملہ ہے۔اللہ نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ان کی تخلیق' ان کی ساخت اور ان کی نفسیات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔درحقیقت یہ سب طاغوت ہیں۔اسی طرح میرا اور آپ کا نفس امارہ بھی طاغوت ہے' اس لیے کہ ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے''۔ہمارے اندر کی حیوانیت کو حلال حرام سے کوئی غرض نہیں ہے' زبان کو چٹخارے چاہئیں چاہے حلال سے ہوں یا حرام سے' ہمیں بس دولت چاہیے چاہے وہ حلال ذرائع سے آئے یا حرام سے۔نفس کہہ رہا ہے کہ رشوت پیش ہو رہی ہے تو لے لو' اس وقت تمہیں پیسوں کی بڑی ضرورت ہے' تمہارے بچے کی فیس ابھی نہیں گئی ہے۔پھر یہ بھی نفس کا بہکاوا ہے کہ رشوت تو سبھی لیتے ہیں کوئی تم اکیلے تو نہیں لے رہے۔ یہ سارے حیلے نفس سکھاتا ہے' اسی لیے ہمارا نفس بھی طاغوت کے زمرے میں آتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ جو بھی اللہ کا باغی ہے وہ درحقیقت طاغوت ہے۔آج کے دور میں سیکولر ریاست روئے زمین پر سب سے بڑی طاغوت ہے۔سیکولر کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا کسی مذہب سے' کسی آسمانی ہدایت سے' کسی آسمانی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے' یہ صرف اور صرف انفرادی معاملہ ہے۔آپ مسلمان ہیں تو انفرادی طور سے شریعتِ محمدیؐ پر عمل کر سکتے ہیں' اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔آپ نماز پڑھیں' روزے رکھیں' قرآن کی تلاوت کریں! اسی طرح ہندو منوسمرتی اپنے عقائد و رسوم کے تحت اپنی انفرادی زندگی گزار سکتے ہیں' لیکن اجتماعی زندگی میں کسی مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔چنانچہ آج کے دور میں سیکولر ریاست سب سے بڑا طاغوت ہے۔

مسلمان بھائی کی سختی دور کر کے آسانی پیدا کرنا

اب ہم آج کی حدیث کی طرف آتے ہیں۔اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور یہ صحیح مسلم میں موجود ہے۔حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ((مَنْ نَفَّسَ

عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) ''جس شخص نے کسی مؤمن کی دنیا کی سختیوں (اور دشواریوں) میں سے کسی سختی (یا دشواری) کو دور کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی سختیوں اور دشواریوں میں سے کمی کرے گا''۔ دنیا میں اہل ایمان کے ساتھ اگر حسن سلوک کرو گے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں ملے گا اور اللہ تعالیٰ قیامت کی بڑی شدید سختیوں کو تم سے دور کر دے گا۔ قیامت کی سختیوں کے حوالے سے روایتی طور پر کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے پسینے میں گردنوں تک غرق ہوں گے اور سورج سوا نیزے پر ہوگا۔ یہ چیزیں صرف سمجھانے کے لیے ہیں' ورنہ اس دن کی سختی کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سختیوں کو اپنے اُس بندے کے لیے آسان کر دے گا جس نے دنیا میں کسی مسلمان بھائی کی کسی سختی' تنگی اور مشکل کو رفع کیا ہوگا۔

دوسری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَمَنْ يَّسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ ' يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) ''اور جو شخص کسی تنگدست پر آسانی کرے گا' اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانی فرمائے گا''۔ یعنی جس نے کسی ایسے شخص پر آسانی پیدا کی جو کسی مشکل میں' تنگی میں یا مصیبت میں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس دنیا میں بھی اور پھر آخرت میں بھی آسانیاں پیدا فرما دے گا۔ کوئی مسلمان تکلیف میں ہے اور آپ اس کی تکلیف کے اندر کمی کر کے اس کے لیے کوئی آسانی کا راستہ پیدا کر دیں' مثلاً آپ نے کسی کو دو سال کی مدت کے لیے قرض دیا تھا' لیکن دو سال کے بعد وہ قرض کی ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہے تب آپ اس کے سر پر سوار ہونے کے بجائے اسے مزید مہلت دے دیں تو یہ بہت اجر و ثواب کا باعث ہے۔ قرآن مجید میں جہاں سود کی حرمت کا حکم آیا ہے' وہیں یہ بھی آیا ہے کہ اگر تمہارا مقروض قرض لوٹانے کی حالت میں نہیں ہے تو اس کے لیے مہلت بڑھا دو' اور اگر اس کی تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے قرض معاف ہی کر دو تو یہ سب سے بہتر ہے۔ یہ تمہارا مسلمان بھائی ہے اور اس نے اپنی مجبوری میں تم سے قرض لیا تھا۔ پھر ظاہر بات ہے کہ تم نے بھی اپنی اضافی دولت سے ہی اسے قرض دیا تھا' اب اگر اس

قرض کو صدقہ کرتے ہوئے معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے بہت دے گا۔

انسان کے پاس جو اضافی دولت ہے اس کے بارے میں قرآن مجید میں تو یہ اصول بیان کیا گیا ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''(اے نبی ﷺ) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟ آپ انہیں بتا دیجیے کہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے (اسے صدقہ کر دو)''۔ اس حوالے سے یاد رکھیے کہ یہ روحانی تقاضا ہے' جبکہ قانونی تقاضا اس سے مختلف ہے کہ آپ ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے ــــ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں موجود اسلامی معیشت کے روحانی تقاضے کو قانونی سمجھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ کسی بھی مقدار میں سونا چاندی اپنے پاس رکھنا مطلقاً حرام ہے۔ ان میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسے صحابی بھی تھے۔ ان کے اندر چونکہ زہد انتہائی درجے کا تھا تو اس کا یہ مظاہرہ ہوا ــــ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ آپ کے پاس جو دولت ہے' اس میں سے آپ نے زکوٰۃ ادا کر دی ہے تو باقی مال آپ کا ہے۔ آپ اس کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور وہ آپ کی اولاد کو منتقل ہو سکتا ہے۔ اگر اپنے پاس کچھ رکھنا ہی نہیں ہے تو وراثت کا قانون آخر کیسے لاگو ہو گا؟

اسلامی نظامِ معیشت پر میرا ایک کتابچہ ہے: ''اسلام کا معاشی نظام'' جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام میں معیشت کے دو نظام ہیں' ایک ہے روحانی اور احسانی سطح پر اور ایک ہے قانونی سطح پر۔ قانونی سطح پر یہ ہے کہ آپ نے حلال ذرائع سے مال کمایا اور وہ مال نصاب سے آگے بڑھ گیا اور آپ نے اس میں سے زکوٰۃ دے دی تو اب باقی مال آپ کا ہے اور قانونی طور پر آپ اس کے مالک ہیں۔ جبکہ روحانی سطح پر یہ ہے کہ جو مال باقی بچ گیا ہے اس کو اللہ کے راستے میں دے دو۔ چنانچہ زیرِ مطالعہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اگر تم اپنے کسی تنگ دست بھائی کے لیے آسانی پیدا کرو گے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں تمہارے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔

مسلمان کی پردہ پوشی کرنا

زیر مطالعہ روایت میں رسول اللہ ﷺ نے تیسری بات یہ فرمائی:((وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) ''جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا' اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا''۔ آپ کی نظر میں کسی کا کوئی عیب آ گیا ہے ـــــ تجسس تو آپ نے نہیں کرنا اور ٹوہ میں نہیں لگے رہنا' اس لیے کہ سورۃ الحجرات میں واضح حکم ہے:﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو''۔ آپ نے خود سے تو کسی کا عیب تلاش نہیں کیا' لیکن ایک چیز آپ کے سامنے آ ہی گئی تو اس پر پردہ ڈالو۔ یہ نہیں کہ اس کا ڈھنڈورا پیٹو اور لوگوں کے اندر اس کا چرچا کرنا شروع کر دو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ کسی صورت پسند نہیں ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ﴾ (النور:١٩) ''بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان میں بے حیائی کا چرچا ہو' اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے''۔ کسی کا کوئی عیب' کوئی گناہ یا بے حیائی کی کوئی بات آپ کے علم میں آ جائے تو اس کو چھپاؤ' اس کا چرچا مت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا' عیب پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا۔ آخر تمہارے اندر بھی تو کوئی عیب ہے نا' بے عیب ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ کون ہے جس میں کوئی خطا نہیں ہے' کوئی کمی نہیں ہے؟ وہ حدیث بھی یاد کر لیجیے:((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ))[1] کہ تمام بنی آدم نہایت خطا کار ہیں اور ان خطا کاروں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو توبہ کریں' رجوع کریں' گناہ پر اصرار نہ کریں اور کسی گناہ پر ڈیرا ڈال کر بیٹھ نہ جائیں۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر کہیں بارش کی وجہ سے کیچڑ بن گیا ہے' آپ وہاں سے گزر رہے ہیں' آپ کا پاؤں پھسلا اور آپ

(١) سنن ابن ماجه' كتاب الزهد' باب ذكر التوبة۔ وسنن الترمذی' ابواب صفة القيامة والرقائق والورع۔

گر گئے۔ اب آپ وہاں پڑے تو نہیں رہتے' بلکہ فوراً اٹھتے ہیں اور کپڑے صاف کر کے آگے چل پڑتے ہیں۔ اسی طریقے سے کہیں نفس امارہ کے بہکاوے کی وجہ سے آپ سے کوئی لغزش ہوگئی یا ماحول کے اثرات کے تحت آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو فوراً اللہ کی جناب میں توبہ کرو۔ اس بارے میں سورۃ النساء میں ارشاد ہے کہ اگر فوراً توبہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے ذمے تمہاری توبہ کو قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں' پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں' تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

مسلمان بھائی کی مدد کرنا

چوتھی بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ)) —— آپ اندازہ کیجیے کہ کس قدر پیاری تعلیمات ہیں اور کس قدر عمدہ اندازِ بیان اور جامع الفاظ ہیں —— ''اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے''۔ آپ اپنے بھائی کے کام میں وقت لگا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں لگ جائے گا اور آپ کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص مظلوم ہے اور وہ آپ سے آ کر کہتا ہے کہ فلاں حاکم کے پاس جا کر میری بات بتائیے' میری بات کوئی نہیں سن رہا۔ اگر اس کی بات سچ ہے اور آپ جا کر اس کی سفارش کرتے ہیں تو یہ شفاعت حسنہ کہلاتی ہے اور اس کا بڑا اجر و ثواب ہے۔ اب آپ اس کی مدد کے لیے جا رہے ہیں تو ظاہری بات ہے کہ آپ کا وقت بھی لگے گا تو اتنے عرصے تک آپ کے سارے کام اللہ سنبھالے گا۔

اس حوالے سے ایک واقعہ بہت مشہور ہے' مکہ میں ایک تاجر آیا اور ابوجہل نے اس سے بہت سا مال و اسباب خریدا' لیکن پیسے نہیں دیے۔ اب وہ بیچارہ لوگوں سے فریاد کرتا پھر رہا ہے' لیکن کوئی اس کی مدد کے لیے تیار نہیں ہے۔ ایک جگہ پر بہت سے سردار

بیٹھے ہوئے تھے‘ وہ تاجر ان کے پاس گیا اور ان سے فریاد کی کہ ابوجہل میری رقم نہیں دے رہا‘ تو انہیں شرارت سوجھی۔ انہوں نے کہا وہ شخص جو وہاں نماز پڑھ رہا ہے‘ اس کے پاس جاؤ‘ وہ تمہارا مال دلوا سکتا ہے۔ وہ شخص نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تھے۔ تاجر نے حضور اکرم ﷺ کے پاس جا کر ساری بات بتائی اور مدد کی درخواست کی تو آپؐ فوراً اس کے ساتھ چل پڑے۔ ابوجہل حضور ﷺ کا بدترین دشمن تھا‘ اس کے باوجود آپؐ اُس تاجر کے ساتھ ابوجہل کے گھر گئے اور دروازے پر جا کر دستک دی۔ ابوجہل باہر آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کا مال ادا کرو۔ وہ فوراً اندر گیا اور خاموشی کے ساتھ جا کے مال لے آیا —— یہ رعب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو دیا تھا۔ آپ ﷺ خود فرماتے ہیں: ((بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ))(۱) ”میں جوامع الکلم کے ساتھ بھیجا گیا ہوں اور رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے“ —— ظاہر بات ہے کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک کا رعب جب ابوجہل کے اوپر پڑا تو اس نے بلاچون و چرا اس کا مال لا کے دے دیا۔ دیکھئے آپ ﷺ ایک انجان بندے کی مدد کے لیے اس کے ساتھ چلے اور اس کے پاس جا رہے ہیں جو آپؐ کا بدترین دشمن ہے۔ صرف اس لیے کہ کم سے کم اس مظلوم کی کوئی دادرسی ہو جائے۔

طلبِ علم کی فضیلت

زیر مطالعہ حدیث کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے‘ پہلے حصہ میں حسنِ معاشرت کے اصولوں کو بیان کیا گیا‘ جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں طلبِ علم اور درس و تدریس کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے —— الحمد للہ‘ میں نے اس کام میں پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ لگایا ہے۔ میں جب میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا (۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک) تو اس زمانے میں بھی میرا درسِ قرآن ہوتا تھا اور وہ پسند کیا جاتا تھا۔ میڈیکل کی تعلیم کے ساتھ قرآن سے بھی مناسبت اللہ نے عطا فرمادی تھی‘ لیکن اس کے بعد پھر میری زندگی کا اصل کام ہی یہ رہا: قرآن پڑھنا پڑھانا‘ سمجھنا سمجھانا‘ سیکھنا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجهاد‘ باب قول النبی ﷺ نصرت بالرعب مسيرة شهر۔

سکھانا اور قرآن کی تعلیم کو عام کرنا اور لوگوں تک پہنچانا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے نوجوان ایسے تیار ہو گئے ہیں جو اسی انداز میں اب درس دے رہے ہیں اور قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے' ورنہ ایک اکیلے آدمی سے کیا ہوگا۔ میرے اس کام کو آگے لے کر چلنے والے اب بہت سے ہیں' گویا میری محنت پھل لا رہی ہے۔

طلبِ علم اور اس کی فضیلت کے حوالے سے یہ حدیث بہت اہم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں فرمایا: ((وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا......)) ''جس شخص نے حصولِ علم کے لیے کوئی راستہ طے کرنا شروع کیا......'' آپ کو معلوم ہے کہ جب احادیث جمع کی گئی ہیں تو اس کے لیے محدثین نے دور دراز کے سفر کیے۔ ایسا بھی ہوا کہ حدیث جمع کرنے والے صاحب کو معلوم ہوا کہ فلاں شہر مثلاً بصرہ یا بغداد میں ایک صاحب موجود ہیں جو اس حدیث کی روایت ایسی سند سے کرتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد کم ہے تو وہ لمبا سفر کر کے گئے اور جا کر کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ حضور ﷺ کی یہ حدیث اس سند سے روایت کرتے ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا: جی ہاں' یہ حدیث میں اس طرح روایت کرتا ہوں۔ بس وہ حدیث سنی اور فوراً واپس آ گئے اور کہا کہ میں صرف اس مقصد کے لیے آیا تھا اور اس مقصد میں کسی اور چیز کو میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔

اسی طرح بعض لوگ مراکزِ علمی کی طرف سفر کرتے تھے۔ جیسے مشہور واقعہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی والدہ نے حصولِ علم کے لیے روانہ کیا تو کچھ اشرفیاں ان کی واسکٹ کے اندر سی دی تھیں کہ وقتِ ضرورت ان کے کام آئیں گی۔ راستے میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالا۔ ڈاکوؤں کا سردار ہر ایک سے پوچھتا تھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ سب کہتے کہ کچھ نہیں ہے' لیکن جب تلاشی ہوتی تھی تو کچھ نہ کچھ نکل آتا تھا۔ اس نوجوان سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تو اس نے کہا میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں۔ سردار نے کہا: کہاں ہیں' ہمیں تو کہیں نظر نہیں آئیں۔ انہوں نے کہا کہ میری واسکٹ

کے اندر سلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کھول کے دیکھا تو واقعی وہاں چالیس اشرفیاں تھیں۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ ڈاکوؤں کا سارا قافلہ تائب ہو گیا۔ وہ اشرفیاں بھی انہیں واپس کیں اور باقی بھی جن کا مال لوٹا تھا' وہ واپس کیا۔ پھر ان کی زندگی نیکی کے حصول میں لگ گئی۔ معلوم ہوا کہ علم کے حصول کے لیے سفر کرنے میں یقیناً خیر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ)) ''جو شخص حصولِ علم کے لیے کوئی سفر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی بدولت اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے''۔ طلب علم کے لیے سفر گویا جنت کی طرف سفر ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں کون سا علم مراد ہے۔ ایک علم تو وہ ہے جسے سیکھنے کے لیے ہم امریکہ یا کسی اور ملک جاتے ہیں۔ مثلاً فلاں انجینئر نگ پڑھنے جا رہے ہیں' فلاں کورس کرنے جا رہے ہیں' پی ایچ ڈی یا ایم بی بی ایس کرنے جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ علم نہیں' فنون ہیں۔ جیسے ایک موچی جوتیاں گانٹھ کر پیسے کما رہا ہے تو جوتیاں گانٹھنا ایک فن ہے' اس لیے کہ ہر شخص جوتیاں نہیں گانٹھ سکتا۔ اسی طرح بڑھئی کے پاس ایک فن ہے اور وہ اپنے فن کو استعمال میں لا کر لکڑیوں سے مختلف چیزیں بناتا ہے۔ یہی معاملہ ایک بڑے سرجن کا ہے کہ وہ بھی جسم کو چیرتا ہے' اس میں سے کوئی غلط چیز نکال کر پھر سی دیتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹری' انجینئر نگ وغیرہ یہ علوم نہیں' فنون ہیں۔ اصل علم تو علم ہدایت ہے جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا مصداق وہ شخص ہے جو علمِ ہدایت کے حصول کے لیے سفر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سفر کی بدولت اس کے لیے جنت کا سفر آسان کر دیتا ہے۔

تلاوتِ قرآن اور درس و تدریس کی فضیلت

آگے سنیے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ......)) ''اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرنے کے لیے اور

آپس میں ایک دوسرے کو درس دینے کے لیے.....'' ایک تو ہمارا (یک طرفہ) درس ہوتا ہے' یہ تھوڑا لمبا ہوتا ہے' اس لیے کہ اس میں آیت کے ہر ہر لفظ کے بارے میں بتانا پڑتا ہے کہ اس کے یہ معانی ہیں' اس کی یہ ترتیب ہے' یہ ترجمہ ہے اور پھر اس کا مفہوم یہ ہے۔ یہاں لفظ ''تدارس'' آیا ہے۔ تدارس کا عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ یعنی آپ ایک سٹڈی سرکل بنا کر بیٹھ جائیں۔ ایک آیت پڑھی گئی تو ہر ایک سے باری باری پوچھا گیا کہ آپ نے اس سے کیا سمجھا؟ اس طرح سب نے جو سمجھا وہ باہمی تبادلہ کر دیا۔ یہ ایک بہت اچھی روایت ہے اور میں نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں انگلینڈ میں یہ دیکھا تھا۔ پاکستانی لڑکوں کا ہاسٹل تھا' وہاں یہ ہوتا تھا کہ جمعہ کے بعد لڑکے بیٹھتے تھے ——لڑکے بھی وہ تھے کہ کوئی پی ایچ ڈی کر چکے تھے' کوئی کر رہے تھے' کوئی ایم اے یا ایم ایس سی کے سٹوڈنٹ تھے۔ ان میں کوئی بھی پرائمری' ہائی سکول یا کالج لیول کے سٹوڈنٹ نہیں تھے —— وہ نمازِ جمعہ کے بعد حلقہ بنا کر بیٹھتے۔ قرآن مجید کا ایک رکوع ایک نے پڑھا' اگر اس میں اس نے کوئی غلطی کی تو اس کی تصحیح کر دی گئی۔ وہی رکوع دوسرے نے پڑھا' پھر تیسرے نے پڑھا تاکہ تجوید صحیح ہو جائے۔ پھر ان کے ذمے یہ ہوتا تھا کہ ہر کوئی مختلف تفسیر پڑھ کے آئے اور اپنا اپنا بیان کرے—— تو اسے ہم کہیں گے سٹڈی سرکل۔ یہ تدارس ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے بہت فضائل کا باعث قرار دیا ہے۔

<u>سکون اور اطمینان کے نزول کا باعث:</u> آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں اللہ کی کتاب کو پڑھنے کے لیے اور آپس میں باہم ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے (تدارس) کے لیے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے: ((اِلاَّ نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ)) ''ان پر سکینت نازل ہوتی ہے''۔ یعنی اللہ کی طرف سے سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے جو ایمان کا اصل حاصل ہے۔ ایمان' امن سے ہے' اسی لیے حضور ﷺ مہینے کا نیا چاند دیکھتے تھے' تو کہتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ' رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ))[1] ''اے اللہ اس چاند کو ہمارے لیے امن'

(۱) سنن الدارمی' کتاب الصوم' باب ما یقال عند رؤیۃ الھلال۔

ایمان‘ سلامتی اور اسلام کا باعث بنا۔ (اے چاند) میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے“۔ سلامتی‘ اسلام سے ہے اور امن‘ ایمان سے۔ امن انسان کی داخلی کیفیت ہے‘ جبکہ سلامتی ایک معاشرتی معاملہ ہے۔ پہلے امن ہوگا اور بعد میں معاشرہ میں سلامتی کا دور دورہ ہوگا۔ امن وسلامتی بہت ضروری ہے تاکہ کسی سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے‘ کوئی کسی کو ناحق قتل نہ کرے‘ کوئی کسی کا مال نہ چھینے‘ لہٰذا ایک دوسرے کے لیے سلامتی والے بن جاؤ۔ اہلِ جنت کے بارے میں آیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کریں گے: ﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴿۲۶﴾﴾ (الواقعہ)۔ حضورﷺ نے بھی فرمایا کہ اپنے مابین سلام کو عام کرو۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں‘ لیکن اگر کہیں بڑا چھوٹے کو سلام کرے تو دوگنا ثواب ہو جائے گا اور چھوٹے کو ایک طرح سے ادب کی تعلیم ہو جائے گی کہ مجھے پہلے سلام کرنا چاہیے‘ لہٰذا ہر مسلمان کو سلام کرو۔ ایک حدیث میں تو بڑے پیارے الفاظ آئے:

((لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا، أَوَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ، أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ))(۱)

”تم ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوسکو گے جب تک کہ مؤمن نہ ہو‘ اور تم ہرگز مؤمن نہ ہوسکو گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہاری راہنمائی نہ کروں اس چیز کی طرف کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو آپس میں محبت پیدا ہو جائے: اپنے درمیان سلام کو عام کرو!“

دنیا میں greeting کے اور بھی الفاظ ہیں‘ مثلاً گڈ مارننگ‘ گڈ ایوننگ‘ ہائے‘ ہیلو‘ نمستے وغیرہ‘ لیکن ان میں بہترین ”السلام علیکم“ ہے اور اس کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ اس کے جواب کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم اس سے بڑھ کر جواب دو‘ نہیں تو کم سے کم اتنا جواب تو لازمی دو۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ﴾ (آیت ۸۶) ”اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو“۔ بعض لوگ اپنے تکبر میں سلام کے جواب

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون......

میں بس سر ہلا دیتے ہیں۔ یہ رویہ صحیح نہیں ہے اور یہ تکبر کی علامت ہے۔ کسی نے آپ کو ''السلام علیکم'' کہا ہے تو جواب میں آپ ''وعلیکم السلام'' کہیں' بلکہ بہتر ہے کہ بڑھا کر ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہیں۔

رحمت اور فرشتوں کا گھیر لینا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے گھر میں جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں' درس و تدریس کرتے ہیں تو ان پر ایک تو سکون و اطمینان کی کیفیت نازل ہوتی ہے' دوسری فضیلت ان کی یہ ہے کہ: ((وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ)) ''اور رحمت خداوندی انہیں ڈھانپ لیتی ہے''۔ ان پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ میرا کلام پڑھ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ تیسری فضیلت یہ بتائی گئی کہ: ((وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ)) ''اور فرشتے ان کے گرد چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیتے ہیں۔''

اللہ کا فرشتوں کے سامنے اُن کا تذکرہ کرنا: مندرجہ بالا تین فضائل کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ایک اور فضیلت بھی بیان فرمائی ہے جو ان سب سے اعلیٰ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ)) ''اللہ ان کا ذکر کرتا ہے ان کے سامنے جو اس کے پاس ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ملائکہ مقربین ہیں' تو اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنے ان نیک بندوں کا تذکرہ کرتا ہے — ملائکہ کے بھی کچھ درجے ہیں۔ ملائکہ کا ایک گروہ دنیا کے انتظام و انصرام میں لگا ہوا ہے۔ ایک گروہ ملائکہ مقربین کا ہے جو اللہ تعالیٰ سے نہایت قرب رکھتے ہیں۔ پھر وہ آٹھ فرشتے ہیں جو حاملینِ عرش ہیں' اللہ تعالیٰ کے عرش کو تھامے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ چنانچہ فرشتوں کے اندر بھی حفظِ مراتب کا معاملہ ہے — لہٰذا اللہ تعالیٰ ملائکہ مقربین میں ان کا ذکر کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم تو کہتے تھے یہ آدم زمین میں خونریزی کرے گا اور فساد مچائے گا' لیکن دیکھو میرے یہ بندے بغیر کسی دنیوی غرض کے صرف میرے کلام کو سمجھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اسی دور میں' اسی لاہور میں سات سات سو آدمی اتوار کی صبح کو میرا

درس سننے کے لیے مسجد شہداء میں جمع ہوتے رہے ہیں۔اس درس میں کوئی سیاست کی بات نہیں ہوتی تھی‘ نہ حکومت کے خلاف اور نہ اپوزیشن کے حق میں۔اسی طرح اس میں فرقہ واریت کی بھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی‘ نہ اختلافی مسائل ہوتے تھے اور نہ ہی قصے کہانیاں ہوتی تھیں‘ بلکہ صرف اور صرف اللہ کی کتاب پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا ہوتا تھا۔جو اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے اسے کھل کر بیان کیا جاتا تھا اور اس ضمن میں کوئی کتمان نہیں ہوتا تھا‘ کوئی بات چھپائی نہیں جاتی تھی۔ایسی محافل کے بارے میں ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے فرشتوں کے سامنے کرتا ہے۔

زیر مطالعہ جملہ میں ’’فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں اور اس کا مصداق اولاً مسجد ہی ہو گی‘ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں۔ویسے تو ہم ’’بیت اللہ‘‘ خانہ کعبہ اور مسجد حرام کو کہتے ہیں‘ لیکن آپ ﷺ کے فرمان کی رو سے کُل روئے زمین کی مسجدیں کعبہ کی بیٹیاں ہیں۔جبکہ شارحین حدیث نے اس کو عام رکھا ہے کہ یہ صرف مسجد کے ساتھ خاص نہیں ہے‘ بلکہ جس جگہ کو بھی آپ نے تلاوتِ قرآن مجید اور درس و تدریس کے لیے خاص کیا ہے تو گویا اس کا شمار بھی اللہ کے بیوت میں ہو گا۔

ایک بار پھر سن لیجیے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ)) ’’نہیں جمع ہوتے کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں‘‘ ((یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ)) ’’اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے کو افہام و تفہیم کرتے ہوئے‘‘ ((اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ)) ’’مگر یہ کہ ان پر سکینت نازل ہوتی ہے‘‘ ((وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ)) ’’اور رحمت خداوندی ان کو ڈھانپ لیتی ہے‘‘ ((وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ)) ’’اور فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں‘‘ ((وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ)) ’’اور اللہ ان کا تذکرہ اُن فرشتوں سے کرتا ہے جو اُن کے پاس ہیں‘‘ کہ میرے بندے میرے فلاں گھر میں یا فلاں مقام پر میری کتاب کو پڑھنے کے لیے جمع ہیں اور اس میں ان کا کوئی اور مقصد نہیں ہے‘ کوئی دُنیوی غرض و غایت نہیں ہے سوائے میری کتاب سے محبت کے۔

بغضِ صحابہؓ درحقیقت بغضِ رسولؐ ہے!

میں نے آپ کو یہ حدیث سنائی تھی:

((اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ أَصْحَابِي لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِي ، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ أَحَبَّهُمْ ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ أَبْغَضَهُمْ))(۱)

''میرے بعد میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرنا اور ان کو ہدفِ ملامت نہ بنانا' اس لیے کہ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔''

یعنی میرے اصحاب پر تنقید کرنے' سب وشتم کرنے' ان کی برائی بیان کرنے سے بچو۔ جو کوئی بھی ان سے محبت کرتا ہے وہ میری محبت کی وجہ سے کرتا ہے' اس لیے کہ وہ نسبتِ محمدیؐ کے ساتھ صحابی بنا ہے۔ چنانچہ جس کے دل میں میری محبت ہے تو اس کے دل میں میرے صحابہؓ کی محبت بھی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ جو میرے صحابہ سے بغض رکھے گا تو اس کا اصل بغض مجھ سے ہے۔ میرے صحابہ پر جو بغض نکالتا ہے' ان پر سب وشتم کرتا ہے' تبرّا کرتا ہے' انہیں برا بھلا کہتا ہے' ان پر تنقیدیں کرتا ہے تو درحقیقت اسے اُن سے نہیں' مجھ سے بغض ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص آنحضور ﷺ پر تو اپنا بغض نکال نہیں سکتا' اس لیے کہ آپ ﷺ کو کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسے آسمان پر تھوکنا۔ اب تھوک آسمان پر تو جائے گا نہیں' اپنے منہ پر ہی آئے گا۔ آپ ﷺ تو اتنی بلند ترین شخصیت ہیں کہ کوئی بہت ہی بدنصیب اور بہت ہی بدطینت انسان ہوگا جو آپ ﷺ کی ذات پر طعن وتعریض کرے گا۔ جو کچھ بھی ڈنمارک میں یا مغرب میں کہیں اور ہو رہا ہے وہ تو دشمن کر رہے ہیں' لیکن نام نہاد مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے آپ ﷺ کی ذات پر رکیک حملے کیے' چاہے وہ سلمان رشدی ہو یا تسلیمہ نسرین بنگالی' جو نام کے مسلمان تھے۔ بہرحال عام طور پر لوگ حضور ﷺ کی ذات پر حملہ نہیں کرتے بلکہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حملہ

(۱) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب فی سب اصحاب النبی ﷺ۔

کرتے ہیں‘ اور اس حملے کی زد دراصل حضور ﷺ کی ذات پر پڑتی ہے‘ کیونکہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پھل کڑوا ہوگا تو لوگ کہیں گے اس درخت کا پھل اچھا نہیں ہے اور اگر پھل اچھا ہے تو لوگ درخت کی تعریف کریں گے۔ گویا بغضِ صحابہؓ دراصل بغضِ رسولؐ ہے۔ اسی لیے صحابہؓ پر تنقید کرنے اور طعن و تشنیع سے بہرصورت بچنا چاہیے۔

کامیابی کا دارومدار حسب ونسب پر نہیں‘ اعمال پر ہے

زیرمطالعہ حدیث میں آخری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَمَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ)) ”جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے رکھ دیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا“۔ یعنی اصل چیز انسان کا عمل ہے‘ حسب ونسب سے انسان آگے نہیں بڑھتا۔ کسی کو اس چیز کا گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں‘ میں فلاں نسل سے ہوں۔ یہودیوں کو اپنی نسل پر فخر تھا اور وہ کہتے تھے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط﴾ (المائدۃ: ۱۸) ”ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں“۔ ہمارے ہاں بھی اسی طرح کے معاملات ہوتے ہیں۔ سیدزادہ اپنے نسب پر فخر کرتا ہے کہ میں سیدزادہ ہوں۔ حسب نسب اپنی جگہ ہے‘ اسلام اس کی نفی نہیں کرتا‘ لیکن اگر اس کا اپنا عمل پیچھے رہ گیا اور اس کے عمل نے اسے پیچھے چھوڑ دیا تو پھر یہ محض نسبت کی وجہ سے آگے نہیں آ سکتا۔ فارسی میں بڑی اچھی کہاوت ہے: ”پدرم سلطان بود!“ (میرا باپ بادشاہ تھا!) اب اس پر کوئی کہے گا: ”ترا چہ؟“ یعنی تمہارا باپ تو سلطان تھا‘ لیکن تم کیا ہو؟ لہٰذا آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا عمل اسے پیچھے چھوڑ دے اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن وحدیث کی ان تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
37

اللہ ربّ العزت کا فضلِ عظیم اور اُس کی وسعتِ رحمت

۱۸ جولائی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (الانعام)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (القصص)

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (المؤمن)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا ، عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْمَا يَرْوِيْ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ قَالَ :

((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ ــــ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً ، فَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ ، وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً ، وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً)) (۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب من هم بحسنة او بسيئة۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان ، باب اذا هم العبد بحسنة كتبت واذا هم بسيئة لم تكتب۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں اور پھر اس کو واضح بھی کر دیا ہے ـــــ کوئی شخص نیکی کا ارادہ کرے اور ابھی اس نے اس پر عمل نہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاں مکمل نیکی درج فرمالیتا ہے۔ اور اگر نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کرلے تو اللہ تعالیٰ اس ایک نیکی کو اپنے ہاں دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ لکھ لیتا ہے۔ اور اگر انسان برائی کا صرف ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو بھی اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاں مکمل نیکی لکھ لیتا ہے۔ اور اگر برائی کا ارادہ کر کے عمل بھی کرلے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اسے صرف ایک ہی گناہ لکھتا ہے۔''

معزز سامعین کرام!

اربعین نووی کی حدیث نمبر ۳۷ کا آج ہم نے مطالعہ کرنا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و رأفت کی عظیم ترین مظہر ہے اور یہی مضمون قرآن مجید میں بھی کئی جگہ بیان ہوا ہے۔

نیکی کا بدلہ بے بہا اور بدی کا بمطابقِ عمل

میں نے ابتدا میں تین آیات تلاوت کی ہیں' حدیث کے مطالعہ سے قبل ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ پہلی آیت سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۰ ہے جس میں فرمایا: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ﴾ ''جو کوئی نیکی کا کوئی عمل کرے گا تو اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہوگا''۔ یعنی اللہ کی راہ میں اگر آپ نے سو روپیہ دیا ہے تو آپ اللہ کی طرف سے ایک ہزار روپے کے حق دار قرار پائیں گے۔ ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦٠﴾﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا تو اسے بس اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی کہ اس نے برائی کی تھی اور ان لوگوں پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی''۔ یعنی اگر آپ نے کسی کے دس روپوں میں خیانت کی ہے تو آپ کو اتنی ہی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی۔ گویا نیکی کی جزا اللہ تعالیٰ بڑھا کر دیں گے (اس آیت میں تو

دس گنا، جبکہ بعض آیات میں سات سو گنا اور بعض میں بے بہا اور اَن گنت اجر کا ذکر ہے)، جبکہ اس کے برعکس بدی کی جزا اتنی ہی ہے جتنا کہ کسی نے عمل کیا ہے۔

دوسری آیت سورۃ القصص کی آیت ۸۴ ہے، فرمایا: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ﴾ ''جس کسی نے کوئی نیکی کمائی اس کے لیے اس سے بہت بہتر بدلہ ہے''۔ اب یہاں گنتی نہیں بتائی گئی، بلکہ مطلق بات کی گئی کہ نیکی کا بدلہ نیکی سے بہت بہتر ہوگا۔ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۸۴﴾ ''اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کو برائی کا بدلہ اتنا ہی دیا جاتا ہے جتنا کہ اس نے عمل کیا ہوتا ہے۔''

تیسری آیت سورۃ المؤمن کی آیت ۴۰ ہے اور اس آیت میں ماقبل دونوں آیات کے برعکس پہلے بدی کا ذکر ہے اور پھر نیکی کا۔ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ﴾ ''جو کوئی کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے بدلہ نہیں ملتا مگر اسی قدر جتنا اس نے بدی کی ہے''﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ......﴾ ''اور جس نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اور ہو وہ مؤمن......''

نیکی کی قبولیت کے لیے ایمان شرطِ لازم!

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ کوئی کافر اور مشرک بھی بعض اوقات نیکی کا کام کرتا ہے، لیکن ان کی وہ نیکی قبول نہیں ہوتی، اس لیے کہ نیکی کی قبولیت کے لیے مؤمن ہونا شرطِ لازم ہے، یعنی وہ اللہ کو مانتا ہو اور اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔ نیکی کے حوالے سے ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' کے درس ۲ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ موجود ہے جو تقویٰ اور نیکی کی اصل حقیقت کے حوالے سے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے۔ چنانچہ اس آیت کو ''آیۃُ البر'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں واضح طور پر فرما دیا گیا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى

حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ......﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخر پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر' اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں......''

اس آیت میں بہت سی نیکیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے' لیکن اوّلین اور شرطِ لازم ایمان کو قرار دیا گیا ہے' اس لیے کہ درحقیقت ایمان سے نیت کا تعین ہوتا ہے کہ آپ نیکی کس لیے کر رہے ہیں۔ اگر تو اللہ پر ایمان ہے تو یہ نیکی اللہ کے لیے ہے اور اللہ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے ہے' اور اگر ایمان نہیں ہے تو پھر ریاکاری ہو رہی ہو گی یا دنیا کا کوئی اور مقصد پیش نظر ہو گا۔ مثلاً کسی نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کر دی ہے اور وزیراعظم سے اس کا افتتاح بھی کرا لیا ہے' لیکن اس کے پیش نظر لوگوں کی فلاح و بہبود نہیں' بلکہ بہت سے دوسرے فائدے اٹھانا ہے' لہٰذا نیکی کی قبولیت کا دار و مدار آپ کی نیت پر ہے۔

دوسری بات اس آیت میں یہ فرمائی گئی کہ نیکی کی قبولیت کے لیے آخرت کا یقین بھی ضروری ہے' یعنی اس نیکی کا کوئی بدلہ دنیا میں مطلوب نہ ہو' بلکہ اس کا پورے کا پورا اجر آخرت میں مطلوب ہو۔ اس لیے کہ دنیا کے بدلے کے لیے کوئی بھی کام کرنا کاروبار اور تجارت کے زمرے میں آتا ہے جو حلال طریقے سے ہو تو جائز ہے' حرام نہیں ہے۔ لیکن نیکی کے کام میں اس کا کوئی بدلہ دنیا میں اگر مطلوب ہے تو وہ نیکی نہیں رہے گی' بلکہ نیکی کی نفی ہو جائے گی۔

بہرحال سورۃ المؤمن کی زیرِ مطالعہ آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جس نے نیکی کا کوئی کام کیا' خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اور ہو وہ مؤمن'' ﴿فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ﴿۴۰﴾﴾ ''تو وہ لوگ ہوں گے جو جنت میں داخل کیے جائیں گے اور وہاں انہیں جو کچھ ملے گا وہ حساب کتاب سے ماوراء ہو گا''۔ یعنی نیکی کا اجر دس گنا یا سات سو گنا میں مقید نہیں ہے' بلکہ

نیکی کا جو اجران کے لیے جنت میں ہے' اس کا تو کوئی حساب کتاب ہی نہیں ہے۔

جنت کی نعمتیں: انسانی تصور سے ماوراء

میں بہت دفعہ یہ واضح کر چکا ہوں کہ قرآن مجید میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں ان چیزوں کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں ہم جانتے بھی ہیں اور جو یہاں موجود بھی ہیں' جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ...... ﴾ (البقرة:٢٥) ''جب بھی انہیں دیا جائے گا وہاں کا کوئی پھل رزق کے طور پر (یعنی کھانے کے لیے) وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا......'' وہاں آم دیا جائے گا تو اہلِ جنت کہیں گے کہ ہم تو دنیا میں بھی آم کھاتے تھے' لیکن اس آم کی جو لذت ہوگی اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دوسری اصولی بات اس حوالے سے یہ ہے کہ قرآن مجید میں مذکور ساری نعمتوں کی حیثیت دراصل ابتدائی مہمان نوازی کی ہے' جسے عربی میں نُزُل کہتے ہیں۔ نَزَلَ يَنْزِلُ بمعنی اُترنا۔ جیسے ہی کوئی شخص آپ کے دروازے پر آیا اور کسی سواری سے اترا' تو وہ ''نَزِیل'' ہے اور آپ فوری طور پر موسم کے مطابق کوئی ٹھنڈا یا گرم اسے پیش کر دیتے ہیں اس کو نُزُل کہتے ہیں۔ اب اگر وہ آپ کے ہاں مقیم ہو گیا تو وہ ''ضَیف'' یعنی مہمان ہے اور پھر اس کی ضیافت ہوگی جس کے لیے آپ یقیناً اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ سے عمدہ اہتمام کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے مہمانوں یعنی اہل جنت کی ضیافت جن نعمتوں کے ذریعے کریں گے ان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ :اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ، فَاقْرَءُ وْا اِنْ شِئْتُمْ : فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها۔ یہ حدیث بخاری ومسلم اور صحاح ستہ کی دیگر کتب کے متعدد ابواب میں بیان ہوئی ہے۔

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا:) اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ''پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہلِ جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے (السجدۃ:۱۷)۔''

اہلِ ایمان جنت کی نعمتوں کے مستحق ہیں!

بہرحال قرآن مجید میں اہلِ جنت کی ابتدائی مہمانی کے لیے جن دنیوی نعمتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے' اُن سے اہلِ ایمان نے اپنے آپ کو یا تو حرام ہونے کی وجہ سے روکے رکھا یا وہ ان چیزوں سے اس لیے لطف اندوز نہیں ہو سکے کہ وہ اللہ کے دین کی جدّ و جُہد کے اندر لگے رہے ــــ اچھا کھانا' اچھا پہننا حرام نہیں ہے' اسی لیے فرمایا گیا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیں کہ کس نے حرام کی ہے وہ زینت جو اللہ نے نکالی ہے اپنے بندوں کے لیے؟ اور (کس نے حرام کی ہیں) پاکیزہ چیزیں کھانے کی؟'' اچھی اور پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے بنائی ہیں۔ ویسے دنیا میں تو وہ یہ سب کافروں کو بھی دے دیتا ہے' لیکن قیامت کے دن تمام نعمتیں اہل ایمان کے لیے خالص ہو جائیں گی اور پھر وہاں کافروں کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ لیکن فرض کیجیے کہ آپ انقلابی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور آپ کا سارا وقت اللہ کے دین کو پھیلانے اور غالب کرنے کی جدوجہد میں لگ رہا ہے تو آپ دنیا کو زیادہ نہیں کما پائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ ان نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ آپ کہاں آم اور انگور وغیرہ خرید کر کھا سکیں گے؟ وہ تو دو وقت کی روٹی مل جائے تو بہت غنیمت ہے۔ لہٰذا یا تو حلال اور حرام پر کاربند ہونے کی وجہ سے بندۂ مؤمن ان نعمتوں سے محروم ہو گیا یا اس نے اپنی ساری توجہ دین کے لیے لگائی اور اب اس کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ زیادہ کما سکے' لہٰذا اس وجہ سے وہ محروم رہ گیا۔

اس کا منطقی طور پر بدلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ نعمتیں اسے آخرت میں بھرپور طریقے پر ملیں۔ اس لیے کہ اس نے حرام کمائی نہیں کی اور ان نعمتوں سے خود بھی محروم رہا اور اپنے بچوں کو بھی محروم رکھا' ورنہ کون نہیں چاہتا کہ جب بھی شام کو گھر آئے تو اپنے بچوں کے لیے پھلوں کا ٹوکرا بھر کر لائے۔ لیکن جو شخص حلال کی کمائی کر رہا ہے وہ کیسے لائے گا' کیسے کھائے گا' کیسے کھلائے گا؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن یہ کیا باتیں کرتا ہے کہ اہلِ جنت کے لیے شرابِ طہور ہوگی' دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی' پھلوں کے باغات ہوں گے' حوریں ہوں گی' خدمت گار نوعمر لڑکے ہوں گے' وغیرہ۔ جن کے اوپر ذرا تصوف کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو چیزیں اہلِ جنت کے لیے بتائی جارہی ہیں' یہ تو بڑی گھٹیا سی چیزیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا بلا جواز ہے' اس لیے کہ ایک بندۂ مؤمن دنیا میں ان تمام چیزوں سے محروم رہا تو اس کا منطقی طور پر بدلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ نعمتیں بھرپور ترین سطح پر اسے آخرت میں مہیا ہوں۔

حدیث قدسی اور وحی خفی

اب آیئے اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث کی طرف' جسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کر رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ تعالیٰ سے روایت کر رہے ہیں۔ گویا یہ حدیث قدسی ہوگئی۔ یہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی جو حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے تو ایسی احادیث کو اصطلاحِ حدیث میں ''حدیث قدسی'' کہا جاتا ہے۔ ان احادیث قدسیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی خفی بھی حضور ﷺ پر نازل ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی ایک وحی جلی تھی جو قرآن میں درج ہوتی تھی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وحی جلی کا ایک حرف بھی قرآن کے اندر درج ہونے سے رہ گیا ہو۔ دوسری طرف وحی خفی بھی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی تھی' جو ہوتا تو اللہ کا کلام تھا' لیکن یہ قرآن میں درج نہیں ہوتی تھی۔

وحی خفی صرف انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے مخصوص نہیں' بلکہ یہ کسی نہ کسی درجے میں آپ کو اور مجھے بھی ہوتی ہے۔ کبھی الہام سا ہو جاتا ہے' کبھی دل میں بات آ جاتی

ہے، کبھی انسان سچا خواب دیکھتا ہے، مثلاً آپ نے خواب میں ایک واقعہ دیکھا جو کچھ دنوں بعد جوں کا توں ظہور پذیر ہو گیا تو یہ سب بھی وحی خفی کی مثالیں ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ ہم نے شہد کی مکھی کو وحی کی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی وحی کی گئی، حالانکہ وہ نبی تو نہیں تھیں اور نبوت تو خواتین کے لیے ہے ہی نہیں، تو یہ وحی خفی ہے۔ اس حوالے سے یہ اصول یاد رکھیں کہ وحی خفی جب کسی نبی پر آتی ہے تو وحی جلی کی طرح بالکل محفوظ ہوتی ہے اور اس میں کوئی شیطانی اثرات شامل نہیں ہو سکتے، لیکن جو وحی خفی غیر نبی پر آتی تو وہ غلط بھی ہو سکتی ہے، اس میں شیطانی آمیزش بھی ہو سکتی ہے اور اس میں ہماری خواہشاتِ نفس کے تقاضے بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ جیسے فرائڈ کے نزدیک خواہشاتِ نفس ہی خواب کا روپ دھار لیتی ہیں جب وہ کسی وجہ سے پوری نہیں ہوتیں۔ درحقیقت یہ وہ خواب ہیں جن کو نفسانی خواب کہا گیا ہے، جبکہ ایک خواب سچے ہوتے ہیں جو اللہ اور ملائکہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور یہی خواب وحی خفی کا مصداق ہیں۔

نیکی کا اجر، حساب کتاب کی قید سے آزاد

بہرحال زیرِ مطالعہ حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ)) ''دیکھو اللہ نے نیکیاں اور بدیاں طے کر دی ہیں اور پھر ان کو واضح بھی کر دیا ہے''۔ وہ حدیث ہم پڑھ چکے ہیں: ((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ)) کہ حلال بھی بالکل واضح ہے اور حرام بھی بالکل واضح ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً)) ''جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور پھر اس پر عمل نہیں کر سکا تو اس ارادے پر بھی اسے ایک مکمل نیکی کی جزا مل جائے گی''۔ عمل نہ کرنے کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں، یا تو حالات نے اجازت نہ دی ہو، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد میں اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑ گیا ہو، لیکن اس نے ارادہ کیا تھا تو اب ارادہ کرتے ہی اسے ایک نیکی مل جائے گی۔ زیرِ مطالعہ جملہ میں هَمَّ کا لفظ آیا ہے، اسی سے لفظ ''اہتمام'' ہے اور اسی سے ''ہمت'' کا لفظ بنا

ہے۔لہٰذا اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ کسی نے نیک کام کرنے کے لیے کمر ہمت کس لی' لیکن وہ اپنے ارادے کو بعض خارجی موانع کی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا —— فرض کیجیے کہ اپنے مال میں سے بڑا صدقہ نکالنا چاہتا تھا لیکن مال پر ڈاکہ پڑ گیا تو اب مال ہی نہیں رہا جسے صدقہ کر سکے —— یا اپنی سستی کی بنا پر اس پر عمل نہیں کر پایا' یا اندرونی کیفیات کی وجہ سے نیکی کا ارادہ کچھ کمزور پڑ گیا' لیکن چونکہ اس نے ارادہ تو کیا تھا' لہٰذا اس ارادے کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے پاس ایک مکمل نیکی لکھ لے گا۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ)) ''اور اگر اس نے ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس ایک نیکی کو اپنے ہاں دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ لکھ لیتا ہے''۔ یہ ہے اللہ کا معاملہ کہ ایک نیکی پر کتنا اجر دیتا ہے۔ اسی حوالے سے میں آپ کو قرآن کی ایک اور آیت سنا دیتا ہوں —— قرآن وحدیث ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ایک کی تعلیم وحی جلی میں آئی ہے اور ایک کی وحی خفی میں' احادیث اکثر و بیشتر وحی خفی پر مبنی ہیں —— یہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۱ ہے جس میں فرمایا گیا: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ ''مثال ان لوگوں کی جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانے کی سی ہے''۔ گندم کا دانہ' چاول کا دانہ' چنے کا دانہ یا کوئی اور دانہ جسے آپ نے زمین میں بو دیا تو ﴿اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ ''اس میں سے سات بالیاں (سٹے) پیدا ہوں''۔ اگر آپ نے گندم کا دانہ زمین میں بویا تھا تو اس میں سات سٹے گندم کے لگے ہوئے ہیں یا مکئی کا دانہ بویا تھا تو مکئی کے سات سٹے لگے ہوئے ہیں اور ان سات سٹوں میں سے: ﴿فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ ''ہر سٹے کے اندر سو دانے ہیں''۔ تو اب سات کو سو سے ضرب دیں تو یہ سات سو ہو گئے۔ یہی حساب اس حدیث میں آ رہا ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ کم از کم دس نیکیاں ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر سات سو گنا تک جائے گا اور بعض اوقات یہ اتنی بار ضرب کھائے گا کہ حساب کتاب کی حد سے ماوراء ہو جائے گا۔ اسی طرح اس آیت کے

آخر میں بھی فرمایا گیا کہ پھر اللہ اس اجر کو دوگنے سے چوگنا کرتا رہے گا: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾﴾ ''اور اللہ بڑھا چڑھا کر دے گا جس کے لیے چاہے گا۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قوانینِ الٰہیہ ہر منطق سے ماوراء ہیں!

یہ تو نیکی کی بات ہوگئی' جبکہ برائی کا معاملہ اس سے الگ ہے اور وہاں حساب کتاب نہیں چلے گا۔ اس بارے میں فرمایا: ((وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً وَاحِدَةً' وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً)) ''اور اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنے ہاں ایک نیکی درج کر لے گا' اور اگر برائی کا ارادہ کر کے عمل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اسے صرف ایک ہی گناہ لکھتا ہے''۔ یعنی کسی نے بدی کا ارادہ کیا تھا' لیکن اس پر عمل کرنے سے کسی وجہ سے باز رہا۔ اب یہ باز رہنا کسی خارجی مانع کے تحت بھی ہوسکتا ہے' مثلاً چوری کے ارادے سے کہیں جا رہا تھا لیکن ابھی وہاں تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ پولیس والوں نے پکڑ لیا تو وہ چوری نہیں کر پایا۔ اب منطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے بدلے میں اسے کچھ نہیں ملنا چاہیے' اس لیے کہ وہ تو چوری کرنے جا رہا تھا' اگر خارجی مانع نہ آتا تو وہ یہ برائی کر گزرتا' لیکن اس سب کے باوجود اگر چوری نہ کر سکا تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھی جائے گی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے بدی کا ارادہ کیا' لیکن ساتھ ہی باطنی کیفیت کے اندر ضمیر کی خلش جاگ گئی اور وہ باز آ گیا تو اس صورت میں تو لازماً اس کا حق ہے کہ اس کو نیکی کا درجہ دیا جائے۔

اب دیکھئے یہ ساری چیزیں جو یہاں آ رہی ہیں' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ منطق سے بہت اونچا ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر سورۃ الحجرات کی آیات بہت اہم ہیں۔ فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ ''یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے

ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا''۔ یعنی تم جو اسلام کی مخالفت کر رہے تھے وہ تم نے ختم کر دی' لیکن اس طرح تم مؤمن تو نہیں ہوئے نا! اب منطق تو یہی کہے گی کہ جب وہ حقیقتاً مؤمن نہیں ہیں اور مسلم انہیں مانا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ منافق ہیں اور منافق کی کوئی نیکی قبول نہیں ہونی چاہیے ـــــ لیکن یہاں ان کے اعمال کی قبولیت کا اعلان بھی ہے۔ گویا یہاں منطق نہیں چلے گی' بلکہ اللہ کا فضل و کرم اور اُس کی رحمت چلے گی: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ ''اگر تم اطاعت کرتے رہو (اس حال میں بھی کہ ایمان تمہارے دلوں میں نہیں ہے) تو اللہ تمہارے اجر و ثواب میں کمی نہیں کرے گا''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ انتہائی بخشنے والا' بے پناہ رحم کرنے والا ہے''۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین ہر منطق سے ماوراء ہیں۔

اسی طرح بعض احادیث کی رو سے اور قرآن مجید کے چند ایک مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے گناہ کا ارتکاب کیا تو ایمان اس کے دل سے نکل گیا۔ اس کے بعد اگر اس نے توبہ کر لی تو ایمان واپس آ گیا۔ یہ بات تو منطقی ہے لیکن قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ بندۂ مؤمن جیسے ہی گناہ سے فارغ ہوتا ہے تو وہ ایمان جو اس کے دل سے نکل گیا تھا' فوراً واپس آ جاتا ہے۔ یہ بات منطق کے تو خلاف ہے۔ توبہ کے بعد ایمان کا واپس آ جانا تو سمجھ میں آتا ہے' لیکن محض گناہ کا ارتکاب ختم ہونے کے بعد ایمان کا واپس لوٹ آنا منطق کے خلاف ہے' لیکن ہم اس کو مانیں گے' اس لیے کہ یہ اللہ ربّ العزت کا فضل ہے جو کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ جیسے آج کی زیر مطالعہ حدیث میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ نیکی کے ساتھ اللہ کا معاملہ کچھ اور ہے' جبکہ بدی کے ساتھ کچھ اور ہے۔ بدی کی صورت میں اس کے برابر سزا ملے گی' اس کے برعکس نیکی کے معاملے میں دس گنا' سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔ اب منطق اس کو نہیں مانتی کہ نیکی کا بدلہ نیکی سے زیادہ ہو' لیکن ان چیزوں کے اندر بات منطق کی نہیں' اللہ کے فضل و کرم کی ہے۔

اللہ عزوجل کی وسعتِ رحمت

سورۃ الاعراف (آیت ۱۵۶) میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حوالے سے فرمایا گیا: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ ''اور میری رحمت ہر شے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے''۔ اسی طرح یہ حدیث قدسی بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ فرماتا ہے: ((سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ)) ''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے جاتی ہے'' — یقیناً اللہ تعالیٰ سزا دینے والا بھی ہے' شدید العقاب بھی ہے' لیکن ساتھ ہی غفور بھی ہے' رحیم بھی ہے اور اس کی شانِ غفوری اس کی سزا والی شان سے بالاتر ہے۔ بہرحال وہ بدلہ لینے والا بھی ہے اور سزا دینے والا بھی ہے۔ آخر جہنم کس لیے بنائی ہے' حساب کتاب کس لیے ہو رہا ہے' کراماً کاتبین جو ہر وقت ہمارے اعمال لکھ رہے ہیں' یہ سب کس لیے ہے؟ اس لیے کہ اسی کی بنیاد پر ہمارا حساب کتاب ہوگا' جزا و سزا بھی ملے گی۔ یہ سب ہوگا' لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت غالب ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ''رحمتِ حق بہانہ می جوید'' یعنی رحمتِ خداوندی تو بہانہ چاہتی ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہو' بنیاد ہو تو اس کی رحمت جوش میں آ جائے۔ اس قول کو اس طرح بھی پیش کیا جاتا ہے: ''رحمت حق بہا نمی جوید'' یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنی قیمت نہیں چاہتی — چنانچہ قرآن مجید میں چار جگہ آیا ہے: ﴿وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۵۱' یوسف: ۶٤ و ۹۲' الانبیاء: ۸۳) ''وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے''۔ حضور ﷺ نے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ سوچو تو سہی کہ کیا کوئی ماں کبھی چاہے گی کہ اس کے بچے کو آگ میں ڈال دیا جائے؟ اسی طرح اللہ بھی نہیں چاہے گا کہ اپنی مخلوق کو آگ میں ڈالے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ (النساء: ۱٤۷) ''اللہ کو کیا لینا ہے تمہیں عذاب دے کر اگر تم اللہ کے شکر گزار بندے بنو اور اس پر ایمان لاؤ!'' کچھ لوگوں کو دوسروں کو اذیت دینا پسند ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! اللہ عزوجل ایسا ہرگز نہیں ہے' بلکہ رحمتِ خداوندی تو بہانہ چاہتی ہے اور اس کی رحمت کی وسعت کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔

انسان کی اندرونی کیفیت کے تین درجات

زیرِ مطالعہ روایت بھی اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت کی مظہر ہے جس میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے لیے مکمل نیکی لکھی جائے گی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ دونوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خارجی مانع کی وجہ سے برائی نہیں کر سکا یا پھر خود اس کے اندر ہی کچھ کشاکش شروع ہوگئی جس کی وجہ سے وہ برائی سے رک گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ خیر و شر کی کشاکش ہمارے اندر برپا رہتی ہے۔ ہمارا نفسِ امارہ ہمیں نیچے کھینچتا ہے' جبکہ روح ملکوتی اوپر کھینچتی ہے۔ ع ''ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر!''

فرائڈ کے حوالے سے یہ بات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ صرف نفسانی خوابوں کا تجزیہ کرتا ہے کہ خواہشاتِ نفس جب پوری نہیں ہوتیں تو وہ خواب کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس کی یہ بات ٹھیک ہے' لیکن اسے پتا ہی نہیں ہے کہ ملکوتی خواب اور سچا خواب بھی کوئی حقیقت ہے۔ بہرحال فرائڈ کی ایک بات سے میں اس کی ذہانت کا قائل ہوں۔ اس نے انسان کی اندرونی کیفیت کے تین درجے معین کیے اور میں حیران ہوں کہ یہی تین درجے قرآن بیان کرتا ہے۔ قرآن کے مطابق سب سے نیچے نفس امارہ ہے' اور یہ انسان کے اندر موجود حیوانی جبلتوں (animal instincts) کی سطح ہے۔ حیوانی جبلت کا تقاضا ہے کہ کھاؤ' اس لیے کہ یہ جسم کی ضرورت ہے' جبکہ نفسِ انسانی یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میں لذتیں ہوں اور طرح طرح کے ذائقے ہوں' تنوع ہو' اسراف ہو' لیکن انسان کے اندر ایک روح ملکوتی بھی ہے جو اسے اللہ کے قریب لانا چاہتی ہے۔ اوپر روح ملکوتی ہے اور نیچے نفس امارہ ہے' جبکہ بیچ میں قلب ہے۔ ''قلب'' لغوی طور پر اس شے کو کہتے ہیں جو بدلتا رہتا ہے۔ اسی سے انقلاب ہے' یعنی نظام کا بدل جانا۔ مثلاً فرانسیسی انقلاب میں بادشاہی نظام ختم ہوا اور جمہوری نظام آ گیا...... بالشویک انقلاب میں سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوا اور کمیونزم آ گیا...... انقلابِ ایران میں شہنشاہِ ایران کی حکومت ختم ہوگئی اور علماء کی حکومت آ گئی۔

قلب کا لفظ قرآن میں بھی آیا ہے‘ فرمایا: ﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ (التوبة: ٤٨) ''اور (اے نبی ﷺ! یہ منافق) آپ کے لیے معاملات کو الٹ پلٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں''۔ درحقیقت یہ قلب جسم کا ایسا عضو ہے جس کے لیے آرام ہے ہی نہیں۔ دماغ بھی آرام چاہتا ہے‘ اسے نیند چاہیے‘ البتہ اگر آپ بہت زیادہ سوئیں گے تو دماغ کی چکی چلنی شروع ہو جائے گی اور پھر وہ آپ کو خواب دکھانے شروع کر دے گا‘ جن میں سے اکثر و بیشتر نفسانی خواب ہی ہوتے ہیں جو نفس امارہ سے متعلق ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو دماغ کی بات ہوگئی‘ لیکن قلب کے لیے کوئی آرام نہیں ہے‘ قلب ہر وقت یا تو سکڑ رہا ہے یا پھیل رہا ہے اور اس کے لیے آرام کا مطلب موت ہے۔

فرائڈ کہتا ہے کہ انسانی شعور کی نچلی سطح پر id یا libido ہے‘ یعنی انسان کے حیوانی تقاضے اور حیوانی جبلتیں۔ اس کے اوپر ego ہے‘ جس کو ہم قلب کہتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے‘ لیکن اس کے اوپر جو روح ہے‘ اس کو وہ نہیں پہچان سکا۔ وہ اس بات کو مانتا ہے کہ ego کے اوپر کوئی اور چیز ہے سہی اور وہ اس کو super ego کہتا ہے۔ پھر وہ اس کو ایسے define کرتا ہے کہ معاشرے میں موجود نیکی اور بدی کے تصورات انسان کو خبردار کرتے رہتے ہیں کہ تم یہ کام نہ کرو‘ ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ لہٰذا معاشرے کے اندر موجود اثر‘ گویا اس کی ego کے اوپر ایک طرح کی مزید رکاوٹ ہے جو اس کو برائی سے روکتا ہے۔

روح کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے!

علمِ نفس کے حوالے سے مجھے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو حاصل ہوا ہے‘ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک نفسِ امارہ ہے اور ایک روح ہے جو اللہ کی طرف سے ہے۔ آدم کی تخلیق اور اس کے تسویہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (الحجر) ''پھر جب میں اس کی نوک پلک درست کرلوں اور پھونک دوں میں اس میں اپنی روح میں سے‘ تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں''۔ اس روح کا تعلق براہِ راست

ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ تعلق کیسے ہے اور کیا ہے' اس کا صحیح ادراک ہمیں نہیں ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جان (life) کس چیز کا نام ہے اور یہ کہاں ہوتی ہے۔ آج بھی ڈاکٹروں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مریض دل کے بند ہونے سے مر گیا یا دماغ کے ڈیڈ ہونے سے۔ چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ اصل میں یہ جان ہے کہاں اور یہ کس عضو سے وابستہ ہے' دل سے یا دماغ سے۔ جب ہم اس کے بارے میں نہیں جانتے تو روح کے بارے میں ہم کیا سمجھیں گے۔ روح تو جان سے کہیں زیادہ لطیف تر شے ہے' جبکہ زندگی تو حیوانی مظہر (phenomenon) ہے۔ یہ زندگی تو کتے میں ہے' بلے میں ہے' بیل میں ہے' بکرے میں ہے' حتیٰ کہ گھاس کے تنکے میں بھی ہے۔ اگر وہ اپنی جڑ کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو اس میں بھی جان ہے جسے نباتاتی زندگی کہتے ہیں۔ روح کے بارے میں ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس
ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس!

روح ایک اتصال ہے' لیکن اس اتصال کی کیفیت کو ہم نہیں جان سکتے اور اسے کسی نوع کے اتصال پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال یہ اتصال ہے انسانوں کے رب کا انسانوں کی جان کے ساتھ!

ہمیں معلوم ہے کہ یہ انگلیاں متصل ہیں' جیسے حضورﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ))[1] یعنی میری بعثت اور قیامت اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے یہ انگلیاں جڑی ہوئی ہیں۔ میرے بعد قیامت ہے' اور اب نہ کوئی نبی آئے گا نہ کوئی رسول آئے گا۔ گویا قیامت کی سب سے بڑی نشانی حضورﷺ کی بعثت ہے۔ بہر حال روح اتصال ہے لوگوں کے رب کا انسانوں کی جان کے ساتھ۔ یہاں جان سے مراد یہ حیوانی زندگی اور بائیولوجیکل لائف نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ روح ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں الفاظ نہیں ہیں اور ہم روح کو بھی جان کہہ بیٹھتے ہیں اور

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی بعثت انا والساعة کھاتین۔

جان کو روح سمجھتے ہیں' حالانکہ جان بالکل علیحدہ شے ہے جو تمام حیوانات اور تمام نباتات میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کروڑہا مخلوقات زمین میں ہیں' پانی میں ہیں' ہواؤں میں ہیں اور وہ سب جاندار ہیں۔ انسان میں بھی جان ہے' لیکن اس کی شان یہ ہے کہ اس کی تکمیل اور اس کے تسویہ کے بعد اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے روح پھونک دی تو اب یہ روح انسان کو اوپر کھینچتی ہے' جبکہ نفس امارہ نیچے کھینچتا ہے اور قلب بیچ میں ہے۔ اگر نفس امارہ غالب ہو جائے تو وہ قلب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ قلب چونکہ آئینہ کی مانند ہے لہٰذا اب نفس کی ساری ظلمانیت قلب میں منعکس ہو کر پورے وجود کے اندر طاری ہو جائے گی اور اگر قلب کا رخ روح کی طرف ہو گیا تو روح کی نورانیت قلب میں منعکس ہو کر پورے وجود میں سرایت کر جائے گی۔

سب سے بڑی نیکی: دینِ الٰہی کے نفاذ کی جدّوجُہد

قرآن و حدیث کی روشنی میں آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ نیکی کا صرف ارادہ کرنے پر ایک نیکی مل جاتی ہے اور اس پر عمل کر لینے سے اس پر دس گنا' سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بے حساب کتاب اجر ملے گا' جبکہ اس کے مقابلے میں برائی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل نہ کرنا ازخود ایک نیکی شمار ہو گی اور اگر برائی کر لی تو پھر اس کے مطابق اور اسی کی مقدار سزا ملے گی۔ یہ گویا اس حدیث ((سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ)) اور اس آیت ﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ﴾ کی بھی ایک توجیہہ ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دامنِ رحمت میں لے لے اور ہم کم از کم نیکیوں کا ارادہ کرنے کا توفیصلہ کر لیں۔

یاد رکھیں کہ سب سے بڑی اور سب سے پہلی نیکی اللہ کے دین کے خلاف ہونے والی بغاوت کو روکنے کا ارادہ کرنا ہے' اور پھر اس میں بالفعل جدّوجُہد کرنا' تَن مَن دھن لگانا یہ سب سے اونچی نیکی ہے۔ اگر یہ ارادہ ہی نہیں ہے تو اللہ کو تمہاری نمازیں' روزے درکار نہیں ہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ اگر تم میرے وفادار ہو تو پھر طاغوت کے وفادار کیسے ہو گئے؟ یہ دو باتیں تو یکجا نہیں ہو سکتیں۔ پچھلی دفعہ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ہمارے

زیرِ مطالعہ آئی تھی: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ......﴾ (آیت۲۵۶) ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے......'' یعنی پہلے طاغوت کا کفر ہے اور پھر اللہ پر ایمان کا مرحلہ ہے۔ گویا اللہ کے دین کے خلاف ہونے والی بغاوت کو روکنے کا ارادہ کر لینا' کم سے کم نیکی ہے اور بلند ترین نیکی وہ ہوگی کہ اس راہ میں وہ وقت بھی آ جائے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم میدان میں حاضر ہو جائیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت سے سرخرو ہونے کا موقع آ جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کا ارادہ کرنے کی توفیق دے — اور خاص طور پر طاغوت سے بغاوت اور اللہ کی حکومت اور اللہ کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کا ہم نہ صرف ارادہ کریں' بلکہ اس پر عملاً کاربند ہوں اور تن من دھن لگائیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث 38

ایمان کے ظاہری و باطنی ثمرات اور تقربِ الٰہی کے ذرائع

۲۵ جولائی اور یکم اگست ۲۰۰۸ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط (البقرة:۲۵۶)

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ط لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۴﴾ (یونس)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ج وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ (ق)

كَلَّا ط لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ (العلق)

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ط اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ (بنی اسرائیل)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ: مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ ـــــ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهٗ عَلَیْهِ ، وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ

وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا' وَاِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهُ ' وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَاُعِيْذَنَّهٗ)) (۱)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو شخص میرے کسی ولی (دوست) سے عداوت رکھے تو میرا اس سے اعلانِ جنگ ہے — میرا بندہ میرے فرض کردہ امور کے سوا کسی اور چیز کے ذریعے میرے زیادہ قریب نہیں آ سکتا۔ میرا بندہ نوافل (نفلی عبادات) کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں' اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے' اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں۔''

معزز سامعین کرام!

اربعین نووی کی حدیث ۳۸ آج ہمارے زیر مطالعہ ہے اور یہ حدیث تصوف کے موضوع پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں جو مضامین ''تصوف'' کے عنوان سے بیان ہوتے ہیں' ان کا ایک بہترین بیان زیر مطالعہ حدیث قدسی میں ہے۔ البتہ یہ یاد رکھیے کہ قرآن وحدیث میں کہیں بھی تصوف کا لفظ نہیں آیا اور یہ بعد کی اصطلاح ہے جس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس لفظ کا ماخذ (origin) کیا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ''صوف'' (بمعنی اون) سے بنا ہے۔ تابعین کے زمانے میں جو ابتدائی صوفی تھے وہ اونی کپڑے پہنا کرتے تھے' تاکہ اون ان کے جسم کو تکلیف پہنچاتی رہے۔ بنیان وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اون جسم کے لیے باعث راحت نہیں ہوتی بلکہ وہ تو جسم کو کاٹتی رہتی ہے — اون کو عربی میں صوف کہتے ہیں تو صوف سے صوفی اور پھر اسی سے تصوف بن گیا۔ بہرحال تصوف کے ماخذ کے حوالے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

سے مختلف آراء ہیں‘ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ البتہ حدیث میں اس کے لیے لفظ ’’احسان‘‘ آیا ہے اور ہم ’’حدیثِ جبریل‘‘ کے مطالعے میں اس کے بارے میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ درحقیقت وہی مضمون زیرمطالعہ حدیث میں ذرا مختلف انداز میں آ رہا ہے۔ اس ضمن میں‘ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ زیرمطالعہ حدیث میں بعض نہایت ’’خطرناک‘‘ مضامین بھی آئے ہیں۔ خطرناک اس اعتبار سے کہ بہت باریک اور حساس ہیں اور ان کے ضمن میں گمراہی میں مبتلا ہونے کا امکان موجود ہے‘ لہٰذا اس پہلو سے بہت ہی محتاط رہ کر بات کرنی پڑے گی۔

ولی کون ہوتا ہے؟

زیرمطالعہ حدیث کے دو حصے ہیں اور پہلا حصہ قدرے مختصر ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) ’’جس شخص نے میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی رکھی تو اس کے خلاف میری جانب سے اعلانِ جنگ ہے‘‘۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ولی کسے کہتے ہیں اور اللہ کے ولی کون ہیں۔ اس کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں مختلف تصورات ہیں۔ عمومی تصور یہی ہے کہ ولی وہ ہوتا ہے جس سے کچھ خارقِ عادت باتیں ظاہر ہو جائیں‘ کرامات ظاہر ہوں‘ جو غیب کی کچھ باتیں بھی بتا دے اور کچھ مستقبل کی بھی۔ مزید یہ کہ اس کی زندگی میں شریعت کی پیروی بھی موجود ہو اور نظر بھی آ رہی ہو‘ یعنی اس کا لباس اور اس کی وضع قطع سنت کے بہت قریب ہو۔ ولی کے حوالے سے یہ تصورات ہمارے ذہنوں میں ہیں‘ جو غلط نہیں ہیں‘ لیکن سب سے پہلے گہرائی میں سمجھئے کہ ولی ہوتا کون ہے۔

اس سے بھی پہلے یہ بنیادی بات جان لیجیے کہ ولایت کا رشتہ یک طرفہ نہیں‘ دوطرفہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا ولی ہے اور اہلِ ایمان اللہ کے ولی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان سے محبت کرتا ہے اور اہلِ ایمان اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ تو یہ دوطرفہ معاملہ ہے۔ اب آتے ہیں اصل سوال کی طرف کہ ولی کون ہوتا ہے۔

ولی اور ولایت کو سمجھنے کے لیے میں نے ابتدا میں دو آیات تلاوت کی ہیں۔ ایک سورۃ البقرۃ میں آیت الکرسی کے فوراً بعد کی آیت ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا......﴾ ''اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا ولی ہے......'' دوست' ساتھی' مددگار' پشت پناہ' یہ سارے الفاظ جمع کر لیں' لفظ ولی ان سب پر محیط ہے۔ اللہ اہل ایمان کا ولی ہے اور اس کا ظہور یوں ہوتا ہے: ﴿یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ﴾ (آیت ۲۵۷) ''وہ نکالتا رہتا ہے اہل ایمان کو تاریکیوں سے نور کی طرف''۔ تاریکیوں سے نور کی طرف آنا ایک تدریجی (gradual) عمل ہے۔ اس کا آغاز تو اسی وقت ہو جائے گا جب کوئی شخص زبان سے کلمہ شہادت (اَشۡہَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡكَ لَہٗ وَاَشۡہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ) ادا کرے گا۔ یہاں سے وہ رشتہ شروع ہو گیا اور پھر اس رشتے میں ترقی ہوتی ہے اور یہ تدریجاً آگے بڑھتا ہے۔ ایمان لانے کے بعد انسان کفر اور شرک کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان کے نور میں آ گیا' لیکن اس کے بعد ابھی اور بہت سے پردے ہیں جنہیں چاک کرنا ہو گا' جن میں سے نکلنا ہو گا۔ اور پھر جیسے جیسے یہ تاریکیاں چھٹتی جائیں گی تو اس نور کے اندر اضافہ ہوتا جائے گا۔

یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی آیا ہے کہ قیامت کے دن اہلِ ایمان کا نور ان کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہو گا اور وہ اللہ ربّ العزت سے دعا کریں گے: ﴿رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۸﴾﴾ ''اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کر دے اور تو ہمیں بخش دے' یقیناً تو ہر شے پر قادر ہے''۔ اِتمامِ نور کی دعا کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں سب لوگ ایمان میں برابر نہیں تھے۔ ایک ایمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا اور ایک عام صحابی کا تھا اور ایک ہم میں سے کسی کا ہے تو ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر اسی نسبت و تناسب (ratio proportion) سے میدانِ حشر میں نور ملے گا۔ اُس وقت وہاں اور کوئی نور نہیں ہو گا' بلکہ گھپ اندھیرا ہو گا اور اسی اندھیرے میں پل صراط پر سے گزرنا ہو گا جس کے نیچے جہنم ہے۔ ذرا ٹھوکر کھائی اور گئے جہنم میں۔ اس کا نقشہ سورۃ الحدید میں کھینچا گیا ہے کہ اہل ایمان تو پل صراط سے

گزر جائیں گے‘ اس لیے کہ ان کے پاس نور ہو گا‘ ان کے سامنے بھی اور داہنی طرف بھی۔ سامنے تو ایمان کا نور ہو گا‘ جبکہ داہنی طرف اعمالِ صالحہ کا نور ہو گا۔ جبکہ منافقوں کے پاس کوئی نور نہیں ہو گا۔ دنیا میں چونکہ وہ اہل ایمان کے ساتھ رہتے تھے تو وہاں وہ اہل ایمان سے کہیں گے: ﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (آیت ۱۳) ”ذرا ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھالیں۔“

اس نور کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ کسی کے پاس اتنا نور ہو گا کہ مدینہ منورہ سے صنعاء تک اس کی روشنی چلی جائے گی اور کسی کا نور بس اتنا ہو گا کہ جس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی۔ ایسا شخص بھی اُس دن بہت خوش قسمت ہو گا‘ اس لیے کہ جنگل میں چلتے ہوئے اگر کسی کے ہاتھ میں ٹارچ بھی ہو جس کی روشنی بہت دور تک تو نہیں جا سکتی‘ لیکن قدموں کے آگے تو نظر آ جاتا ہے کہ کوئی گڑھا تو نہیں‘ کوئی سانپ تو نہیں بیٹھا ہوا۔ چنانچہ اتنا نور بھی غنیمت اور بڑی نعمت شمار ہو گا۔ اس کا دوسرا پہلو سورۃ التحریم کی زیر مطالعہ آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جن کے پاس نور کم ہو گا تو وہ اللہ سے دعا کریں گے کہ پروردگار! ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہمارا نور مدھم ہے‘ پس تو ہمیں بخش دے اور ہماری مغفرت فرما دے اور ہمارے نور کی تکمیل کر دے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں بتایا گیا کہ اللہ اپنے ولیوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا رہتا ہے۔

دوسری آیت جو میں نے ابتدا میں تلاوت کی‘ یہ سورۂ یونس کی آیت ہے جو بہت عام ہے اور اکثر وعظوں‘ تقریروں اور عوامی جلسوں میں پڑھی جاتی ہے۔ اس آیت میں اولیاء اللہ کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ”آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے“۔ اگلی آیت میں اولیاء اللہ کی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے: ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ ”وہ لوگ جو صاحب ایمان ہوں اور تقویٰ کی روش اختیار کریں“۔ ﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ ”ان کے لیے بشارتیں

ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی''۔﴿لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؀﴾''اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی تو ہے بہت بڑی کامیابی۔''

ایمان اور تقویٰ کے مراحل

ان آیات میں واضح کر دیا گیا کہ اللہ کا ولی وہ ہے جو ایمانِ حقیقی سے بہرہ مند ہو اور تقویٰ کی روش اختیار کیے ہوئے ہو۔ اب ایمان کے مختلف مراحل ہیں۔ ایمان کا پہلا قدم تو شہادت یعنی زبانی گواہی ہے اور اس کا دوسرا قدم ہے دل میں یقین کا پیدا ہو جانا۔ سورۃ الحجرات کی یہ آیت میرے بیان میں بہت مرتبہ آئی ہے:﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۴)''یہ بدّو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں اور ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔ یہ بدو دعویٰ تو ایمان کا کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ اسلام لائے ہیں' ایمان ابھی نہیں لائے اور یہ اپنے ایمان کے دعوے میں تب سچے ہوں گے جب ان کے دل کے اندر یقین پیدا ہو جائے گا۔ دل میں یقین کا پیدا ہو جانا ایمان کا دوسرا قدم ہے اور پھر اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس یقین کی پختگی اتنی ہو جائے کہ جیسے اپنی آنکھوں سے کسی چیز کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے' جسے عین الیقین کہا جاتا ہے۔ یہ یقین کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اور یہی ''احسان'' ہے کہ یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں یا یہ یقین تو کم سے کم ہو جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہوں۔ چنانچہ ایمان کے تین درجے ہو گئے۔ درجہ اول زبانی گواہی' درجہ دوم یقین قلبی اور درجہ سوم عین الیقین' اور اسی کا نام احسان ہے اور یہی تصوف کی منزل ہے کہ یقین اس درجے میں ہو جانا گویا انسان اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم سے کم ہر وقت یہ استحضار رہے کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں۔

اسی طرح تقویٰ کے بھی مختلف مراحل ہیں۔ شراب کی حرمت کے ضمن میں آنے

والی آخری آیات یعنی سورۃ المائدۃ کی آیات ۹۰'۹۱'۹۲ میں جب شراب کے بارے میں آخری حکم آیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تشویش لاحق ہوگئی کہ شراب نجس چیز تھی اور ہمیں تو پیتے ہوئے عمریں بیت گئی ہیں۔ شراب عرب کے کلچر کا جزوِ لازم تھی' جیسے آج مغرب کی تہذیب میں جزوِ لازم ہے اور شراب کے بغیر کسی کھانے کا تصور نہیں ہے' تو شراب پیتے سالہا سال ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب لوگوں میں تشویش پیدا ہوئی تو ان کی تسلی کے لیے فرمایا گیا: ﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا﴾ ''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جو وہ (پہلے) کھا پی چکے''۔ یعنی اس آخری حکم کے آنے سے پہلے جو کچھ کھایا پیا وہ اب معاف' لیکن اس کی چند شرائط بھی ساتھ ہی بیان ہوئیں۔ وہ یہ ہیں کہ: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''جب تک وہ تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں'' ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾ ''پھر مزید تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں'' ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا﴾ ''پھر اور تقویٰ میں بڑھیں اور درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں''۔ ﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴿۹۳﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ محسنوں سے محبت کرتا ہے''۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کے بھی تین درجات ہیں۔ گویا ایمان اور تقویٰ دونوں کے تین تین مراحل ہوئے۔

ایمان کے ظاہری اور باطنی ثمرات

اب میں تھوڑا سا تجزیہ کر کے آپ کو بتا دوں کہ ایمان کے ثمرات کیا ہیں اور ایمان کا ظہور کن شکلوں میں ہوتا ہے۔ ایک تو ایمان کے خارجی ثمرات ہیں اور ایک باطنی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آم کا درخت ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس میں آم ہی لگیں گے' لیکن ایمان ایک ایسا درخت ہے جس میں دو طرح کے پھل لگتے ہیں۔ ایک ظاہری جو نظر آتے ہیں اور ایک باطنی جو نظر نہیں آتے۔ پہلے ظاہری پھل کی بات کرتے ہیں۔

(۱) سمع و طاعت: پہلا ظاہری پھل ہے۔ یعنی اللہ اور رسول ﷺ کو مانا ہے تو اب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کلی اطاعت بھی کرو۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر یہ حکم آیا ہے:

﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''سنو اور اطاعت کرو۔''

(۲) جہاد فی سبیل اللہ: دوسرا ظاہری پھل ''جہاد فی سبیل اللہ'' یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ آگے جہاد کے دو کھاتے ہو جائیں گے: (۱) دعوت یعنی اللہ کے پیغام کو دنیا تک پہنچانا۔ (۲) اقامت یعنی اللہ کے دین کو قائم کرنا' نظامِ الٰہی کو غالب کرنا' اس جدوجہد میں تن من دھن لگانا' مال اور اپنے جسم و جان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو اس میں صرف کرنا۔ اب یہ چیزیں خارجی ہیں جو نظر آتی ہیں۔ کسی شخص میں اطاعت ہے یا نہیں' نظر آ جائے گا۔ نماز پڑھتا ہے یا نہیں پڑھتا' روزہ رکھتا ہے یا نہیں رکھتا' حلال و حرام پر کاربند ہے یا نہیں ہے' تو یہ سب نظر آ جائے گا۔ اسی طرح جہاد کر رہا ہے' دعوت دے رہا ہے' تبلیغ کر رہا ہے' قرآن پڑھ رہا ہے' پڑھا رہا ہے' سکھا رہا ہے' پھیلا رہا ہے' پہنچا رہا ہے' اور ایک جماعتی نظم اور ڈسپلن کے ساتھ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدّوجُہد میں لگا ہوا ہے تو یہ سب ایمان کے خارجی یا ظاہری ثمرات ہیں۔

(۳) تسلیم ورضا: ان کے علاوہ ایمان کے بعض باطنی ثمرات بھی ہیں اور ان میں سب سے پہلی چیز ہے: ''تسلیم ورضا'' یعنی جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے آئے بغیر کسی شکوے اور شکایت سے قبول کرو: ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (التغابن: ۱۱) ''جو مصیبت بھی تم پر آئی ہے وہ اللہ کے اذن کے بغیر نہیں آئی ہے''۔ اللہ نے منظوری دی ہے تو یہ دکھ تمہیں پہنچا ہے۔ ابوجہل لاکھ کوشش کے باوجود کسی صحابی کو نہیں مار سکتا تھا اور نہ وہ حضرات سمیہ اور یاسر رضی اللہ عنہما کو شہید کر سکتا تھا اگر اللہ کی طرف سے اجازت نہ ہوتی۔ اگر اذنِ رب نہ ہوتا تو اس کا ہاتھ ہی شل ہو جاتا اور کوڑا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا ہی نہ سکتا۔ چنانچہ اللہ کی جانب سے جو بھی آئے اسے من جانب اللہ سمجھ کر صبر و استقامت سے قبول کرو اور اللہ کی تقدیر پر راضی ہو جاؤ۔ اس کو کہتے ہیں: ''راضی برضائے رب''۔ اس کے بڑے اونچے اونچے مقامات ہیں' جو اِس وقت بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ؎

رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا؟
خدا خالق' خدا مالک' خدا کا حکم' تو کیسا؟

یعنی تم ہوتے کون ہو کہ تم اللہ کو کوئی مشورہ دے سکو۔ یہ اکبر الہ آبادی کا بڑا عارفانہ شعر ہے۔ اگرچہ مشہور تو وہ مزاحیہ شاعری کے لیے ہیں' لیکن ان کے بہت سے صوفیانہ اشعار بھی ہیں اور یہ شعر بھی بہت کمال کا ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی!

یعنی جو تیرا فیصلہ ہے وہ دل سے قبول ہے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے' ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!''

(۴) تفویض الامر الی اللہ: اسی کا ایک حصہ تفویض الامر ہے یعنی اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کر دینا۔ یہ بھی ایک ذہنی اور اندر کی نفسیاتی کیفیت ہے: ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ (المؤمن) ''اور میں تو اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ اللہ یقیناً اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے''۔ میں کاہے کو چنتا کروں' کاہے کو تشویش میں مبتلا ہو جاؤں۔ میرا رب میری تمام ضروریات کو جانتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ایمان کے درجات میں انسان ترقی کرتے کرتے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں دعا بھی محدود ہو جاتی ہے۔ دعا صرف یہ رہ جاتی ہے کہ اے اللہ میری ہدایت میں اور اضافہ کر! اے اللہ میرے علم میں اور اضافہ کر! اے اللہ مجھے اپنے ایمان پر استقامت عطا فرما! باقی یہ دعا کہ اے اللہ مجھے یہ دے دے' یہ دے دے! اس سے بندۂ مؤمن مستغنی ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم اللہ کو سکھا رہے ہو' اللہ کو پڑھا رہے ہو۔ تمہیں کیا پتا یہ شے تمہارے حق میں ٹھیک بھی ہے یا نہیں: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرۃ) ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے''۔ چنانچہ اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دو' کیونکہ وہ بہتر جاننے والا ہے۔

تفویض الامر ایمان کا باطنی ثمر ہے اور اس کے لیے ایک بہت پیارا شعر ہے:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

میرا کارساز خود میرے معاملے کی فکر کر رہا ہے تو مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے۔ جب میں اپنے معاملات میں خود غور وفکر کر کے نتیجہ نکالتا ہوں تو وہ اُلٹا پڑتا ہے اور میرے لیے باعث تکلیف ہو جاتا ہے۔ تو اس کا حل یہی ہے کہ میں اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دوں ــــ ہم پچھلی حدیث میں پڑھ چکے ہیں' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ اپنے کسی بھائی کے کام میں لگا ہو تو میں اس کے کام میں لگ جاتا ہوں۔ چنانچہ آپ اللہ کے کام میں لگ جائیے' اللہ کے دین کے لیے تن من دھن لگا دیجیے تو اللہ آپ کے سارے کام پورے کرے گا۔

(۵) توکّل علی اللہ: ایمان کے باطنی ثمرات میں سے ایک توکّل علی اللہ ہے' یعنی کسی مادی ذریعے اور سبب پر کوئی اعتماد اور توکل نہ رہے' سوائے اللہ کے جو مسبّب الاسباب ہے۔ حضور ﷺ سے بھی فرمایا گیا تھا: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکھف) ''اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کل ضرور کر دوں گا' مگر یہ کہ اللہ چاہے!'' کسی بھی کام کے ارادے کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا چاہیے' یعنی اگر اللہ نے چاہا تو میں یہ کام کروں گا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ کل صبح میرا فلاں جگہ جانے کا ارادہ ہے اور میں نے گاڑی بھی تیار کر رکھی ہے' اس کی سروس بھی ہو گئی ہے' ٹیوننگ بھی ہو گئی ہے' پٹرول کی ٹینکی بھی بھری ہوئی ہے' بس صبح اٹھوں گا اور چل دوں گا۔ گویا وہ بھول گیا کہ اس کے ارادے اور بالفعل کام کے ہونے کے درمیان بھی بہت سے مراحل ہیں۔ جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے:

There is many a slip between the cup and the lip.

اہلِ مکّہ نے یہودیوں کے سکھانے پر رسول اللہ ﷺ سے تین سوال کیے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کا جواب میں کل دے دوں گا۔ اس موقع پر آپؐ نے سہواً ''ان شاء اللہ'' نہیں فرمایا۔ آپؐ کے ذہن میں تھا کہ جبریل علیہ السلام روزانہ تو آتے ہیں' ان سے پوچھ لوں گا

اور جواب دے دوں گا' مگر وہ نہیں آئے تو صورتِ حال یہ بنی کہ تالیاں پٹ رہی ہیں' طنزیہ باتیں ہو رہی ہیں' طعنے دیے جا رہے ہیں کہ کہاں ہے جواب؟ غالباً تین دن کے بعد جبرائیلؑ جوابات لے کر آئے' لیکن ساتھ ہی یہ آیت بھی نازل ہوئی: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ﴾ کہ آئندہ کسی چیز کے لیے کبھی نہ کہیے گا کہ میں کل ضرور کر دوں گا مگر ساتھ ان شاء اللہ بھی کہیں۔ چنانچہ اعتماد اور بھروسہ نہ اپنی قوت وصلاحیت اور ذہانت وفطانت پر ہو' نہ مادی اسباب ووسائل پر' بلکہ اللہ عزوجل پر ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مادی ذرائع اور وسائل استعمال نہ کیے جائیں' بلکہ بھرپور طور پر استعمال کرو۔ بیمار پڑ جاؤ تو لازماً علاج کراؤ' یہ سنت ہے' لیکن یہ نہ سمجھو کہ اس علاج سے شفا ہوگی' بلکہ یہ عقیدہ رکھو کہ شفا اللہ تعالیٰ دے گا۔ مجھے اپنے بچپن کے حالات یاد ہیں۔ اب تو ہمارا کلچر بہت تبدیل ہو چکا ہے' جبکہ ہماری بڑی بوڑھی عورتیں بچوں کو دوائی پلاتے ہوئے کہتی تھیں: ''اللہ شافی' اللہ کافی!'' کہ شافی تو اللہ ہے اور وہی کافی ہے۔ بہرحال علاج کرانا سنت ہے' لیکن اس حد تک چلے جانا کہ لاکھوں روپے خرچ کر کے علاج کے لیے انگلستان جا رہے ہیں' یہ رویہ بھی صحیح نہیں ہے' بلکہ مناسب یہ ہے کہ اپنے ذرائع میں رہتے ہوئے آپ ایک حد تک علاج کرائیے اور ساتھ یہ یاد رکھیے کہ شفا تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ گویا اللہ شافی' اللہ کافی!

<u>(٦) اللہ اور رسولؐ سے محبّت</u>: اسی میں اب تین چیزیں اور شامل کر لیجیے' جن میں سب سے پہلی چیز محبت ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:١٦٥) ''اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے''۔ یعنی اللہ کے ساتھ شدید ترین محبت ہو' اور پھر اس محبت میں رسول کو بھی بریکٹ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾ (التوبۃ:٢٤)

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)' تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔''

لہٰذا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی شدید ترین محبت دل میں موجود ہو اور پھر اس محبت میں اللہ کے لیے جہاد کی محبت بھی شامل ہونی چاہیے۔

(۷) محبت کے ساتھ حمیت: یاد رکھیے کہ یہ محبت صرف حمد کے ترانوں اور نعت کے لہک لہک کے پڑھنے میں نہیں ہے۔ اس محبت کے ساتھ دوسرا پہلو حمیت بھی ہوتا ہے کہ اللہ کا دین پامال ہے اور میں اپنے دھندوں میں لگا ہوا ہوں تو وہ حمیت کہاں گئی' ع ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے''۔ اسی بارے میں وہ حدیث آتی ہے جسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَ اِلٰى جِبْرِيْلَ عليه السلام اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا ' قَالَ :يَا رَبِّ اِنَّ فِيهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ ' قَالَ: فَقَالَ: اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ' فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی کے ذریعے سے حکم دیا کہ فلاں فلاں شہروں کو اس کے رہنے والوں پر الٹ دو (تلپٹ کر دو' جیسے کہ سدوم اور عامورہ کی بستیوں کے ساتھ کیا گیا' جہاں حضرت لوط علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا)۔ اس پر جبرائیلؑ نے عرض کیا: اے رب! ان لوگوں میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں اس پر اللہ نے فرمایا: الٹو اس بستی کو پہلے اس (بدبخت) پر' پھر دوسروں پر' اس لیے کہ (وہ اتنا بے غیرت اور بے حمیت انسان ہے کہ) میری وجہ سے کبھی اس کے چہرے کی رنگت تک نہیں بدلی۔''

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان

یعنی میرے احکام کی دھجیاں بکھرتی رہیں‘ میری حدود پامال ہوتی رہیں اور یہ اللہ اللہ کرتا رہا‘ اپنے مراقبے‘ اپنے چلے اور اپنے اذکار میں لگا رہا۔ اسی کے لیے تو اقبال نے کہا تھا ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

(۸) محبت اور حمیت کے ساتھ نصرت بھی: محبت اور حمیت کے علاوہ تیسری چیز نصرت ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصف: ۱۴) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بنو''۔ اللہ (معاذ اللہ!) ضعیف نہیں ہے کہ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہو‘ وہ تو القوی ہے‘ لیکن تمہارا امتحان ہے کہ اس کا دین جب پامال ہے تو اسے قائم کرنے کے لیے تن من دھن لگاتے ہو کہ نہیں؟ دین کو قائم اور غالب کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے‘ لیکن اس جدوجہد میں تَن مَن دَھن لگا دینا تو ہمارے بس میں ہے نا! تو بس یہی کامیابی ہے۔ دیکھئے‘ کتنے ہی نبی آئے اور چلے گئے کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی‘ کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ اُن کی شب و روز کی اَن تھک محنت کے باوجود صرف چند لوگوں نے مانا اور باقی سب ہلاک کر دیے گئے۔ انقلاب تو آیا ہے جا کر حضور اکرم ﷺ کے دست مبارک سے اور آپؐ کے دورِ مبارک میں اللہ کا نظام صحیح معنوں میں غالب ہوا ہے: ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''اور آپؐ کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی بھاگ جانے والا''۔ یہ حضور ﷺ کی تکمیلِ رسالت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اب اللہ کے دین کو غالب کرنے میں تَن مَن دَھن لگانا‘ اللہ کی نصرت کے مترادف ہے‘ جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

اللہ کے ولی سے عداوت‘ براہِ راست اللہ سے جنگ ہے!

مندرجہ بالا گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ ولی وہ ہے جو ایمان اور تقویٰ کے تمام مراحل طے کر چکا ہو۔ اب ایسے ولی کے خلاف جو بھی بغض رکھے گا‘ عداوت رکھے گا‘ دشمنی کرے گا تو اللہ کی طرف سے اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ حدیث کے الفاظ ہم پڑھ چکے

ہیں: ((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) ''جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت رکھے تو میرا اُس سے اعلانِ جنگ ہے''۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تو مروّت اور شرافت کا تقاضا ہے۔ اگر ایک شخص اللہ کی حمایت میں لگا ہوا ہے تو اس کے دشمن اللہ کے دشمن ہو گئے' لہٰذا اللہ کے اولیاء سے عداوت رکھنے والے براہِ راست اللہ سے جنگ مول لے رہے ہیں' اگرچہ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ آنِ واحد میں سارے کے سارے دشمن ختم کر دیے جائیں۔ مکہ میں بھی یہ نہیں ہوا کہ ابوجہل نے جیسے ہی حضور ﷺ پر زیادتیاں شروع کیں تو فوراً ختم کر دیا گیا۔ نہیں' اللہ کی اپنی سنت ہے اور وہ اہل ایمان کو بھی پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے' امتحانات میں ڈالتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ امتحان کافروں کے ہاتھوں ہی آئیں گے۔ اگر کافر اوّل دن سے ختم ہو جاتے تو امتحان کس کے ذریعے سے آتا' آزمائش کس کے ہاتھوں آتی؟ پھر آزمائش سے ہی پتا چلتا ہے کہ کون کتنا کھرا ہے اور کون کتنا کھوٹا ہے۔ قرآن نے خود بتایا ہے: ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝﴾ ''کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا؟'' ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''ہم نے تو ان کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے تھے'' ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت) ''پس اللہ ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جو سچے ہیں اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں''۔ گویا اللہ دودھ کا دودھ' پانی کا پانی علیحدہ کر دے گا کہ یہ ہیں سچے جنہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا' عہد نبھایا' اور یہ ہیں جھوٹے جنہوں نے اپنے وعدوں کی وفا نہیں کی۔ چنانچہ یہ بات فطری ہے کہ جو اللہ کے ولی سے دشمنی مول لے گا تو وہ اللہ کا بھی دشمن شمار ہو گا۔

تقربِ الٰہی کے ذرائع

یہ تو زیر مطالعہ حدیث کا پہلا حصہ تھا' اب اس کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جس میں ایک عظیم مسئلہ سامنے آ رہا ہے جس کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس حدیث میں تقرب الی اللہ کے دو مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے اس حصہ پر ایک سرسری نظر

ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُہٗ عَلَیْہِ)) ''میرا بندہ میرے فرض کردہ امور کے سوا کسی اور چیز کے ذریعے میرے زیادہ قریب نہیں آ سکتا''۔ 'تقرب' باب تفعّل ہے' چنانچہ اس کا معنی ہوگا کہ اَن تھک محنت اور مسلسل جدّوجہد کے ساتھ کوئی چیز حاصل کرنا۔ ترجمہ یہ ہوگا کہ میرا بندہ جن چیزوں کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے' اُن میں مجھے محبوب ترین وہ ہیں جو میں نے اس پر فرض کی ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ: ((وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ)) ''اور بسا اوقات میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں'' ((فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ)) ''پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے''۔ اب یہ بہت نازک اور حساس موضوعات ہیں' لہٰذا انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے ؎ ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!'' یعنی اس راستے پر خبردار ہو کر چلنا کہ اب تمہارا پاؤں تلوار کی دھار پر آ گیا ہے! آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
((وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ)) ''اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے''
((وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا)) ''اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے''
((وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا)) ''اور اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔''
اللہ اکبر! ان سب کا کیا مطلب ہے اور ان سب کو کون سمجھے گا کہ اللہ بندے کے کان' آنکھ' ہاتھ' حتیٰ کہ پاؤں بن جاتا ہے؟ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس کے مطالب و مفاہیم سے جو اہم نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیثِ کرامت اولیاء کے لیے سند ہے۔

اللہ ہماری رگِ جاں سے زیادہ قریب ہے!

اس ضمن میں پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اللہ سے تقرب کے معنی کیا ہیں؟ کیا اللہ کہیں دور ہے؟ نہیں' وہ تو رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ سورۂ قٓ کی یہ آیت ابتدا میں' میں نے آپ کو سنائی تھی:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ

حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴿١٦﴾

''ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس اندر سے کیا وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اور ہم اس کے قریب تر ہیں اس کی رگِ جاں سے بھی۔''

یعنی اس کا نفسِ امارہ ہم ہی نے بنایا ہے اور ساری مادی خواہشات اور سارے جبلی تقاضے (animal instincts) ہم ہی نے نفس کے اندر رکھے ہیں کیا ہمیں ہی نہیں معلوم ہے؟ کیا گھڑی ساز کو نہیں پتا کہ گھڑی میں کون کون سے پرزے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تو ہم سے بہت قریب ہے ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن غور طلب بات یہ کہ ہم اللہ سے دور ہیں۔ بہت پیارے اشعار ہیں:

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی؟
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نہ یابی!

''کیا ڈھونڈتے ہو؟ کیوں (ہر وقت) پیچ وتاب میں رہتے ہو۔ کہ (جس کی تلاش ہے) وہ تو (ذرّے ذرّے سے) عیاں ہے اور تو خود ہی پردے میں (محجوب) ہے۔ (اگر) اس کو تلاش کرے گا تو اپنے سوا کچھ نہ دیکھے گا (اور اگر) اپنی تلاش کرے گا تو اس کے سوا کوئی اور نہ ملے گا۔''

یعنی گھنے جنگلوں غاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر کسے ڈھونڈ رہے ہو؟ یہ پیچ وتاب تمہارے اندر کیا ہے اور تم ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں فلسفہ اور عقل کے گھوڑے کیوں دوڑا رہے ہو؟ وہ تو سامنے ہے مگر تمہاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے زیرِ نقاب تو تم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ علی بن عثمان جلابی ہجویری ثم لاہوری رحمہ اللہ کی کتاب جو تصوف کی اولین اور امہات الکتب میں سے ہے اس کا نام ہی: ''**کشف المحجوب**'' ہے یعنی حجابات اور پردوں کا ہٹ جانا۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ حجاب میں تو ہم آئے ہوئے ہیں جبکہ وہ تو ہر جگہ ہے۔ قرآن نے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ﴾ (الحدید: ٤) ''تم جہاں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔''

ان الفاظ کی ایک تاویل یہ کی گئی کہ وہ صفاتی طور پر ہر جگہ موجود ہے اور ہماری ہر بات کو سن رہا ہے اور ہمارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ تاویل ان الفاظ کا حق ادا نہیں کر رہی۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے' لیکن وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ' ہر آن موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے' یہ ہماری مجبوری ہے۔ اللہ دیکھتا ہے' لیکن کیسے دیکھتا ہے یہ ہم نہیں جانتے۔ اُس کا دیکھنا اس خارجی نور کا محتاج نہیں جس کے ہم محتاج ہیں۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ وہ سنتا ہے' لیکن کیسے سنتا ہے یہ ہم نہیں جانتے۔ وہ ہمارے ساتھ ہے' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن کیسے ہے' یہ ہم نہیں جانتے۔

تقرّب کا صحیح مفہوم

تقرّب کا اصل مفہوم ہے اللہ کی طرف باطنی طور پر بڑھنا —— اور بڑھنے کے لیے بھی کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے' وہ آپ کے اندر ہی ہے۔ میں نے آپ کو عبدالقادر دہلویؒ کا شعر سنایا تھا:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن در آ!

یعنی بڑے ستم کی بات ہے کہ تمہاری خواہش نفس تمہیں کہے کہ چلو بھئی ذرا باغ میں جا کر دیکھو کہ کتنے اچھے اچھے پھول ہیں' کتنا اچھا سبزہ ہے۔ ارے تم خود کسی غنچہ سے کم دمکتے ہوئے نہیں ہو' تم تو اللہ کی تخلیق کا ذروۂ سنام ہو۔ ذرا کبھی اپنے دل کے دروازے کھولو اور اپنے اندر کے باغ میں داخل ہو کر اس کی سیر کرو۔ ع ''اپنے مَن میں جا کر پا جا سراغ زندگی!'' اللہ کہیں دُور نہیں ہے' وہ تو تمہارے اندر ہی ہے' لیکن تم ہی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو۔ تمہاری ساری توجہ دنیا کی طرف ہے' تمہاری ساری بھاگ دوڑ' تمہاری ساری سوچ بچار دنیا کے لیے ہے اور تم اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے: ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہ روِ منزل ہی نہیں!

حدیث میں آتا ہے کہ رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک اتر آتا ہے۔ کیسے اُتر آتا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ قیامت کے دن اللہ اس زمین پر نزول فرمائے گا: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴿۲۲﴾﴾ (الفجر) ''اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا جب کہ فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے''۔ میدانِ قیامت اسی زمین پر ہوگا' گویا قصۂ زمین' برسرِ زمین طے ہوگا۔ سورۃ الحاقہ میں نزولِ رب کی منظرکشی بایں الفاظ کی گئی ہے: ﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ﴿۱۷﴾﴾ ''اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر' اور اس دن آپ کے ربّ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے''۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے جلو میں نزول فرمائے گا' پھر عدالت خداوندی لگے گی' حساب کتاب ہوگا۔ یہ سب ہوگا' لیکن کیسے ہوگا یہ ہم نہیں جانتے۔

اس اعتبار سے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم اپنے باطن میں جھانکیں' جہاں دل ہے اور دل کی گہرائیوں میں روح ہے جس کا تعلق براہِ راست اللہ کی ذات کے ساتھ ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اُس روح کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں ہے' ہماری ساری توجہ جسد مادی' اس کے تقاضوں اور اس کی ضروریات کی طرف ہے اور ہم اسی میں مصروف ہیں' جبکہ روح کی طرف متوجہ ہو کر انسان اُس ذات کا تقرب حاصل کر سکتا ہے' جس کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) ''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے''۔ ظاہر ہستی تو اسی کی ہے اور ہاں سب سے مخفی بھی وہی ہے' اس لیے کہ اُس کی ذات کی کُنہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ کیسے دیکھتا ہے' تم نہیں جان سکتے۔ اس کا ہاتھ ہے' لیکن تم اسے اپنے ہاتھ پر قیاس نہ کر بیٹھنا۔ اسی طرح میدانِ محشر میں اللہ تعالیٰ کی تجلّی کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (القلم:۴۲) ''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی''۔ لیکن اس کا مفہوم ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ اگر ہم اس کی کھوج کرید میں پڑ جائیں اور اس بارے میں بحث کریں تو ہم گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اب تک کی میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں قرب سے مراد قربِ مکانی نہیں'

قربِ معنوی ہے۔ سورۃ العلق کی آخری آیت میں نے شروع میں پڑھی تھی: ﴿کَلَّا ؕ لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ﴿۱۹﴾﴾ ''کوئی بات نہیں! (اے نبی ﷺ) آپ اس کی بات نہ مانیے' آپ سجدہ کیجیے اور (اللہ سے اور) قریب ہو جائیے!'' اس میں رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپؐ ابوجہل وغیرہ کی باتیں نہ مانیے' آپ توجہ ہی نہ دیجیے ان کی باتوں پر اور دفع کیجیے ان کو' آپ بس سجدہ کیجیے اور قریب ہو جائیے۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے: ((اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ))[1] ''سجدے کی حالت میں بندہ اللہ سے قریب ترین ہوتا ہے!'' اب ایک سجدہ ظاہری ہے کہ جسم تو جھک گیا ہے لیکن نفسِ امارہ جوں کا توں شیطانِ لعین کی طرح کھڑا ہے کہ میں سجدہ نہیں کروں گا۔ اس طرح یہ سجدہ تو تمہارے اعضاء و جوارح کا سجدہ ہے' دل کا سجدہ نہیں ہے۔ لیکن جب پوری ہستی کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدہ کرو گے تو یہ اللہ کے ساتھ قریب ترین معاملہ ہو گا۔

مشرکین کا غیر اللہ کو پکارنے کا مقصد: قربِ الٰہی

قربِ الٰہی کے ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت بڑی اہم ہے:

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الۡوَسِیۡلَةَ اَیُّهُمۡ اَقۡرَبُ وَیَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَهٗ وَیَخَافُوۡنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحۡذُوۡرًا﴿۵۷﴾﴾

''وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے قرب کے متلاشی ہیں کہ ان میں سے کون (اُس کے) زیادہ قریب ہے اور وہ امیدوار ہیں اُس کی رحمت کے اور ڈرتے رہتے ہیں اُس کے عذاب سے۔ واقعتاً آپؐ کے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔''

یعنی جنہیں یہ پکار رہے ہیں' ان سے دعائیں کر رہے ہیں' وہ تو خود قربِ الٰہی کی منزلیں طے کر رہے ہیں اور اللہ کی رحمت کے امیدوار بھی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ چاہے وہ انبیاء و رسل ہوں' یا اولیاء اللہ یا فرشتے' وہ تو عالمِ امر میں خود اللہ کی رضا جوئی کے لیے کوشاں اور اس کے قرب کے متلاشی ہیں۔

اس حوالے سے آخری آیت میں سورۃ الزمر کی بیان کر رہا ہوں۔ یہاں مشرکین کا

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب ما یقال فی الرکوع والسجود۔

قول نقل ہوا ہے کہ وہ غیر اللہ کو پوج رہے ہیں تو اس سے مقصود اللہ ہی کا قرب حاصل کرنا ہے:
﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ﴾ (آیت۲) ''ہم ان کو نہیں پوجتے مگر صرف اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب تر کرتے ہیں''۔یعنی ان کے نزدیک جن کو وہ پکار رہے تھے' دعائیں کر رہے تھے وہ ان کے لیے قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔

یہاں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ مشرکین جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہیں: ایک تو مظاہر فطرت ہیں جو بے جان ہیں' مثلاً سورج' چاند' ستارے' آگ' پانی وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ وہ پوجتے ہیں فرشتوں کو' انبیاء کو اور اولیاء اللہ کی ارواح کو۔ اب مشرکین کا یہ کہنا کہ ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب تر کر دیں تو یہ بات چاند' سورج اور ستاروں کے بارے میں تو نہیں ہو سکتی' اصل میں یہ اس دوسری قبیل سے متعلق ہے' یعنی وہ جن جاندار چیزوں کو پوجتے تھے تو اس سے ان کا مقصد قربِ الٰہی ہوتا تھا۔

مشرکینِ عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور جن سے اللہ کی بیٹیاں راضی ہو جائیں تو اللہ بھی اُن سے راضی ہو جائے گا۔ بیٹیاں لاڈلی ہوتی ہیں اور ان کی فرمائش کو رد کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ بیٹوں کو تو آسانی سے جھڑک سکتے ہیں' مگر بیٹیوں کو نہیں جھڑک سکتے اگر آپ کے اندر شرافت ہے۔ مجھے جب یاد آتا ہے تو میں اپنے آنسو نہیں روک سکتا کہ کس جگر کے ساتھ اور کس مضبوط دل کے ساتھ حضور ﷺ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی یہ درخواست رد کی ہوگی کہ حضورؐ! اب تو سب لوگوں کے گھروں میں آسائش ہو گئی ہے' معاشی حالات اچھے ہو گئے ہیں' تو مجھے بھی کوئی لونڈی یا خادمہ عطا کر دیں۔ دیکھئے چکّی پھیر پھیر کے میرے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں اور کندھوں پر پانی کے مشکیزے لاد کر لانے کی وجہ سے نشان پڑ گئے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ (فداہ آبائنا واُمّھاتنا) نے جواب دیا کہ بیٹی! یہ چیزیں تمہارے لیے نہیں ہیں۔ میں تمہیں اس سے بہتر شے بتاتا ہوں' وہ یہ کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ' ۳۳ مرتبہ الحمد للہ' ۳۳ (یا ۳۴) مرتبہ اللہ اکبر پڑھا کرو (اس کو تسبیح فاطمہؓ بھی کہا جاتا ہے)۔

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر بت بنا لیے گئے۔ مشرکین کے تین بڑے بُت لات' منات اور عُزّیٰ مؤنث تھے۔ لات مؤنث ہے الٰہ کا' عزیٰ مؤنث ہے عزیز کا' منات بھی مؤنث ہے' تو انہوں نے یہ دیویاں بنائی ہوئی تھیں۔ دراصل مشرکینِ عرب کا یہ تصور ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی صورت تھی۔

فرشتے عالمِ ارواح میں موجود ہیں اور ان میں بھی اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی جدوجہد جاری ہے۔ فرشتوں کے بھی درجات ہیں۔ پہلے نمبر پر ملائکہ مقربین ہیں جو اللہ ربّ العزت سے بہت ہی قریب ہیں۔ کچھ فرشتے وہ بھی ہیں جو اللہ کے عرشِ اعظم کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرشتوں میں بھی قرب کی ایک خواہش پائی جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اولیاء اللہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے نام پر مجسمے بنا لیے گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بتوں کا ذکر سورۂ نوح میں آتا ہے۔ قوم کے سرداروں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ کہیں نوح کی باتوں میں آ کر اپنے ان معبودوں کو نہ چھوڑ دینا: ﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾﴾ ''وہ کہنے لگے: دیکھو نہ چھوڑ دینا اپنے معبودوں کو' ہرگز مت چھوڑنا وَدّ کو' سواع کو' یغوث کو' یعوق کو اور نسر کو''۔ ان بتوں کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ اس قوم کے گزرے ہوئے اولیاء اللہ تھے اور قوم نے ان کے بت تراش لیے تھے۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم بھی اولیاء اللہ کی قبروں کو پوجتے ہیں' تو ان میں اور ہم میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔

ایک بڑا تلخ واقعہ بتایا تھا غازی احمد صاحبؒ نے' جنہوں نے کتاب لکھی تھی ''مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ''۔ یہ ہندو خاندان میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اور بڑے مؤحّد تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا سارا کنبہ انبالہ میں جا کر آباد ہو گیا۔ پھر کئی سال کے بعد اُن کے بھائی اُن سے ملنے کے لیے آئے تو انہوں نے یہ بات کہی کہ بھائی جان! آپ نے خواہ مخواہ اپنا مذہب بدلا۔ ہم نے تو انبالہ میں جا کر دیکھ لیا ہے کہ مسلمان قبروں کو پوجتے ہیں' تو ہم میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ ہمیں تو کوئی فرق نظر نہیں آیا' بس

یہی فرق ہے نا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور یہ قبروں کو پوج لیتے ہیں!

بہرحال جو لوگ بھی فرشتوں' انبیاء کی ارواح یا اولیاء اللہ کی ارواح کو پکارتے تھے یا پکارتے ہیں اس سے ان کا مقصد قربِ الٰہی ہے۔ لیکن یہ پکارنا شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ارواح تو حقیقت ہیں اور روحِ محمدی ﷺ بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ عالمِ ارواح میں موجود ہے۔ اسی طرح یقیناً اولیاء اللہ کی ارواح بھی موجود ہیں اور میں آپ کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا قول سنا چکا ہوں کہ اولیاء اللہ کے انتقال کے بعد ان کی ارواح کو بھی اللہ تعالیٰ ملائکہ اسفل میں شامل کر دیتے ہیں۔ یہ ملائکہ کا سب سے نچلا درجہ ہے جو اس دنیا کے انتظام پر مامور ہے۔ یہ سیکرٹ سول سروس ہے جو نظر نہیں آتی' مگر اللہ کے احکام کی تنفیذ کرتی ہے۔ تو اولیاء اللہ کی ارواح بھی انہی میں شامل ہو جاتی ہیں' لیکن آپ کسی کو پکار نہیں سکتے۔ فرشتے آپ کے ساتھ موجود ہیں' لیکن آپ انہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا یہ کام کرا دو! اسی طرح کسی روح کو بھی نہیں کہہ سکتے کہ میرا فلاں کام کرا دو۔

قُربِ الٰہی کی حد

اب ہم ایک بہت نازک اور حساس موضوع کی طرف آ رہے ہیں کہ اس قرب کا اللہ کے ساتھ کس حد تک معاملہ ہو سکتا ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری کی نہ ہوتی تو ہمارے ہاں خاص طور پر وہ لوگ جن کے اندر توحید کا زیادہ ذوق اور جذبہ ہے اور ان کے اندر شرک سے زیادہ نفرت ہے' وہ کبھی بھی اس حدیث کو نہ مانتے۔ اس لیے کہ اس میں وہ کیفیت بیان ہو رہی ہے جو علامہ اقبال نے ایک شعر میں کہی ہے:

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ھو

یعنی میرے ساقی نے مجھے لا الٰہ الا ھو کی جو شراب پلائی ہے تو اس سے میں اور تو کا فرق ختم ہو گیا ہے۔ یہ بہت خطرناک مقام ہے ع ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!'' ہوشیار ہو جاؤ' کہ اب تمہارے قدم تلوار کی دھار پر ہیں' لہٰذا پھونک پھونک کے قدم

رکھو۔ اس معاملہ میں بے احتیاطی بدترین شرک کی طرف بھی لے جاسکتی ہے۔

جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں' زیرِ مطالعہ حدیث میں قربِ الٰہی کے حصول کے دو راستے بیان کیے گئے ہیں اور اس حوالے سے یہ حدیث حکمت کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ پہلا راستہ ہے :((مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُہٗ عَلَیْہِ))''میرا بندہ میرے فرض کردہ امور کے سوا کسی اور چیز کے ذریعے میرے زیادہ قریب نہیں آ سکتا''۔ اس کو ہم ''تقرب بالفرائض'' کا نام دیں گے۔ یعنی جو اعمال ہم پر فرض کیے گئے ہیں ان کے ذریعے سے ہم اللہ کا قرب تلاش کریں تو یہ اللہ کو محبوب ترین ہے۔ دوسری بات بلند ترین ہے اور وہ یہ ہے کہ: ((وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ))''اور نہیں مصروف رہتا میرا بندہ میرا قرب حاصل کرنے میں نوافل کے ذریعے سے'' ((حَتّٰی اُحِبَّہٗ))''یہاں تک کہ (ایک مقام آتا ہے کہ) میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں''۔ آگے حساس ترین بلکہ خطرناک ترین بات آ رہی ہے :((فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ)) ''جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اپنے بندے کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے'' ((وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ))''اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے'' ((وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا))''اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے'' اور آگے چلیے :((وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا))''اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے''۔((وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ))''اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے تو میں اسے لازماً دوں گا'' ((وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ))''اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے گا تو میں لازماً اسے پناہ دوں گا''۔ یہاں تو اس انتہا درجے کا قرب ہے کہ گویا مَن وتو کا معاملہ ختم ہو گیا!

ظاہر بات ہے کہ یہ موضوع مسلمان صوفیاء کا ہے' یہ فقہاء کا میدان نہیں ہے۔ یہ مضامین تصوف کے عنوان سے بیان ہوتے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنی تقریر میں تصوف کی نفی اس اعتبار سے کی ہے کہ تصوف کا ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ یہ بالکل نئی اصطلاح ہے اور اس نئے عنوان کے ساتھ بہت سی نئی چیزیں بھی اسلام میں آ کر

شامل ہوگئی ہیں' لیکن ایک حقیقی تصوف بھی ہے (جس کے لیے حدیث میں لفظ ''احسان'' آیا ہے) اور وہ ہے اللہ کا قرب' مزید قرب' مزید قرب۔ جیسے ہم نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کی حدیث تفصیل سے پڑھی تھی۔ سفرِ تبوک میں جاتے ہوئے صبح کے وقت جب وہ جاگ رہے تھے اور اپنی اونٹنی رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے پیچھے پیچھے لگائے چلے آ رہے تھے' جبکہ باقی سب لوگ اونگھ رہے تھے اور ان کی اونٹنیاں اِدھر اُدھر منتشر ہوگئی تھیں۔ چرتی بھی جا رہی تھیں اور چلتی بھی جا رہی تھیں۔ اسی دوران حضرت معاذؓ کی اونٹنی نے ٹھوکر کھائی' معاذؓ نے اس کو لگام کھینچ کر سنبھالا تو وہ اور تیز ہوگئی اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ اس پر حضور ﷺ نے اپنا پردہ اٹھایا اور دیکھا کہ آس پاس معاذؓ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ معاذ چونکہ قریب تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اُدْنُ دُوْنَكَ)) ''اور قریب آ جاؤ' اور قریب آ جاؤ''۔ تو وہ اتنے قریب ہو گئے کہ دونوں کی اونٹنیاں آپس میں رگڑ کھانے لگیں۔ اسی طرح حقیقی تصوف یہ ہے کہ اللہ سے اور قریب' اور قریب ہو جاؤ۔ یہ تقرب اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے جن کے بارے میں زیرِ مطالعہ حدیث کے شروع میں فرمایا گیا: ((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) ''جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی تو اس کے خلاف میرا اعلانِ جنگ ہے۔''

تقرّب بالفرائض کا جامع تصوّر

اوّلاً یہاں نوٹ کیجیے کہ قربِ الٰہی کے دو ذرائع ہیں: تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل۔ ظاہر ہے تقرب بالنوافل کا مرحلہ فرائض کی ادائیگی کے بعد آئے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ فرض نماز افضل ہے نفل نماز سے۔ کوئی شخص فرض نہ پڑھتا ہو اور سارا دن نفل پڑھتا رہے تو اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ ساری رات نوافل میں کھڑے رہے' فجر میں سو گئے تو زیرو۔ نوافل کا معاملہ فرائض کی ادائیگی کے بعد آتا ہے اور فرائض کا تصور میں نے کئی بار بیان کیا ہے کہ جہاں نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ فرض ہے وہاں دین کی دعوت اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد بھی فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کی طرف آپ کی طرف توجہ نہیں ہے اور نوافل پر آپ نے اپنا پورا زور لگایا ہوا ہے تو یہ طرزِ عمل درست نہیں۔

نمازیں نفلی‘ روزے نفلی‘ حج نفلی‘ عمرے پر عمرے‘ ہر سال عمرہ‘ رمضان کا عمرہ‘ کیا ہے یہ؟ آپ نے فرض ترک کیا ہوا ہے تو فرض کو چھوڑ کر نوافل‘ چہ معنی دارد؟

اس حوالے سے اصول یہ ہے کہ پہلے یہ فرض ادا ہو جائے‘ اللہ کا دین قائم ہو جائے تب آپ دوسرے درجے یعنی تقرب بالنوافل کی طرف آ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ جب نظامِ خلافت قائم ہو گیا تو اب دین کی مزید دعوت اور دین کو بقیہ دنیا میں غالب کرنے کی جدوجہد اس نظام کے ذمہ ہے۔ اب انفرادی طور پر لوگ بری ہو جائیں گے۔ البتہ کسی موقع پر اس نظامِ خلافت کی طرف سے مطالبہ آ جائے کہ فلاں محاذ کے لیے دس ہزار آدمی فوراً چاہئیں تو دس ہزار اگر نکل آئے تو باقی آرام سے گھروں میں سوئیں‘ رات بھر قیام کریں‘ علمی کام میں لگے رہیں‘ روحانی جدوجہد میں لگے رہیں تو سب جائز ہے۔ لیکن یہ سب نفلی کام اُس وقت ہیں جب دین قائم ہو چکا ہو۔ یہ ہے کانٹے کی بات۔ یہ تقرب بالفرائض اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔

تقرّب بالفرائض اور تقرّب بالنوافل میں نسبت وتناسب

دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ قربِ الٰہی کے ان ذرائع میں سے بلند تر مقام کون سا ہے؟ میں نے کئی مرتبہ جہاد کی مثال دی ہے کہ جہاد شروع ہوتا ہے اپنے نفس کے خلاف جہاد سے‘ چنانچہ نفس کے خلاف جہاد اہم ترین ہے‘ اسی لیے اسے افضل کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟ ''کون سا جہاد افضل ہے؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) کہ تم اپنے نفس کے خلاف جہاد کرو اور اسے اللہ کا مطیع بناؤ۔ میں نے اپنے کتابچہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' میں جہاد کی نو (۹) منزلیں بیان کی ہیں اور نویں منزل قتال فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ جہاد کا اعلیٰ ترین اور بلند ترین مقام قتال فی سبیل اللہ ہے‘ لیکن جہاد کا اہم ترین مقام نفس کے خلاف جہاد ہے۔ یاد رکھیے کہ پہلی منزل کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے‘ اس لیے کہ پہلی منزل ہو گی تو دوسری بنے گی‘ دوسری ہو گی تو تیسری بنے گی‘ اسی طرح تیسری‘ چوتھی‘ پانچویں‘ چھٹی‘ ساتویں‘ آٹھویں‘ لیکن بلند ترین مقام یہ ہے کہ انسان اللہ کے دین اور اس کے کلمے کی سربلندی

کے لیے‘ روئے ارضی پر اس کی حکومت کو قائم کرنے کے لیے نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جائے۔ یہ اعلیٰ ترین اور اہم ترین مقام ہے۔ اسی طرح یہاں پر ترتیب ہے کہ تقرب بالفرائض محبوب ترین ہے‘ لیکن تقرب بالنوافل کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس سے اونچا مقام تو کوئی ہو نہیں سکتا‘ لیکن یہ تقرب بالنوافل فرائض کے بعد ہے۔ فرائض کو نظرانداز کر کے‘ فرائض کو ترک کر کے نوافل کا کوئی مقام نہیں۔ چلہ کشیاں ہو رہی ہیں‘ نفس کے خلاف جہاد ہو رہا ہے‘ جبکہ باطل کا غلبہ ہے اور اس کے خلاف کوئی کام آپ کر نہیں رہے‘ اللہ کا دین پامال ہے اور اس کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں‘ کوئی حمیت نہیں‘ کوئی غیرت ہی نہیں ہے تو ایسے نوافل کا کوئی مقام نہیں ہے۔

اقامتِ دین کی جدّو جُہد فرض ہے!

نوٹ کرنے کی تیسری بات یہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے۔ اصل بات یہ ہے جو ہمارے ذہنوں سے نکل گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ اسلام کا تصور بحیثیت دین کمزور ہوتا چلا گیا‘ یہاں تک کہ عالمِ اسلام پر اغیار قابض ہو گئے‘ کہیں انگریز آ گئے‘ کہیں فرانسیسی آ گئے۔ مسلمانوں کی حکومت تھی تو کم سے کم قاضی اور مفتی تو ہوتے تھے اور فیصلے تو اسلامی قانون کے مطابق ہوتے تھے‘ لیکن انگریز کے آنے سے یہ سب ختم ہو گیا اور اسلامی قانون بھی ختم ہو گیا۔ اب تو پینل کوڈ ان کا ہے‘ سول کوڈ ان کا ہے‘ کریمنل پروسیجر کوڈ سب ان کا ہے۔ سب دیوانی اور فوجداری قوانین ان کے ہیں۔ اسی طرح ہوتے ہوتے ہمارا ذہن یہاں پر آ کر منجمد ہو گیا کہ بس یہ چیزیں اصل دین ہیں: نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی‘ سور نہیں کھانا‘ شراب نہیں پینی‘ زنا نہیں کرنا۔ باقی اقامت دین کی جدوجہد کا تصور تو علماء میں بھی نہیں ہے۔ اس کی فرضیت کا اعلان تو بہت دور کی بات ہے‘ وہ تو اس کا تذکرہ تک نہیں کرتے۔ مفتی اور خطیب تو سینکڑوں ہزاروں نکل رہے ہیں لیکن معاشرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ہاں ٹھیک ہے نئی نئی مسجدیں بنتی ہیں تو نئے نئے خطیب بھی چاہئیں۔ بس آبادی بڑھ رہی ہے‘ مسجدیں بن رہی ہیں‘ لیکن دین کی اقامت کہاں ہے؟

بہرحال اب کچھ تبدیلی آ رہی ہے‘ دینی مدارس کے اندر یہ لہر اب اٹھ رہی ہے‘ مگر بدقسمتی سے اقامت دین کا منہج اور طریقہ کار جو حضور ﷺ کا تھا‘ وہ اب بھی سامنے نہیں ہے۔ کوئی الیکشن کی طرف چلا گیا‘ کوئی صرف وعظ و نصیحت ہی کرتا چلا گیا‘ کسی نے ہتھیار اٹھا لیے یا حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے کچھ اور حربے استعمال کیے۔ یاد رکھیے کہ اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا‘ لیکن ہو گا صرف طریقہ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے۔

زیر مطالعہ حدیث کے بارے میں ابن عربی کی رائے

زیر مطالعہ حدیث کے حوالے سے میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ان مضامین پر صوفیاء غور و فکر کرتے ہیں اور ایسی احادیث صوفیاء ہی کا میدان ہیں۔ صوفیاء میں سے ایک بہت بڑی شخصیت ابن عربی ہے۔ ان کی طرف بہت سے عقائد اور نظریات منسوب ہیں‘ پتا نہیں ان کی طرف ان کی نسبت صحیح بھی ہے یا غلط‘ اس لیے کہ جب آسمانی کتابوں میں تحریف ہو گئی‘ احادیث میں تحریف ہو گئی‘ جھوٹی حدیثیں گھڑ کر حضور ﷺ کی طرف منسوب کی گئیں تو کوئی بعید نہیں ہے کہ ابن عربی کی کتابوں میں بھی کچھ لوگوں نے اپنے نظریات داخل کر دیے ہوں۔ بہرحال وہ ایک الگ مسئلہ ہے‘ لیکن اس حدیث کے بارے میں وہ بڑی عجیب اور بہت گہرائی والی بات کہتے ہیں۔ ان کی کتاب ہے ''فصوص الحکم'' اور اس میں انہوں نے ایک ایک نبیؑ کے حوالے سے اپنے مکاشفات بیان کیے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کے حوالے سے جو کچھ اپنی باتیں بیان کر رہے ہیں تو عجیب بات کہہ رہے ہیں۔ اس حدیث کے پہلے حصے :((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُہٗ عَلَیْہِ)) کے ضمن میں کہتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرا بندہ میرے کان بن جاتا ہے جن سے میں سنتا ہوں‘ میرا بندہ میری آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے میں دیکھتا ہوں‘ میرا بندہ میرا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے میں پکڑتا ہوں‘ میرا بندہ میری ٹانگیں بن جاتا ہے جس سے میں چلتا ہوں۔ بات وہیں آتی ہے کہ انتہائی درجے کا قرب ع ''مٹا دیا میرے ساقی نے عالم مَن و تو!'' یہ تقرب بالفرائض کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف نوافل کے ذریعے سے یہ ہو گا اور یہ پہلے سے اونچی منزل ہے کہ میں اپنے بندے کے

کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے' میں اپنے بندے کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے' میں اپنے بندے کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے' میں اپنے بندے کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے

میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ حدیث کراماتِ اولیاء کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ البتہ ہمیں حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں مکاشفات اور کرامات کا وہ نقشہ نہیں ملتا جو آپ کو صوفیاء اور اولیاء اللہ کی حکایات میں ملتا ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرامؓ تو اصل میں تقرب بالفرائض میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے دین غالب کیا ہے' جانیں دی ہیں اور وہ بلندترین محبوبیت پر ہیں۔ ہاں جب دین غالب ہو گیا' خلافت قائم ہو گئی تب اس سے آگے بڑھ کر لوگوں نے نوافل کے ذریعے سے تپسیائیں اور ریاضتیں کی ہیں۔ اصل بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ قربِ الٰہی کے دونوں ذرائع میں سے پہلے کے مقابلے میں دوسرا اونچا ہے' لیکن پہلا محبوب تر ہے۔

یہ ہیں وہ مضامین جو میں نے اپنے دو کتابچوں میں بیان کیے: (۱) قربِ الٰہی کے دو مراتب' اور (۲) مروّجہ تصوف یا سلوکِ محمدی؟ یعنی احسانِ اسلام۔ ان میں' میں نے بیان کیا ہے کہ مروّجہ تصوف کیا ہے اور اس میں ٹیڑھ کیوں اور کیسے آئی ہے' اور اب سلوکِ محمدیؐ کا احیاء ہمارے اوپر لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کے ظاہری و باطنی ثمرات سے مالا مال فرمائے اور ہمیں احسانِ اسلام اور سلوکِ محمدیؐ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
39
40

خطا' نسیان اور جبر واکراہ کی معافی اور دنیا کی بے ثباتی

۸/ اگست ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۞ (البقرۃ)

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ (النحل)

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۞ (الرعد)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۞ (العنکبوت)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِيْ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَاَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ)) (۱)

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الطلاق' باب طلاق المکرہ والناسی۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری اُمت سے (تین قسم کے کاموں اور گناہوں کو) معاف کر دیا ہے: خطا' نسیان اور وہ کام جن کے کرنے پر انسان مجبور کر دیا جائے۔''

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ : اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِمَنْكِبَيَّ فَقَالَ :

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))

وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہما يَقُوْلُ : اِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ ' وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ ' وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ ' وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ [1]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھوں کو پکڑ کر فرمایا:

''دنیا میں یوں رہو جیسے کہ اجنبی یا راہ چلتا مسافر ہو۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: ''شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کیا کرو اور صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو۔ صحت کو بیماری سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو۔''

معزز سامعین کرام!

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم ''اربعین نووی'' کے اختتام تک پہنچ گئے ہیں اور آج اربعین کی حدیث ۳۹ اور ۴۰ ہمارے زیر مطالعہ آئے گی۔ یہ احادیث اپنے حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی ہیں' لیکن معانی کے اعتبار سے گویا کوزے میں دریا بند ہے۔

پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِيْ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَاَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ)) ''اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری اُمت سے (تین قسم کے کاموں اور گناہوں کو) معاف کر دیا ہے: (۱) خطا' (۲) نسیان' اور (۳) وہ کام جن کے کرنے پر انہیں مجبور کر دیا گیا ہو''۔ یہ حدیث حسن ہے اور اسے ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔

زیر مطالعہ حدیث میں پہلی غور طلب بات ہے: ((تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِیْ)) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں کہ میری خاطر اور میرے لیے اللہ نے میری امت کے لیے یہ رعایت کی ہے۔ اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کے صدقے اللہ نے اس اُمت سے یہ رعایت کی کہ ان تین چیزوں پر کوئی مواخذہ اور محاسبہ نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی سزا ہوگی۔

انسان اپنی صلاحیت کے مطابق مکلّف بنایا گیا ہے!

ان تین چیزوں میں سے پہلی نسیان اور دوسری خطا ہے' اور اس کے ضمن میں' میں نے جو پہلی آیت پڑھی تھی وہ سورۃ البقرۃ کی آخری آیت ہے اور اس کا شمار قرآن مجید کی بڑی عظیم آیات میں ہوتا ہے۔ اس آیت میں پہلے تو ایک بہت بڑی خوشخبری ہے اور یہ مضمون قرآن مجید میں کئی اور مقامات پر بھی آیا ہے' فرمایا: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ ''اللہ تعالیٰ ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا کسی بھی جان کو' مگر اس کی وسعت کے مطابق''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کا حساب ایک جیسا اور برابر نہیں ہوگا' بلکہ ہر ایک کا حساب ہوگا اس کی صلاحیت' اس کی قدرت اور اس کی طاقت کے مطابق جو اللہ نے اسے دی ہے۔ اگر کسی کی وسعت کم ہے تو محاسبہ بھی ہلکا ہوگا اور اگر وسعت زیادہ ہے' صلاحیت زیادہ ہے' ذہانت زیادہ ہے' جسمانی قدرت زیادہ ہے تو حساب بھی اتنا ہی سخت ہوگا۔ دیکھا جائے تو یہ بہت بڑی خوشخبری ہے' اس لیے کہ دنیا کا قانون یہ نہیں دیکھتا کہ جس نے چوری کی ہے اس کی کیا مجبوری تھی اور دنیا کا قانون اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا' لیکن اللہ کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ ہر شخص کے اندر جو بھی وسعت ہے' اسے اللہ جانتا ہے۔ کسی شخص میں اللہ نے صرف بیس سیر بوجھ اٹھانے کی قوت رکھی تھی اور اس نے پندرہ سیر بھی اٹھا لیا تو اللہ اسے کامیاب قرار دے دے گا' لیکن جس میں من بھر کی صلاحیت رکھی تھی اُس نے بیس سیر بھی اٹھا لیا تو وہ ناکام ہوگیا۔ گویا یہاں کوئی فلیٹ ریٹ نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ کہ کوئی جان بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرائی جائے گی' مکلّف نہیں ٹھہرائی جائے گی مگر اس کی وسعت کے مطابق۔

اس حوالے سے ایک شیطانی وسوسہ یہ ذہنوں میں آتا ہے کہ آدمی دین کے معاملے میں یہ کہہ کر بری ہو جاتا ہے کہ میرے اندر صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں دیکھنا ہوگا کہ دنیوی معاملات میں اس شخص کی کتنی صلاحیت ظاہر ہو رہی ہے۔ اگر انسان میں صلاحیت نہیں ہے تو دنیا میں بھی کامیابی نہیں ہونی چاہیے۔ دنیا میں آپ آگے سے آگے جا رہے ہوں اور دین کے معاملے میں آپ یہ کہہ دیں کہ میرے اندر صلاحیت نہیں' تو یہ سراسر دھوکہ ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اُس نے کس میں کتنی صلاحیت رکھی ہے اور پھر اسی کے حساب سے معاملہ ہوگا۔ بس اپنی امکانی حد تک آدمی کر گزرے' یہ کافی ہے' اس لیے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ ہم نے کیا دیا تھا' کتنی قوت' کتنی ذہانت' کتنی صلاحیت ہم نے دی تھی۔ لیکن شیطان کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے اور اپنے آپ کو دین کے معاملات میں بری نہیں سمجھنا چاہیے کہ میرے پاس وسعت اور ذہانت نہیں ہے۔ اس بارے میں یہ دیکھا جائے گا اگر آپ دنیا میں کامیاب ہیں' آپ کی تجارت پروان چڑھ رہی ہے' پھل پھول رہی ہے یا آپ اپنے پیشے کے اندر دن بدن ترقی کر رہے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آپ میں صلاحیت موجود ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عدمِ صلاحیت کا عذر رکھ کر اپنے آپ کو دین کے معاملے میں بری ٹھہرا دینا غلط ہے' نفس اور شیطان کا دھوکہ ہے۔ تاہم قاعدہ اپنی جگہ یہی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ کہ ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق ہی جواب دہ ہے۔

انسان کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا!

آگے بھی ایک اہم اصول بیان ہوا ہے' فرمایا: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ﴾ ''ہر جان کے لیے وہی کچھ ہے جو اُس نے کمایا ہے اور اس پر وبال بھی اسی کا آئے گا جو اس نے گناہ کیے ہیں''۔ میں نے بارہا آپ کو بتایا ہے کہ **لام** کسی کے حق میں جانے والی بات کے لیے اور **عَلٰی** کسی کے خلاف جانے والی بات کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمانِ نبویؐ ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ))(۱) ''قرآن یا تو حجت اور دلیل

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔

ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف''یعنی اس پر چلو گے' اس پر عمل کرو گے' تو وہ قیامت کے دن تمہارے حق میں گواہی دینے والا ہو گا اور اللہ سے تمہاری سفارش کرے گا' لیکن اگر تم اس کے خلاف چلو گے تو وہ تمہارے خلاف حجت بن جائے گا۔ یہی بات یہاں فرمائی: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾۔ یہ مضمون بھی قرآن مجید میں مختلف الفاظ کے ساتھ کئی مقامات پر بیان ہوا ہے' مثلاً سورۂ فاطر میں فرمایا: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (آیت ۱۸) ''اور کوئی جان نہیں اٹھائے گی کسی دوسری جان کا بوجھ''۔ قیامت کے روز نہ باپ بیٹے کا بوجھ اٹھا سکے گا اور نہ بیٹا باپ کا' نہ شوہر بیوی کا اور نہ بیوی شوہر کا۔ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہو گا۔

قرآن مجید کی جامع ترین دعا

سورۃ البقرۃ کی آخری آیت کی ابتدا میں دو اصول بیان کرنے کے بعد آگے ایک دعا تلقین کی گئی اور بلاشبہ یہ قرآن مجید کی جامع ترین دعاؤں میں سے ایک ہے۔ فرمایا: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ''اے ہمارے رب! ہمارا مواخذہ مت کیجیو اس پر اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے''۔ خطا کسے کہتے ہیں؟ آپ نشانہ لگا رہے تھے تو وہ نشانہ صحیح جگہ پر نہیں لگا بلکہ چوک گیا تو یہ خطا ہے اور خطا سے ہونے والا کوئی کام اس اُمت کے لیے قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے۔

قرآن مجید کی اس جامع ترین دعا کا اگلا حصہ بھی بہت اہم ہے: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ ''اے ہمارے رب! ہم پر مت ڈالیے وہ بوجھ جو آپ نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا''۔ یہاں اصل میں شریعتِ موسویؑ کی طرف اشارہ ہے جو درحقیقت بہت سخت تھی' جبکہ شریعتِ محمدیؐ کو بہت آسان کیا گیا ہے۔ مثلاً شریعت موسوی میں رات کو سونے پر روزہ شروع ہو جاتا ہے اور اگلے روز غروبِ آفتاب تک چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ طلوعِ فجر سے پہلے کھاؤ پیو اور طلوعِ فجر سے روزہ شروع ہو گا جو غروب تک جائے گا۔ پھر ان کے لیے ''یومِ سبت'' کی بڑی سخت ممانعت تھی' یعنی جمعہ کی رات سے شروع ہو کر ہفتہ کے

غروب تک (مکمل ۲۴ گھنٹے) کوئی دنیوی کام نہیں کرنا۔ جو عملی یہودی ہیں وہ آج بھی اس پر مکمل عمل کرتے ہیں کہ ان اوقات میں بس عبادت کرو' تورات پڑھو اور نیکی کے کام کرو۔ وہ اپنے ٹیلی فون بھی ان اوقات میں منقطع کر دیتے ہیں اور دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے۔ اصحابِ سبت نے اس ضمن میں ایک حیلہ کیا تھا تو ان پر بڑا سخت عذاب آیا' ان کی صورتیں مسخ کر دی گئیں اور وہ بندروں کی شکل کے بنا دیے گئے۔ اس کے مقابلے میں شریعت محمدیؐ میں جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کے مکمل ہونے تک دنیوی کام کرنے کی پابندی ہے جو بمشکل دو گھنٹے بنتے ہیں۔ لہٰذا شریعت موسوی بہت سخت تھی تو اس کے مقابلے میں شریعت محمدیؐ میں آسانیاں پیدا کی گئیں اور اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کو بھی آسانیاں پیدا کرنے کی تعلیم فرمائی ہے:

((يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا))[1] ''لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو اور سختی نہ کیا کرو۔''

عام طور پر ہمارے ہاں بعض علماء کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو تو سخت سے سخت بات کا فتویٰ دیں گے اور خود انہیں ''کتابُ الحیل'' کی رو سے معلوم ہے کہ کس حیلے کے ذریعے بچا جا سکتا ہے اور وہ خود ان حیلوں پر عمل کرتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ آپ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سختی کریں اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔ شریعت کے اندر جو بھی گنجائش نکل سکتی ہے' وہ لوگوں کو نکال کر دکھائیں۔ بمصداقِ قرآنی: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''اللہ تو تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے' اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔''

سورۃ البقرۃ کی زیر مطالعہ آیت ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ میں دو لفظ قابل غور ہیں: اِصر اور حَمل۔ ''اصر'' کہتے ہیں اصل میں اس بوجھ کو جس کو اٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے اور ''حمل'' کہتے ہیں اُس بوجھ کو جس کو لے کر چلا جا سکے۔ چنانچہ بوجھ اٹھا کر چلنے والے پلے دار کو ''حمّال'' کہا جاتا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب فی الامر بالتیسیر وترك التنفیر۔

ہے۔ حضورﷺ کی شان میں سورۃ الاعراف میں یہ آیت آئی ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵۷) ''اور (نبی اکرمﷺ) ان سے اتار دیں گے ان کے بوجھ اور طوق جو ان (کی گردنوں) پر پڑے ہوں گے''۔ یہود کا معاملہ یہ تھا کہ ایک تو اصلاً شریعت سخت تھی اور پھر یہودی علماء نے بھی لوگوں کے لیے سختی در سختی کے قانون کے اپنایا تو لوگوں پر وہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ شریعتِ محمدیؐ نے وہ بوجھ اتار دیا اور لوگوں کے لیے نرمی پیدا کر دی۔ چنانچہ اُمتِ محمدیؐ کو اس دعا کی تلقین کی گئی: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾

''اے ہمارے رب! ہم پر مت ڈالیے وہ بوجھ جو آپ نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا۔''

آگے پھر وہی بات دوبارہ فرمائی: ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ ''اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ بھی نہ ڈالیو جس کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو''۔ ﴿وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟﴾ ''اور ہمیں معاف کرتا رہ اور ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما''۔ ﴿وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا﴾ ''اور تو ہم پر رحم فرما' تو ہی ہمارا مولا ہے''۔ ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۸۶﴾ ''اور ہماری مدد کر کافروں کے مقابلے میں''۔ اس میں اشارہ ہو گیا کہ کفر کے خلاف جدوجہد اہلِ ایمان پر فرض ہے اور جو نہیں کرتے وہ فرض کے تارک ہوں گے۔ اور اگر وہ جِدّوجُہد کر رہے ہیں تو پھر اللہ کی مدد بھی آئے گی۔

جبر واکراہ کی معافی

زیرِ مطالعہ حدیث میں تین چیزوں کا تذکرہ تھا کہ جن پر اللہ کی طرف سے اس اُمت کے لیے معافی کا اعلان ہے: (۱) خطا' (۲) نسیان' اور (۳) وہ کام جن کے کرنے پر کسی شخص کو مجبور کر دیا گیا ہو۔ سورۃ البقرۃ کی بیان کردہ آیت میں پہلی دو باتوں کی وضاحت ہو گئی۔ تیسری چیز جبر اور اکراہ ہے' یعنی وہ کام جس کے کرنے پر کسی کو بے انتہا مجبور کر دیا جائے اور اس کے پاس اُس کام کو کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ رہے۔ ایسی صورت میں کیا جانے والا فعل قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے۔ یہ جبر دو طرح کا ہو سکتا ہے' ایک جبر خارجی ہے اور ایک جبر داخلی ہے۔ خارجی جبر تو یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کو

قتل کرنے پر تلا ہوا ہے کہ کفر کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں۔ایسی صورت میں جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ دیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔

اس حوالے سے ایک اہم واقعہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔مکہ مکرمہ میں تین افراد پر مشتمل ایک خاندان تھا: حضرت سُمیہؓ‘ حضرت یاسراور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔ عمار بیٹے ہیں اور سمیہ اور یاسر ماں باپ ہیں۔ان کا قصہ اصل میں یہ ہے کہ یاسر یمن کے رہنے والے تھے اور انہیں خواب میں بشارت ہوئی کہ مکہ کی سرزمین میں نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہونے والا ہے‘ تو وہ وہاں سے مکہ آ گئے۔مکہ کا دستور یہ تھا کہ وہاں یا تو قرشی رہ سکتا تھا یا قرشی کا غلام یا قرشی کا حلیف۔کوئی شخص اگر مکہ سے باہر سے آ کر وہاں رہائش پذیر ہونا چاہتا تو اُس کے پاس دو اختیار تھے کہ یا تو کسی قرشی کی غلامی میں آئے یا پھر کسی قرشی سردار کا حلیف بن کر اس کے تحفظ (protection) میں آ جائے۔

مثال دے رہا ہوں‘ جیسے آج کل آپ سعودی عرب میں کوئی کاروبار کرنا چاہیں تو اس کاروبار کی شرط یہ ہے کہ ایک سعودی باشندہ لازماً ’’کفیل‘‘ ہوگا اور اس کے ساتھ مل کر آپ کام کریں گے۔اس کا فائدہ وہاں کے باشندوں کو یہ ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والا‘ مثلاً کوئی ہندوستانی یا پاکستانی سعودی عرب میں کاروبار کرتا ہے‘ دن رات محنت مزدوری کرتا ہے‘ لیکن اس کی کمائی میں سے ملائی وہ سعودی باشندہ لے جاتا ہے۔ ہے تو یہ بالکل ناانصافی‘ لیکن بہرحال یہ سعودی عرب کا قانون ہے۔اسی طرح دورِ جاہلیت میں بھی قاعدہ تھا کہ مکہ کے باہر سے آنے والا کسی قرشی کا غلام بن کر رہے یا حلیف بن کر۔چنانچہ یاسر یمن سے مکہ آئے اور یہاں آ کر ابوجہل کے ایک چچا‘ جو نیک آدمی تھا‘ کی کفالت اور حمایت میں اس کے حلیف بن کر مکہ میں رہنے لگے۔اسی کی ایک لونڈی سمیہ تھی تو اُس کی اجازت سے یاسر نے سمیہ سے شادی کر لی اور اللہ نے انہیں عمار بیٹا دیا۔نبی اکرم ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد یہ گھرانہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔

ابوجہل کا وہ چچا جب فوت ہوگیا تو وراثتاً یہ سارا خاندان ابوجہل کو منتقل ہوگیا جو اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ابوجہل نے پھر ان پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے اور جس حد

تک تشدد کیا' اس کا تذکرہ کرتے اور سنتے وقت انسان پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے۔
حضرت عمار رضی اللہ عنہ نوجوان تھے' ان کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا گیا اور ان کی نگاہوں کے سامنے ان کی ماں کو برہنہ کر کے جگہ جگہ کچوکے لگائے گئے کہ باز آ جاؤ اور اسلام سے بیزاری کا اعلان کر دو! یہاں تک کہ ابوجہل کے ہاتھ میں ایک بت تھا' ابوجہل نے کہا کہ ایک دفعہ کہہ دو کہ ہاں یہ بھی کوئی معبود ہے اور اس میں بھی کوئی حقیقت ہے' لیکن حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے اس پر تھوک دیا۔ اس بدبخت نے غصے میں آ کر حضرت سمیہ کی شرم گاہ پر برچھا مارا اور انہیں شہید کر دیا (حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اسلام کی پہلی شہید خاتون ہونے کا شرف حاصل ہوا)۔ اسی طرح کا معاملہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی ہوا اور ان کو بھی بہت اذیت ناک طریقے سے شہید کیا گیا۔ ابوجہل نے چار طاقتور اونٹ لیے اور ان میں سے ایک کے ساتھ حضرت یاسر کا ایک ہاتھ' دوسرے کے ساتھ دوسرا ہاتھ' تیسرے کے ساتھ ایک ٹانگ اور چوتھے کے ساتھ دوسری ٹانگ باندھ دی اور پھر چاروں اونٹوں کو مختلف سمتوں میں اس طرح دوڑایا کہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہما کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔

دین میں عزیمت بھی ہے اور رخصت بھی

حضرت یاسر اور سمیہ رضی اللہ عنہما تو اتنے بدترین جبر کی حالت میں بھی ثابت قدم رہے اور موت کو سینے سے لگا لیا' لیکن کلمۂ کفر نہیں کہا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نوجوان تھے' وہ اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکے اور کلمۂ کفر کہہ کے جان بچا لی۔ اب اُن پر پشیمانی طاری ہوئی کہ یہ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ اس پر انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ دیا اور کہا کہ اب تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی آ کر مجھے یہاں سے کھولیں گے' ورنہ میں یہیں پر جان دے دوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپؐ آئے اور اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا اور فرمایا کہ اونچا ترین مقام تو تمہارے ماں باپ لے گئے اور جو تم نے کیا تو اس کی بھی اجازت ہے۔ چنانچہ جس پر اس درجے جبر کیا گیا ہو تو وہ کلمہ کفر کہہ کر اپنی جان بچا سکتا ہے' یہ جائز ہے اور اس کی رخصت ہے۔ چنانچہ دین میں رخصت بھی ہے

اور عزیمت بھی۔ عزیمت والے تو روشن چراغ بن جاتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے تذکرے سے دلوں کے اندر ایمانی جذبات اُبھرتے ہیں۔ دوسری طرف رخصت والے اگرچہ اُس اونچے مقام کو حاصل نہیں کر پاتے جو عزیمت والوں کے حصہ میں آتا ہے، لیکن ان پر بھی کوئی الزام نہیں ہے، اس لیے کہ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔

اس حوالے سے سورۃ النحل کی یہ آیت بھی میں نے آپ کو ابتدا میں سنائی تھی: ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ ''جس کسی نے کفر کیا اللہ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد، سوائے اُس کے جسے مجبور کر دیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو'' ﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾﴾ ''مگر جس نے کھول دیا کفر کے ساتھ (اپنا) سینہ تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے، اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی کو اتنا مجبور کر دیا گیا ہو کہ اُس نے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دیا ہو تو اس کی اجازت ہے اور اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔

اضطراری حالت میں بھی رخصت ہے!

اب تک خارجی جبر کی بات ہوئی کہ ابوجہل ستا رہا تھا، اذیت دے رہا تھا، جان کے درپے تھا تو جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دیا۔ اسی طرح ایک داخلی جبر بھی ہے، وہ یہ کہ انسان بھوک سے مر رہا ہے، لیکن اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اس حالت کو اضطرار کہتے ہیں اور اضطراری حالت میں اگر انسان کوئی حرام چیز بھی کھا لے تو اس کی اجازت ہے، لیکن اس کے لیے دو شرائط ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون پانچ مرتبہ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ: ١٧٣) ''پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔ اس سے پہلے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ چیزیں حرام کر دی ہیں، مردار،

خون، خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا گیا ہو۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی اضطرار میں آ گیا ہو، مجبوری میں مر رہا ہو تو پھر وہ سور بھی کھا سکتا ہے، مردار بھی کھا سکتا ہے اور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے جانور کا گوشت کھا کر بھی اپنی جان بچا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں، ایک تو وہ اس حرام کی طرف رغبت اور میلان نہ رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ جان بچانے کے لیے جو ناگزیر مقدار ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔ ان دو شرطوں کے ساتھ حالت اضطرار میں جان بچانے کے لیے حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں فقہ کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے: ''الضرورات تبیح المحظورات'' یعنی جہاں مجبوریاں ہوگئی ہوں وہاں ممنوع چیزوں کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اضطرار کی حالت میں ہے۔ یہ نہیں کہ ذرا سی آسانی دیکھ لی یا ذرا سی مشکل آئی تو حرام میں منہ مار لیا۔ دل میں ایک خیال آیا کہ ہم اس وقت تک اپنا کاروبار وسیع نہیں کر سکتے جب تک سود کو کاروبار میں شامل نہ کریں...... تو اس کی کسی صورت اجازت نہیں ہے۔ البتہ بھوک سے مر رہے ہوں اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس صورت میں جان بچانے کے لیے حرام شے بھی حلال ہو جائے گی۔

دنیا کی بے ثباتی

اب اگلی حدیث کی طرف آتے ہیں۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جبکہ پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تھی، جن کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ دعا کی تھی: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ))(۱) ''اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور قرآن کی تاویل سکھا دے''۔ تفسیر میں ایک ایک لفظ کے لغوی و معنوی مفاہیم کے حوالے سے بات ہوتی ہے، جبکہ بحیثیت مجموعی اس آیت کا مدعا بیان کر دینا یہ تاویل ہے ــــ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے چار ''عبادلہ'' مشہور ہیں اور چاروں نوجوان ہیں۔ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم۔ زیر مطالعہ روایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے

(۱) مسند احمد، کتاب و من مسند بنی ھاشم، باب بدایة مسند عبداللہ بن العباس۔

بیٹے عبداللہؓ سے مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ میں حضور ﷺ کے اتباع کا بہت زیادہ جذبہ تھا۔ چنانچہ جو لوگ حدیث کا زیادہ ذوق رکھتے ہیں' ان کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ زیادہ ذہنی مناسبت ہوتی ہے۔ اس ذوقِ حدیث کے حوالے سے یہ بڑی پیاری حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِمَنْکِبَیَّ فَقَالَ: ''اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے میرے دونوں کندھوں سے پکڑا اور پھر فرمایا:

((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))

''دنیا میں ایسے رہو گویا تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر!''

دنیا سے تمہارا تعلق بس اسی قدر رہنا چاہیے۔ اس سے زیادہ اگر دنیا کے ساتھ دل لگا لیا تو تباہی اور بربادی ہے' اس لیے کہ یہ دنیا تو راہ گزر ہے' منزل نہیں ہے اور راہ گزر میں آدمی تھوڑی دیر آرام کے لیے کہیں بیٹھ سکتا ہے' لیکن وہاں مستقل ڈیرے نہیں لگا لیتا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے خود اپنے بارے میں یہ مثال دی: ((مَا لِی وَمَا لِلدُّنْیَا)) ''دیکھو لوگو! میرا دنیا سے کیا سروکار''۔ آپ ﷺ نے تو دنیا سے کوئی سروکار رکھا ہی نہیں۔ جب آپؐ عرب کے بادشاہ بن گئے تب بھی آپؐ کے ہاں تو کئی کئی وقت کا فاقہ ہوتا تھا۔ ((مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا))(۱) ''میں تو دنیا میں اس طرح ہوں کہ جیسے کوئی سوار کسی درخت کے نیچے سائے کی وجہ سے بیٹھ گیا' پھر وہاں سے روانہ ہو گیا اور درخت کو چھوڑ دیا''۔ درخت اس کی منزل نہیں ہے' اس کا گھر نہیں ہے۔ یہ تو اس کا عارضی سا قیام تھا جسے وہ یاد بھی نہیں رکھتا کہ میری زندگی کے اندر کوئی درخت بھی آیا تھا۔ بس صرف اس حد تک دنیا کے اندر دلچسپی کی اجازت ہے' اور اگر اس سے زیادہ ہے تو پھر یہ دھوکہ ہے۔

یہ دنیا' متاعِ غرور' متاعِ قلیل اور لہو ولعب ہے

قرآن مجید میں دنیوی زندگی کی بے ثباتی کو بیان کرنے کے لیے اسے مختلف القابات سے نوازا گیا ہے' مثلاً بعض مقامات پر اسے ''متاع الغرور'' (دھوکے کا سامان) کہا گیا

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی اخذ المال بحقہ۔

ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران: ۱۸۵ والحدید: ۲۰) ''اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے''۔ علامہ اقبال کی ایک بڑی پیاری نظم ہے، جس کا پہلا مصرع ہے: ''خودی کا سرِنہاں لا الٰہ الا اللہ'' اور اس میں یہ مصرع بھی ہے ع ''کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا!'' —— دیکھو تم اس متاعِ غرور یعنی دھوکے کے سامان کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہو جو تمہیں آخرت سے غافل کر رہا ہے۔ ہاں دنیا اگر اس حیثیت میں ہو کہ آخرت سے غافل نہ کر پائے تو دنیا میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے: ((اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ))(۱) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے نا! اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جو لوگ ترکِ دنیا کر کے بیٹھ گئے وہ تو یہاں کچھ کاشت ہی نہیں کر رہے تو وہ وہاں کون سی فصل کاٹیں گے؟ لہٰذا دنیا کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے یہاں اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔

اسی طرح سورۃ النساء میں دنیا کو ''متاعِ قلیل'' قرار دیا گیا ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ﴾ (آیت ۷۷) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے دنیا کا ساز و سامان بہت تھوڑا ہے، اور آخرت بہت بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ کی روش اختیار کرے''۔ یہی مضمون سورۃ الرعد میں بایں الفاظ بیان ہوا: ﴿وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور یہ لوگ مگن ہیں دنیا کی زندگی پر، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے تھوڑے سے فائدے کے۔''

میرے نزدیک سورۃ العنکبوت کی آیت اس معاملے میں سب سے اوپر ہے جس میں اس دنیا کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے، فرمایا: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ﴾ ''اور نہیں ہے یہ دنیا کی زندگی مگر لہو اور لعب''۔ لعب کہتے ہیں کھیل کود کو اور لہو کے اندر کچھ نہ کچھ تلذذ کی کیفیت (sensual gratification) بھی آ جاتی ہے۔

---

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی ۴/۲۴۔ وقال: لم اجده لهذا اللفظ مرفوعا۔

ایک بچہ کھیل رہا ہے اور اس کے کھیل کے اندر اس کی نفسانیت اور شہوت کا کوئی دخل نہیں ہے تو یہ لعب ہے' لیکن جب اس میں شہوانیت کا حصہ بھی شامل ہو جائے تو وہ لہو بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دنیا کی زندگی سوائے لہو اور لعب کے اور کچھ نہیں ہے۔ ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''اور آخرت کا گھر ہی یقیناً اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

سورة الاعلیٰ میں فرمایا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی'' —— ایثار کہتے ہیں کسی چیز کو دوسری پر ترجیح دینا۔ ہم اردو میں بولتے ہیں ایثار کرو' یعنی اپنے مفاد پر دوسروں کے مفاد کو مقدم رکھو۔ ایک شخص مذہبی کام بھی کر رہا ہے' نماز روزہ کا بھی پابند ہے' تو اصل جانچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا اس کی زندگی یہ ثبوت دے رہی ہے کہ وہ آخرت کو ترجیح دے رہا ہے یا دنیا کو؟ دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنی بہتر سے بہتر صلاحیت دنیا کے لیے استعمال کر رہا ہے یا آخرت کے لیے؟ اگر اس کی زیادہ توجہ آخرت کے حق میں ہے تو تہنیت ہے' مبارک باد ہے اور اگر دنیا کے لیے ہے تو معاملہ تشویش ناک ہے۔

بعض بزرگوں نے انسان اور دنیا کی مثال اس طرح دی ہے کہ دنیا اور انسان کا معاملہ ایک کشتی کا سا ہے۔ کشتی پانی کے اوپر چل رہی ہے تو معاملہ درست ہے' لیکن اگر پانی کشتی میں آ گیا تو تباہی و بربادی ہے۔ اسی طرح تم دنیا میں تو رہو' لیکن تمہارے دل میں دنیا نہیں آنی چاہیے۔ دنیا میں ایسے رہو کہ ع ''بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں!''

''اسلام اجنبی تھا اور عنقریب اجنبی ہو جائے گا!''

زیر مطالعہ اربعین کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))۔ اب یہ غریب کا لفظ بھی بڑا عجیب ہے۔ غریب کہتے ہیں اجنبی کو —— ایک شخص عین مجمع کے اندر رہتے ہوئے بھی غریب ہو سکتا ہے' اسے کوئی پہچانتا ہی نہ ہو اور نہ وہ کسی کو جانتا ہو' تو اسے کہیں گے کہ مجمع میں غریب ہے۔ ایسا بھی ہوتا

ہے کہ ایک بندۂ مؤمن کسی ایسے ماحول میں رہ رہا ہوتا ہے کہ اُس کے دل کو جو لگن لگی ہوئی ہے وہ کسی اور کے دل میں نہیں ہے۔ سب دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور اسے آخرت کی فکر ہے تو یہ بھی اس ماحول میں اجنبی ہو جائے گا۔

لفظ غریب کے حوالے سے ایک بڑی عظیم حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ، فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ))(۱) ''اسلام اپنے آغاز میں اجنبی تھا اور عنقریب وہ اجنبی ہو جائے گا جیسا کہ ابتدا میں تھا، پس خوشخبری ہے اجنبیوں کے لیے''۔ اسلام کا جب آغاز ہوا تو اسلام اجنبی تھا، غریب تھا۔ کوئی اسلام لے آتا تھا تو کفارِ مکہ کہتے تھے کہ اس کی مت ماری گئی ہے۔ مدینہ کے منافق بھی ایمان لانے والوں کو بیوقوف کہا کرتے تھے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ، جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں''۔ جیسے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی ایمان لائے ہیں، حمزہ، طلحہ اور زبیر ایمان لائے ہیں (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) تو تم بھی انہی کے نقش قدم پر چلو۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے: ﴿اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ''کیا ہم اس طور سے ایمان لے آئیں جیسے ان بیوقوفوں نے اسلام قبول کیا ہے؟'' یہ تو بیوقوف ہیں کہ ایمان لانے کے بعد انہیں کسی چیز کی فکر ہی نہیں ہے۔ نہ دائیں کی فکر، نہ بائیں کی، بس ان کا مقصد تو اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے احکامات کو ماننا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ یہ بات آج بھی کہی جاتی ہے کہ یہ لوگ دین کے کام میں لگ گئے ہیں۔ یہ سوچتے ہی نہیں کہ ہماری بیٹیاں بھی گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں جن کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں تو اس کے لیے کچھ پیسے جمع کریں۔ لہٰذا یہ تو بیوقوف (سُفَهَا) ہیں۔ یہ تو fanatics ہیں، شدت پسند ہیں، انتہا پسند ہیں۔ یہ سارے الفاظ اصل میں اسی لفظ (سُفَهَاء) کی شرح ہے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ)) ''اسلام اپنے آغاز میں اجنبی تھا اور عنقریب وہ اجنبی ہو جائے گا جیسا کہ آغاز میں تھا''۔ یہ ایک

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الاسلام غریبا وسیعود غریبا.....

بہت بڑی حقیقت ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کیا ہے۔ یہ کب ہوگا اس بارے میں سمجھ لیجیے۔ لفظ ''سَ'' عربی میں مستقبل قریب کے لیے آتا ہے اور مستقبل بعید کے لیے ''سَوْفَ'' آتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے: ﴿سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ کہ ابھی تو تمہاری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں' لیکن ایک وقت آئے گا کہ تمہاری آنکھوں سے پردے اُٹھ جائیں گے اور حقیقت تمہارے سامنے منکشف ہو جائے گی۔ اُس وقت کے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے اور تمہارے پاس کچھ مہلت موجود ہے۔ لیکن سین (سَ) مستقبل قریب کے لیے آتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ)) کہ عنقریب اسلام دوبارہ اجنبی ہو جائے گا ایسے ہی جیسے کہ پہلے تھا۔ یہ بڑی عظیم تاریخی حقیقت ہے۔ خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد اسلام زوال پذیر ہوا اور آج تک زوال پذیر ہے۔ اگرچہ عربوں کو بڑی عظمت حاصل ہوئی کہ پہلے بنوامیہ کی سلطنت قائم ہوئی اور پھر بنوعباس کی عظیم سلطنت' جو اُس وقت دنیا میں سب سے بڑی سلطنت تھی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اسلام غریب تھا۔ اس وقت جس کی لاٹھی' اس کی بھینس اور جس کی طاقت' اس کی حکومت کا معاملہ تھا۔ جبکہ اسلام کے اصول ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔

فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ

اس حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے دین کے اجنبیت کے دور میں دین سے چمٹے رہنے والوں کو مبارک باد بھی دی ہے: ((فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) ''تو مبارک باد اور تہنیت ہے ان کے لیے جو خود غریب ہو جائیں''۔ یعنی جب اسلام غریب ہو جائے تو آپ اس کے دامن کے ساتھ چمٹے رہیں۔ چاہے دنیا کہے کہ ''ع' اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو!'' ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ اس دور میں پردے کی بات کرتے ہیں' ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس اعتبار سے اگر لوگ آپ سے نفرت بھی رکھیں تو اس کی پروا نہ کریں۔ جب میں نے پردے کی بات کی تو مجھے یہ خطاب ملا تھا:

The most hated person in the educated ladies of Pakistan.

پاکستان کی پڑھی لکھی خواتین میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت شخصیت!
یہ پردے کی بات کرتا ہے‘ یہ segregation کی بات کرتا ہے‘ یہ ستر کی بات کرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں آپ بالکل اجنبی ہو جائیں‘ اس لیے کہ ہمیں اجنبی رہنے کے اندر ہی عافیت نظر آتی ہے اور ہم کسی صورت زمانے کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اب ایسی صورتِ حال میں کسی بھی معاشرے کے اندر زندگی گزارنے کے دو انداز ہیں۔ ایک یہ کہ ع ''زمانہ با تو نسازد‘ تو با زمانہ بساز!'' یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہیں کرتا تو تم زمانے کے رنگ میں رنگے جاؤ۔ گویا ع ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!'' اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ''زمانہ با تو نسازد‘ تو با زمانہ ستیز!'' کہ اگر زمانہ تمہارے ساتھ ہم آہنگی نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ لڑو‘ زمانے کے خلاف جنگ کرو!

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو!

زیر مطالعہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کندھے سے پکڑ کر انہیں فرمایا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))۔ اس سے آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ اسے بھی ہم حدیث ہی کہیں گے ـــــ رسول اللہ ﷺ کا قول‘ فعل‘ اور آپ کی تقریر کو اصطلاحِ حدیث میں خبر (جمع اخبار) کہا جاتا ہے‘ جبکہ کسی صحابی کے قول‘ عمل‘ اور تقریر کو اثر (جمع آثار) کہا جاتا ہے۔ اگر خبر اور اثر کسی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ اثر بھی حدیث بن جائے گا ـــــ حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: اِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ ''دیکھو جب تمہیں شام ہو جائے تو صبح کا انتظار مت کرنا''۔ یہ نہ سمجھنا کہ صبح بھی لازماً ہو گی‘ کیا پتا رات کو ہی بلاوا آجائے۔ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ ''اور اگر صبح نصیب ہو جائے تو شام کا انتظار مت کرو''۔ یہ نہ سمجھنا کہ شام ضرور اسی دنیا کی زندگی میں آئے گی۔ اس درجے انسان دنیا سے ذہناً اور قلباً لاتعلق ہو جائے۔ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ ''اور اپنی صحت (جو اللہ نے دی ہے) میں سے اپنے مرض کے لیے کچھ بچا کر رکھ لو''۔ مریض بن جاؤ گے تو پھر کچھ نہیں کر سکو

گے' لہٰذا اللہ نے صحت دے رکھی ہے تو اسے غنیمت سمجھو اور آخرت کی کچھ تیاری کر لو۔
وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ ''اور اپنی زندگی سے موت کے لیے ساز و سامان پیدا کر لو۔''

اس مضمون کی حدیث اس سے پہلے بھی ہمارے بیان میں آ چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ ' وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ ' وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ ' وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ ' وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ))[1]

''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: (۱) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے' (۲) صحت کو بیماری سے پہلے' (۳) مالداری کو تنگ دستی سے پہلے' (۴) فراغت کو مشغولیت سے پہلے' اور (۵) زندگی کو موت سے پہلے۔''

آج جو دو احادیث ہمارے زیر مطالعہ تھیں' ان میں دین کے عملی نظام کے دو پہلو ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم' یقین قلبی والا ایمان' اور بحیثیت مؤمن جو ہمارے فرائض ہیں' ان کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

---

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان' راوی: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

حدیث 41

اطاعتِ رسول ﷺ ایمان کی علامت ہے

۱۵/اگست ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ (الفرقان)

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الجاثیہ)

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (النّٰزعٰت)

عَنْ اَبِيْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))(۱)

سیدنا ابومحمد‘ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی دلی خواہشات اس (شریعت اور دین) کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں!“

معزز سامعین کرام!

آج ہم اربعین نووی کی حدیث ۴۱ کا مطالعہ کر رہے ہیں ـــ جہاں تک ”اربعین“ کے نام کا تعلق ہے تو اُس اعتبار سے چالیسویں حدیث ہم گزشتہ جمعہ پڑھ چکے ہیں‘ گویا

(۱) رواہ فی ”شرح السنة“ وقال النووی فی ”الاربعین“ رویناہ فی ”کتاب الحجة“ باسناد صحیح۔ مشکاة المصابیح‘ کتاب الایمان‘ باب الاعتصام بالکتاب والسنة‘ الفصل الثانی

''اربعین'' کی تکمیل ہو چکی ہے' لیکن امام نوویؒ نے اس مجموعہ احادیث میں خود ہی دو حدیثوں کا اضافہ کیا ہے اور ان دو میں سے پہلی آج ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

عبادلۂ اربعہ رضی اللہ عنہم اور ان کا خاص طبعی رُجحان

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہاں میں معلوماتِ عامہ اور عمومی دلچسپی کے اعتبار سے یہ بتانا چاہوں گا کہ صحابہ کرامؓ کی دوسری نسل میں عبادلہ اربعہؓ بہت مشہور ہیں— دیکھئے ایک نسل میں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریباً ہم عمر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں' مثلاً حضرات ابوبکر' عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم' جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری نسل میں آئیں گے' اس لیے کہ جب ایمان لائے تو آپؓ کی عمر ۱۳ برس تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت ۳۰ برس کے لگ بھگ تھے۔ اس دوسری نسل میں پھر ذرا اور چھوٹے صحابہ بھی ہیں اور ان میں ''عبادلہ اربعہ'' بہت مشہور ہیں' جن میں سے ہر ایک کا اپنا ایک خاص طبعی رجحان اور خاص میلان ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور آپ کا خاص طبعی رجحان قرآن مجید کی تفسیر اور تاویل کی طرف تھا۔ انہی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ))(۱) ''اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور قرآن کی تاویل سکھا دے''۔ ایک ہے علم اور ایک ہے فہم۔ ہوسکتا ہے کسی کے پاس ٹنوں علم ہو' لیکن اس میں فہم نہ ہو' اور ہوسکتا ہے کہ وہ شخص اپنے علم سے کسی کو فائدہ نہ پہنچا رہا ہو' بلکہ اُلٹا دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہو۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فہم کی اسی اہمیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس نوجوان صحابی کے لیے فہم فی الدین کی دعا فرمائی۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: عبادلہ اربعہ میں سے دوسرے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور ان کا خاص وصف تھا اتباعِ سنّت' بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اندر غلو کی حد تک اتباعِ سنّت کا جذبہ تھا۔ اس کا اندازہ اس

(۱) مسند احمد' کتاب و من مسند بنی ھاشم' باب بدایة مسند عبداللّٰہ بن العباس۔

بات سے لگائیے کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد جب آپؓ دوبارہ حج کرنے گئے تو انہوں نے حضور ﷺ کے ہر ہر طریقے کی پیروی کی۔ مثلاً حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے جہاں جہاں قیام کیا' جہاں کسی درخت کے سائے میں آرام کیا' اور جس راستے سے ہو کر گزرے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی بعینہٖ اسی طرح آپ ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کی' انہی مقامات پر قیام کیا' انہی درختوں کے نیچے سے ہو کر گزرے۔ میں کہوں گا کہ یہ اصل میں مجذوب ہونے کی حد تک اتباعِ سنت کا جذبہ ہے' جو حضور ﷺ کی محبت کی وجہ سے ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ کو یہ واقعہ سنایا ہے کہ ایک بدوی صحابی حضور ﷺ سے ملنے کے لیے آئے تو اُس وقت اتفاقاً حضور ﷺ نے اپنی قمیص کے بٹن بند نہیں کر رکھے تھے۔ اُن بدوی صحابی نے آپ ﷺ کو اس طرح دیکھا تو پھر ساری عمر بٹن بند نہیں کیے۔ ہم کہیں گے کہ یہ محبتِ رسولؐ کی وجہ سے اتباع کا جذبہ تھا۔ بہرحال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا خاص وصف اور خاص رجحان اتباعِ رسولؐ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اہل حدیث مکتبِ فکر کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

(۳) <u>حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما:</u> عبادلہ اربعہ میں سے تیسرے عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ ان کا کوئی خاص علمی وصف نمایاں نہیں ہے' لیکن شجاعت اور بہادری کے اندر ان کا بڑا اونچا مقام ہے۔ چنانچہ یزید کی بیعت سے جن حضرات نے انکار کیا' ان میں یہ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل تھے۔ اُس وقت تین عبادلہ عبداللہ بن عباسؓ' عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ دونوں کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ یہ کام غلط ہوا ہے' لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی بنا پر فتنہ وفساد پیدا کر دیا جائے۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اگر بغاوت کریں گے تو مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوگی' انتشار پیدا ہوگا' جبکہ ساڑھے چار سال کی خانہ جنگی مسلمان پہلے ہی بھگت چکے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بلکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری تک مسلمانوں میں مسلسل خانہ جنگی رہی اور اس میں

ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں‘ نیزوں اور تیروں سے ہلاک ہوئے ۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مصلحت کو پیش نظر رکھا کہ اگرچہ کام غلط ہے لیکن ایسا غلط بھی نہیں ہے کہ کفر ہو‘ جس کے خلاف کھڑے ہو جانا فرض ہو جائے۔

بہرحال ان تین عبادلہ میں سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ڈٹ گئے کہ ہاں یہ غلط بھی ہے اور ہمیں اس کے خلاف مزاحمت بھی کرنا ہے‘ چاہے کچھ بھی ہو۔ پھر حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ میں اس حوالے سے اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت حسینؓ کو چونکہ اہلِ کوفہ کی طرف سے خطوط آ رہے تھے تو وہ کوفہ چلے گئے‘ جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی رائے یہ تھی کہ حجاز ہی میں مقیم رہ کر مزاحمت کی جائے‘ اس لیے کہ یہاں پر ہمارا حلقۂ اثر مضبوط ہے۔ وقت نے ثابت کیا کہ ان کی رائے زیادہ صحیح تھی‘ اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں حکومت قائم کی اور پھر ان کی حکومت چھ سال تک قائم بھی رہی۔ دوسری طرف حضرت حسینؓ حکومت قائم نہیں کر سکے‘ بلکہ انتہائی مظلومی کی حالت میں کربلا میں شہید ہو گئے۔

(۴) <u>حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما</u>: عبادلہ اربعہ میں سے چوتھے عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ ہیں — واضح رہے کہ ''عَمرو'' عین کی زبر کے ساتھ ہے جبکہ واؤ ساکت (silent) ہے — حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا خاص وصف زہد اور عبادت ہے‘ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس میں غلو کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہی کے بارے میں وہ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ کو کسی نے اطلاع دی کہ عبداللہ تو ہر روز روزہ رکھتا ہے اور ساری رات عبادت کے لیے کھڑا رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے طلب فرمایا اور پوچھا: ((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) ''کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ تم رات بھر قیام کرتے ہو اور روزانہ دن کو روزہ رکھتے ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ، قُمْ وَنَمْ، وَصُمْ وَاَفْطِرْ، فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ

حَقًّا......))[1] ''تو ایسا مت کرو' (رات کو) قیام بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو' اور (نفلی) روزے رکھا بھی کرو اور چھوڑ بھی دیا کرو' اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری آنکھ (نیند) کا بھی تم پر حق ہے' تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے......''

بہرحال ان کا خاص وصف زہد اور عبادت ہے۔ ایک خاص قابل ذکر تضاد (contrast) یہ ہے کہ ان کے والد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بہادری' شجاعت' موقع شناسی' سیاست اور ڈپلومیسی میں بہت مشہور ہیں — ڈپلومیسی دراصل وقت کی نزاکت اور مصلحت کو سمجھنے اور دور اندیشی کے ساتھ معاملہ کرنے کا نام ہے۔ آج کل ڈپلومیسی کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے اور آج منافقت کا نام ڈپلومیسی ہوگیا ہے' لیکن ڈپلومیسی کا اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان سیاست کے رموز سے واقف ہو' حالات کا بھی صحیح اندازہ کر سکے اور صحیح وقت پر صحیح فیصلے تک پہنچے — بہرحال حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ شجاعت اور سیاست میں مشہور ہیں جبکہ ان کے بیٹے عبداللہ انتہائی زاہد و عابد ہیں۔ انہیں تو دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں' تو ان کی سیاست سے کیا دلچسپی ہوگی؟ تو یہ تضاد ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عرب کے ایک بڑے مدبر اور سیاست دان مانے جاتے تھے' یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے تو ان کو واپس لانے کے لیے سردارانِ مکہ نے عمرو بن العاص کو ہی نجاشی کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ انہوں نے نجاشی کے دربار میں جا کر کہا کہ ہمارے کچھ بھگوڑے آپ کے ہاں آ گئے ہیں اور انہوں نے آپ کے علاقے میں پناہ لے لی ہے' آپ انہیں واپس کر دیں۔ عمرو بن العاص نے اس کی مذہبی عصبیت کی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو انسان مانتے ہیں اور تم انہیں خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ اب نجاشی نے صرف ان کی بات سن کر فیصلہ نہیں کیا بلکہ انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے

---

(١) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجك علیك حق۔

مسلمانوں کے وفد کو بلایا اور پوچھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تمہارا کیا موقف ہے؟ اس پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کا دوسرا رکوع پڑھ کر سنایا تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے تخت سے نیچے اُترا اور زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ جو کچھ ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کہا گیا ہے' آپؑ اس سے ایک تنکا بھر بھی زائد نہیں ہیں۔ نجاشی قرآن کی حقانیت اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لے آیا۔ چنانچہ نجاشی کا شمار اہلِ ایمان میں ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے ان کی وفات پر ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی ادا کی۔ لیکن ان کا شمار صحابہ میں نہیں ہوتا' اس لیے کہ وہ حضور ﷺ کی زیارت نہیں کر سکے' البتہ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے' کیونکہ وہ حضور ﷺ کے صحابہ کی صحبت میں رہے ہیں۔

لَا یُؤْمِنُ سے شروع ہونے والی تین مشہور احادیث

آج کی زیرِ مطالعہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ))

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

اس ضمن میں ایک دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ''لَا یُؤْمِنُ'' سے شروع ہونے والی تین احادیث بہت معروف اور مشہور ہیں۔ پہلی حدیث ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))(۱)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اپنے باپ سے بھی' اپنے بیٹے سے بھی' اور تمام انسانوں سے بھی۔''

دوسری حدیث یوں ہے:

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول ﷺ من الایمان۔

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ))(۱)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے (مؤمن) بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

اسی کے تحت درحقیقت دعوت وتبلیغ کا جذبہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حق روشن کر دیا ہے تو میرا بھائی بھی اس سے محروم نہ رہے۔

لَا یُؤْمِنُ سے شروع ہونے والی تیسری حدیث آج ہمارے زیرِ مطالعہ ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ))

''تم میں سے کوئی شخص حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس تابع نہ ہو جائے اس کے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

لَا یُؤْمِنُ کا مفہوم

یہ تین احادیث ہیں جو لَا یُؤْمِنُ سے شروع ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ لَا یُؤْمِنُ کا لفظی ترجمہ ''مؤمن نہیں ہوسکتا'' اس کو قانونی معنی میں نہیں لیا جاسکتا کہ ایسا کرنے والے سے ایمان ہی کی نفی کر کے اس پر کافر کا لیبل لگا دیا جائے۔ اربعین نووی کی حدیث ۳ ''حدیثِ جبریل'' کا مطالعہ ہم نے پانچ خطاباتِ جمعہ میں کیا تھا۔ وہاں ہم نے سمجھا تھا کہ قانونی ایمان اور ہے' حقیقی ایمان اور' اسی طرح قانونی اسلام اور ہے' حقیقی اسلام اور۔ ان کو دو علیحدہ علیحدہ categories میں سمجھنا ضروری ہے۔ لَا یُؤْمِنُ کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو گیا' بلکہ ایسی حدیثوں میں ایمان کے نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی نہیں ہے۔ عام طور پر علماء لَا یُؤْمِنُ کا ترجمہ ''اس کا ایمان کامل نہیں ہے'' کر دیتے ہیں' اس سے مجھے اختلاف ہے' اس لیے کہ اس سے انسان کی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ کامل ایمان ہونا تو بہت اونچے درجے کی بات ہے' میرے لیے نیچے درجے کا ایمان ہی کافی ہے' چنانچہ اس لفظ سے انسان کے اندر جو تشویش پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔

((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ قِیْلَ مَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ پوچھا گیا کہ حضورؐ کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ))(۱) ''وہ شخص کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانی سے امن میں نہیں ہے''۔ اب یہ گناہ کبیرہ بھی نہیں ہے بلکہ اسے کج خلقی اور بداخلاقی سمجھ لیجیے۔ اس کے باوجود یہاں تین دفعہ قسم کھا کر لَا یُؤْمِنُ کہا گیا تو اس انداز اور اسلوب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو گیا۔ اور اس کا یہ مفہوم بیان کرنا کہ اس کا ایمان کامل نہیں ہے' پھر کامل نہیں ہے' پھر کامل نہیں ہے تو اس سے حدیث کے اندر تشویق و ترغیب کا جو پہلو ہے اور جو زور ہے وہی ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کا مناسب ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ شخص حقیقتاً مؤمن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانیوں سے محفوظ نہ ہو۔

حقیقتاً مؤمن اور مسلمان ہونا اور بات ہے' جبکہ قانوناً مؤمن اور مسلمان ہونا اور ہے' اور اس کا دارومدار اقرار باللسان پر ہے کہ آپ نے زبان سے کہہ دیا: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور آپ دین کی کسی بنیادی بات کا انکار نہیں کرتے تو آپ قانوناً مسلمان شمار ہوں گے۔ خواہ آپ فاسق ہیں' فاجر ہیں' گناہ گار ہیں' جو بھی ہیں مگر آپ کا شمار مسلمانوں میں ہوگا۔ آپ چوری کریں گے تو ہاتھ کٹ جائے گا مگر مسلمان رہیں گے۔ زنا کریں گے تو شادی شدہ ہونے کی حالت میں رجم کر دیے جائیں گے' لیکن اس صورت میں بھی آپ مسلمان رہیں گے اور آپ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ ایک ہے قانونی ایمان اور ایک ہے حقیقی ایمان اور ان دونوں میں فرق و تفاوت نہ کرنے سے بڑے بڑے مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا لَا یُؤْمِنُ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ شخص حقیقی مؤمن نہیں ہے۔

ہوائے نفس کے درجات

زیر مطالعہ حدیث میں لفظ ھَوًی آیا ہے' اردو میں ہم اس کے لیے ہوائے نفس

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔

(خواہش نفس) بولتے ہیں۔ ہوائے نفس کے دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ ہے کہ جو جبلی طور پر انسان کے تقاضے ہیں جسے جدید سائیکالوجی میں فرائڈ کی اصطلاحات میں idd یا libido کہتے ہیں۔ جبلی طور پر انسان کو بھوک لگتی ہے تو وہ کھانا کھاتا ہے' اگر اس کو جنسی خواہش (sexual urge) ہے تو وہ شادی کرتا ہے یا پھر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ آرام بھی انسانی جسم کا تقاضا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ آرام چاہیے۔ اسی طرح اور بھی انسان کے جبلی تقاضے ہیں۔ یہ جبلی تقاضے بھی خواہش نفس میں آتے ہیں لیکن ان کو کنٹرول کرنا ہے۔ رمضان کے مہینے کا مقصد ہی نفس کی تربیت کرنا اور نفس کو کنٹرول کرنا ہے۔ اسلام میں نفس کو کچلنے کا تصور نہیں ہے' اس لیے کہ نفس کو کچلنا رہبانیت ہے اور ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) ''اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔''

خواہشِ نفس کا ایک دوسرا مرحلہ بھی ہے۔ دیکھئے ایک ہے زندہ رہنے کے لیے کھانا اور ایک ہے لذت کے لیے انواع واقسام کے کھانوں کا لطف اٹھانا' تو یہ اسراف ہے۔ اسی طرح کپڑے آپ کی ضرورت ہیں' لیکن یہ کہ الماریاں کپڑوں سے بھری ہوئی ہوں' یہ غلط ہے' تعیش اور عیش پسندی ہے۔ اس دوسرے والے مرحلے پر آ کر نفس گویا باغی ہو جاتا ہے اور وہ پھر انسان کا مخالف اور دشمن بن جاتا ہے۔

ہوائے نفس کو معبود بنالینا

نفس یا ہوائے نفس کی خرابی کے معاملے کو قرآن مجید نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے اور اس ضمن میں سخت ترین انداز سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (آیت ۴۳) ''(اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے''۔ وارننگ اور خبردار کرنے کے لیے یہ سخت ترین الفاظ ہیں۔ یعنی کوئی زبان سے تو کہہ رہا ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں' جبکہ حقیقت میں اس نے اپنے نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ اگر تو آپ خواہشِ نفس کے مکمل غلام ہو گئے بایں طور کہ خواہش نفس کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں' یہ دیکھے بغیر کہ کیا حلال ہے کیا حرام' تو اس اعتبار سے گویا نفس ہی آپ کا معبود ہے۔ کہنے کو تو کہہ

رہے ہو کہ میں اللہ کو معبود مانتا ہوں' لیکن درحقیقت آپ اپنے نفس کے بندے ہیں۔آپ خواہشِ نفس کی پوجا کرنے والے ہیں اور نفس و خواہشات کے پرستار اور پجاری بن چکے ہیں۔

اس موضوع پر میری تفصیلی گفتگو ''حقیقت واقسامِ شرک'' کے عنوان سے چھ گھنٹوں پر مشتمل خطابات کی صورت میں موجود ہے (جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہے)۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں وہ بہت سے لوگوں کے لیے بہت مفید ہوگی۔ہم نے تو شرک صرف بت پرستی کو سمجھا ہوا ہے یا بہت موحد ہو جائیں تو قبر پرستی کو شرک مانتے ہیں' حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے شرک ہیں۔نفس پرستی بھی شرک ہے' دولت پرستی بھی شرک ہے۔حضورﷺ نے فرمایا:((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))(۱) ''ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔نام تو عبدالرحمٰن ہے لیکن حقیقت میں عبدالدینار ہے اور خواہش یہ ہے کہ دینار آنے چاہئیں' چاہے حلال سے ہو یا حرام سے' لہٰذا اس کا معبود تو رحمٰن نہیں' دینار ہوا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر لکشمی دیوی کسی پر مہربان ہو جائے تو بہت دولت ملتی ہے' لہٰذا وہ اسے پوجتے ہیں۔ہم نے اُن سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر کہا کہ اس دیوی کو درمیان سے ہٹاؤ' ہم براہِ راست دولت کو پوجیں گے۔اللہ اللہ خیر صلا!

اب جو شخص اس حد تک خواہشِ نفس کے پیچھے چلنے والا بن جائے تو اس کے بارے میں فرمایا:﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ ''(اے نبیﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے''۔﴿اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝۴۳﴾ ''تو کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری لے سکیں گے''۔فرض کیجیے کہ ایسا شخص قیامت کے دن آپﷺ کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر آئے تو کیا آپ ایسے شخص کی شفاعت کریں گے' کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری قبول کریں گے؟

میں نے بارہا کہا ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ یہ جو نفس اور خواہشِ نفس کو معبود بنا لینے کا مضمون ہے' یہ پھر سورۃ الجاثیہ میں بھی آیا ہے اور

(۱) صحيح البخاري' كتاب الرقاق' باب ما يتقى من فتنة المال۔

یہاں بات بہت سخت ہوگئی۔ فرمایا: ﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ (آیت ۲۳) ''(اے نبی ﷺ!) کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا اور اللہ نے اسے گمراہ کر دیا اس کے علم کے باوجود''۔ یعنی عالم تو بہت بڑا ہے لیکن نفس کا پجاری ہے' یا علم سے مقصود مال و دولت کا حصول ہے یا علم کے ذریعے سے اُمراء کی ہم نشینی اور قرب اختیار کرنا اور ان سے فائدے اٹھانا اس کا مقصد ہے۔ اگر علم کا یہ مقصد ہے تو ایسا شخص علم کے باوجود گمراہ ہو جائے گا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو اہل کتاب کے بڑے بڑے احبار و رہبان اس وقت موجود تھے اور وہ اپنے علم کے باوجود حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ حالانکہ قرآن گواہی دیتا ہے: ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ﴾ (البقرة: ١٤٦) ''وہ آپ ﷺ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں''۔ لیکن ایمان نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ حضور ﷺ پر ایمان لانے سے ہماری سیادت' ہماری چودھراہٹ' ہماری مسندیں ساری داؤ پر لگ جائیں گی۔ اب تو ہمارے فتوے پر لوگ عمل کرتے ہیں' ہمارے ہاتھ چومتے ہیں' ہمیں نذرانے دیتے ہیں' تو یہ سارا کچھ ختم ہو جائے گا' چنانچہ وہ اپنے علم کے باوجود ایمان نہیں لائے۔

اس حوالے سے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں کہ نجران سے عیسائیوں کا ایک بڑا وفد آیا تھا اور اس نے کئی دن مدینہ منورہ میں مقیم رہ کر حضور ﷺ سے مباحثہ کیا۔ جب کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے تو مباہلے کی آیت نازل ہوگئی کہ اب دلیل ختم ہوئی' آؤ اب مباہلہ کرلیں۔ مباہلے میں کہتے ہیں کہ اے اللہ! اگر یہ چیز حق ہے تو ہمیں تباہ کر دے۔ چونکہ ان پر حق واضح ہو چکا تھا تو اس کے لیے وہ تیار نہیں ہوئے' بلکہ راتوں رات چلے گئے۔ واپسی پر ایک واقعہ پیش آیا۔ اس وفد میں دو بھائی تھے۔ چلتے چلتے ایک بھائی کی سواری نے ٹھوکر کھائی تو اُس نے کہا: تَعِسَ الْاَبْعَدُ ''ہلاک ہو جائے وہ دور والا''۔ دوسرے بھائی نے پوچھا کہ اَلْاَبْعَد سے تمہاری مراد محمد (ﷺ) ہے؟ اس نے کہا: نہیں' وہ تو اللہ کے نبی ہیں۔ اُس نے پوچھا کہ پھر ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اس نے کہا کہ شہنشاہِ

روم ہرقل نے ہمیں بہت سی مراعات دے رکھی ہیں اور اُن کی وجہ سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہیں' اگر ہم محمد (ﷺ) پر ایمان لے آئیں تو وہ سب فائدے ہمارے ہاتھ سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ علم کے باوجود گمراہی ہے' اس لیے کہ یہاں خواہشِ نفس اور اپنے دنیوی مفادات معبود ہیں۔ اپنی حیثیت' اپنا مقام' اپنا مرتبہ' اپنی وجاہت' اپنا اقتدار حق کے قبول کرنے میں آڑے آ رہا ہے۔ یہی درحقیقت اپنے نفس کو معبود بنانا ہے۔

سرکشی کرنے اور نفس کی پیروی سے بچنے والوں کا انجام

خطاب کے آغاز میں' میں نے سورۃ النازعات کی آیات آپ کو سنائیں جن میں تقابلی انداز میں اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۞......﴾ ''پس جس نے سرکشی کی......'' یہاں دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے' ان میں سے ایک وہ ہیں جو طغیانی و سرکشی پر اُتر آئے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات نہیں مانیں گے ـــــ طَغٰی کا معنی ہے بڑھ جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ دریا میں طغیانی آ گئی تو اس کا معنی یہ ہے کہ دریا اپنی حدود سے نکل کر اِدھر اُدھر تباہی پھیلا رہا ہے' کھڑی فصلیں تباہ ہو رہی ہیں' گاؤں بہہ رہے ہیں' یہ طغیانی ہے۔ اسی طرح نفس کی سرکشی اور نفس کا اکڑنا یہ ہے کہ وہ شریعت کا اتباع کرنے سے انکار کر دے اور حد سے باہر نکل جائے۔﴿وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞﴾ ''اور اس نے ترجیح دی دنیا کی زندگی کو''۔ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا:﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۞﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی''۔ چنانچہ جس شخص کے اندر اللہ' اللہ کے رسول (ﷺ) اور اللہ کے احکام و قوانین کے خلاف طغیانی و سرکشی ہے اور پھر وہ شخص دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دے رہا ہے تو اس کا انجام یہ ہے:﴿فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۞﴾ ''تو یقیناً اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

دوسری قسم کے لوگوں کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا:﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہونے سے'' یعنی

اسے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال و افعال کی جواب دہی ہونی ہے' تو یہ سوچ کر وہ کانپتا رہا' لرزتا رہا۔ ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾﴾ ''اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے''۔ یعنی نفس کی لگام کھینچ کر رکھی اور اسے قابو میں رکھا۔ ایسے شخص کا انجام یہ ہوگا کہ: ﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ ''تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے''۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ' اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ !

جائز خواہشات کو جائز طریقے سے پورا کرنا

انہی آیات کی بہترین ترجمانی حضور ﷺ کی ایک اور حدیث میں ہے اور وہ حدیث بھی زیرِ مطالعہ حدیث کی طرح جوامع الکلم میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))[۱] ''(صحیح معنوں میں) سمجھدار اور عاقل آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنے تابع اور مطیع رکھے اور عمل کرے موت کے بعد کے لیے''۔ یعنی وہ خود نفس کے تابع اور مطیع نہ ہو جائے' اور عمل کرے موت کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی کے لیے۔

دنیا میں اپنی جائز ضروریات کو پورا کرنے اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے عمل کرنے کی نفی نہیں ہے' یہ تو کرنا ہی ہے' لیکن یہ سب حلال کے دائرے میں رہتے ہوئے ہونا چاہیے — یاد رکھیے کہ جائز ضروریات کو حلال و جائز طریقے سے پورا کرنا بہت اجر و ثواب کا باعث ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ))[۲] ''ایسا تاجر جو سچا ہے' امانت دار ہے' اس کو تو قیامت کے دن انبیاء' صدیقین اور شہداء کی معیت حاصل ہوگی''۔

یہ صحیح ہے کہ اس دنیا کے لیے بھی کام کرو' لیکن اصل کام موت کے بعد کے لیے ہونا چاہیے۔ آپ کی بہتر صلاحیتیں آخرت کے لیے لگنی چاہئیں' اس لیے کہ آخرت کی زندگی تو

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القیامة والورع والرقائق' باب منه۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب البیوع' باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی بایاھم۔

ابدی ودائمی ہے۔ چنانچہ اگر آپ دنیا اور آخرت کی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے باہمی نسبت وتناسب سے کام کر رہے ہیں تو پھر تو ٹھیک ہے اور اگر صرف انگلی کٹوا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کے مصداق آخرت کے لیے بس برائے نام سعی وجُہد ہے' جبکہ باقی ساری جِدّوجُہد' ساری محنت' بھاگ دوڑ' سوچ بچار دنیا کے لیے ہے تو ایسی صورتِ حال میں دنیا آپ کی معبود بن گئی ہے۔ حالانکہ دنیا کے لیے صرف ضروریات کی حد تک معاملہ کرنے کی اجازت ہے اور اسی کی طرف رسول اللہ ﷺ نے بایں انداز اشارہ فرمایا: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى))[1] کہ اگر دنیوی ضروریات کے لیے بہت تھوڑا بھی انسان کو مل جائے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور انسان کو آخرت سے غافل کر دے۔ ظاہر بات ہے کہ جب مال ودولت کی زیادتی ہو گی تو آپ اللہ سے غافل ہو جائیں گے' لیکن اگر مال اور آسائشیں کم ہوں گی تو آپ اللہ کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ جیسے انجیل کی افتتاحی دعا میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ ''ہماری آج کی روزی ہمیں آج عطا فرما' کل کی روزی ہمیں کل دیجیو!'' چنانچہ جس مقدار سے انسان کی ضرورت پوری ہو جائے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے تو وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور اللہ سے غافل کر دے۔

اتباعِ ہوائے نفس سے بچنا لازم ہے!

قرآنِ مجید میں ''اتباعِ ہوا'' یعنی خواہشاتِ نفس سے بچنے کا حکم کئی مرتبہ آیا ہے۔ میں ان میں سے چھ آیات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں:

(۱) الاعراف: ۱۷۶: پہلی آیت سورۃ الاعراف کی ہے اور یہ بَلعَم بن باعوراء کے تذکرے میں آئی ہے۔ بَلعَم بن باعوراء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک عالم' زاہد اور صاحبِ کرامت بزرگ تھا' لیکن اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے چلا اور شیطان کا چیلہ بن گیا تو وہ بدترین انجام کا حق دار ٹھہرا۔ وہاں الفاظ آتے ہیں: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا

(۱) مسند احمد' کتاب مسند الانصار' باب باقی حدیث ابی الدرداء۔

﴿وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ﴾ (آیت ۱۷۶) ''اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیات) کے ذریعے سے اسے اور بلند کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف ہی دھنستا چلا گیا اور اس نے پیروی کی اپنی خواہشات کی''۔ ہمارا حیوانی وجود زمین سے آیا ہے اور اس کے سارے تقاضے بھی زمین سے پورے ہوتے ہیں۔ کھانے کے لیے جو کچھ اُگ رہا ہے وہ زمین سے اُگ رہا ہے۔ آپ نے اگر بکری کا گوشت کھایا ہے تو بکری نے بھی گھاس' پتے ہی کھائے ہیں جو زمین میں اُگے ہیں اور پھر انہی سے گوشت بنا ہے۔ چنانچہ ہماری اصل (origin) زمین سے ہے اور اسی سے ہماری غذائی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ پھر جب یہ نفس ہم پر حاوی ہو جائے تو ہم نیچے بیٹھتے چلے جاتے ہیں' زمین میں دھنستے چلے جاتے ہیں' یعنی ہم اپنی خواہش نفس کے مطیع بن جاتے ہیں۔

(۲) الکہف: ۲۸: اتباعِ ہوائے نفس کے حوالے سے دوسری آیت سورۃ الکہف کی ہے جس میں خاص طور پر حضور ﷺ سے خطاب ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے''۔ ویسے تو جو بھی ایمان لا رہا ہے' چاہے وہ غریب ہو' مسکین ہو' غلام ہو' سر آنکھوں پر اور اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کو یہ تعلیم دی گئی: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾﴾ (الحجر) ''اور اہلِ ایمان کے لیے اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھیے''۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اُمراء میں سے کوئی ایمان لے آئے تو ان فقراء اور غلاموں کی مشکلیں بھی آسان ہو جائیں گی' لہٰذا امراء کی طرف حضور ﷺ خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ اسی ضمن میں وہ واقعہ پیش آیا عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا' جس پر گرفت ہوگئی:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ

تَلَهّٰى ۝۱۰﴾ (عبس)

''تیوری چڑھائی اور منہ پھیرلیا' اس بات پر کہ آیا اُس کے پاس نابینا۔ اور (اے نبی ﷺ) آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا' یا وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اس کے لیے مفید ہوتی۔ لیکن وہ جو بے نیازی دکھاتا ہے' آپ اُس کی تو فکر میں رہتے ہیں۔ اور اگر وہ پاکی اختیار نہیں کرتا تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔ اور وہ جو آپؐ کے پاس دوڑتا ہوا آیا ہے' اور اس کے دل میں خشیت بھی ہے' تو اُس سے آپؐ استغناء برت رہے ہیں۔''

یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص چل کر آیا ہے' جس کے اندر تزکیہ حاصل کرنے کا جذبہ ہے اس سے آپ ذرا بے اعتنائی فرما رہے ہیں اور وہ لوگ جن کو کوئی پروا نہیں ہے اور وہ آپ کی باتوں پر توجہ ہی نہیں دیتے تو آپ ان کی طرف زیادہ توجہ کر رہے ہیں۔ یہاں بھی حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝۲۸﴾ ''اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔''

(۳) طٰہٰ:۱۶: اتباعِ ہوائے نفس کے حوالے سے تیسری آیت سورۂ طٰہٰ کی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کے ضمن میں آیا ہے: ﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝۱۶﴾ ''تو (اے موسیٰ علیہ السلام! دیکھنا کہیں) تمہیں اس سے روگرداں نہ کر دے کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے' (اگر ایسا ہوا) تو تم ہلاک ہو جاؤ گے''۔ حضور ﷺ سے خطاب میں بھی یہی لفظ آ رہا ہے کہ ان کی بات مت مانیے اور یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کہا جا رہا ہے کہ کہیں یہ لوگ آپ کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کر دیں جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔

(۴) القصص:۵۰: سورۃ القصص میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۵۰) ''اور اُس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ

ہوگا جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر!'' اگر اللہ کی ہدایت کے تابع چلتے ہوئے نفس کے تقاضے پورے کر رہے ہو تو ٹھیک ہے' لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ دنیا ہی مطلوب و مقصود اور محبوب بن جائے' اور آپ کی ساری محنت' بھاگ دوڑ' ساری پلاننگ سب کچھ اسی کے لیے ہو رہی ہو تو یہ صورتِ حال سراسر گمراہی ہے۔

(۵) صٓ :۲۶: سورۂ صٓ میں حضرت داوٗد علیہ السلام سے کہا گیا: ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۲۶) ''(ہم نے کہا:) اے داوٗدؑ! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے' لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔''

(۶) المائدۃ:۴۹: سورۃ المائدۃ میں حضور اکرم ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾ (آیت ۴۹) ''اور (اے نبی ﷺ!) فیصلے کیجیے ان کے مابین اس (شریعت) کے مطابق جو کہ اللہ نے اُتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے''۔ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ کے اندر منافقین بھی تھے اور کچھ بہت کمزور ایمان والے بھی موجود تھے۔ اب ان میں سے کسی سے کوئی قابلِ گرفت غلطی ہوگئی تو عبداللہ بن اُبی اُس کی سفارش کے لیے آ رہا ہے —— یہ خزرج کا سردار تھا اور اس کی حیثیت اور وجاہت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے مدینے کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے لیے سونے کا تاج بھی تیار ہو چکا تھا' لیکن نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ دو جہانوں کے بے تاج بادشاہ آ گئے تو اس کی شہنشاہیت اور تاج پوشی کا سارا معاملہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ چنانچہ اس کا دل حضور ﷺ کے خلاف حسد اور کدورت سے بھرا ہوا تھا — اب اس سے بڑا حضور ﷺ کا دشمن اور کون ہوگا — اب یہ کسی کمزور ایمان والے شخص کی سفارش لے کر آ رہا ہے تو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے اور آپ کا فیصلہ بالکل اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔

مَا جِئْتُ بِہٖ سے کیا مراد ہے؟

اب ایک اور علمی بات آ رہی ہے کہ زیر مطالعہ حدیث میں مَا جِئْتُ بِہٖ سے کیا مراد ہے اور اس کا مصداق کیا ہے — ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ)) ''تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی دلی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت اور دین کے تابع نہ ہوں'' — اب پہلی چیز جو آپ ﷺ لائے ہیں وہ قرآن حکیم ہے جو لفظ بلفظ محفوظ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن مجید کو ایک جلد میں جمع کیا گیا تھا اور اب قرآن ''مَابَیْنَ الدَّفَّتَیْن'' ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بِسم اللّٰہ کی با سے وَالنَّاس کی سین تک یہ سب اللہ کا کلام ہے اور قطعی اور حتمی طور پر ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس کی پیروی کرنا اور اس کے احکام کو ماننا لازم ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے احکام کو مستنبط کرنے کے لیے علم کا ہونا بہت ضروری ہے' اس لیے کہ اس قرآن کے اندر واضح احکام کے ساتھ ساتھ کبھی بات مجازاً ہوتی ہے' کبھی تمثیلاً ہوتی ہے اور کبھی اشارہ وکنایہ میں۔ نیز قرآن کا کوئی حکم خاص ہوتا ہے' کوئی عام ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو قرآن کے خاص کو عام کرنے یا عام کو خاص کرنے کا حق حاصل تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' سورۃ النور میں زانی مرد وعورت کے لیے سو کوڑے کی جو سزا آئی ہے وہ عام ہے: ﴿اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ﴾ ''زانی مرد اور زانیہ عورت' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو'' — حضور ﷺ نے اس سزا کو غیر شادی شدہ مرد وعورت کے لیے خاص فرمایا' جبکہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے رجم کی سزا مقرر فرمائی' جو سنت سے ثابت ہے۔ گویا قرآن کے عام کو خاص کر دیا۔ اسی طرح قرآن میں حکم آیا کہ تم دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کر سکتے ﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ﴾ (النساء:۲۳) حضور ﷺ نے اس حکم میں توسیع فرما دی کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کا بھی یہی حکم ہے کہ انہیں بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔

مزید برآں قرآنی احکام میں ناسخ و منسوخ کا معاملہ بھی ہے۔ ایک حکم پہلے نہیں آیا' بعد میں آ گیا۔ یا ایک حکم پہلے آیا' بعد میں تبدیل ہو گیا۔ شراب کی حرمت تدریجاً ہوئی ہے۔ جب تک آخری حکم نہیں آیا اس وقت تک لوگ پی رہے تھے' اس لیے کہ وہ حرام تو ہوئی ہی نہیں تھی۔ لہٰذا قرآنی احکام میں ناسخ و منسوخ کا معاملہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ فہم قرآن کے لیے عربی زبان اور عربی گرامر کے فہم کے ساتھ ساتھ ذخیرۂ حدیث پر گہری نظر' اور ائمہ فقہاء اور سلف صالحین کی آراء کا بھی علم ہونا چاہیے کہ اسلاف نے یہاں کیا رائے قائم کی ہے اور ان کے کیا دلائل ہیں۔

اس کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی حضور اکرم ﷺ لائے ہیں اور اس کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ))(۱) ''آگاہ رہو کہ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور شے بھی دی گئی ہے''۔ مِثْلَهٗ مَعَهٗ سے مراد سُنّتِ رسول ہے۔ سنت بھی گویا قرآن کے ہم پلہ ہے۔ یہ سمجھنا کہ سنّت حجت نہیں ہے یا اس سے شرعی احکام ثابت نہیں ہوتے' یہ درحقیقت بہت بڑی گمراہیوں میں سے ہے جو سوا سو سال سے بہت تیزی کے ساتھ ہمارے معاشرے کے اندر پھیلی ہے جب سے مغرب کے علوم' خاص طور پر سائنس اور فلسفہ وغیرہ ہمارے ہاں آئے ہیں اور غیروں کے تہذیب و تمدن نے ہمارے اندر رواج پایا ہے۔ چنانچہ حدیث کا استخفاف برعظیم پاک و ہند میں بہت عروج پر ہے' چاہے وہ علامہ مشرقی کی صورت میں ہو' یا غلام احمد پرویز' علامہ عبداللہ چکڑالوی یا اسلم جیراج پوری کی صورت میں۔ یہ لوگ جو ماڈرنسٹ کہلاتے ہیں' سنت کی حجیت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں' حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے کہ قرآن کے ساتھ اس جیسی ہی ایک اور شے اللہ نے مجھے دی ہے۔ اس پہلو سے قرآن مجید کے ساتھ سنت کا اتباع بھی لازم ہے۔

سُنّت کے مختلف درجات اور اقسام

سنت کا اتباع تو لازم ہے' البتہ آگے اس کے تین درجات ہیں: ایک تو سنتِ

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السُّنۃ' باب فی لزوم السُّنۃ۔

رسول (ﷺ) ہے‘ ایک خلفائے راشدینؓ کی سنت ہے اور ایک صحابہ کرام ؓ کی سنت ہے۔ ایک بار آپ ﷺ نے اپنی امت کے گمراہ فرقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب دوزخ میں ہوں گے‘ سوائے ایک فرقہ کے۔ صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول‘ وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِیْ))(۱) ’’جس پر میرا اور میرے صحابہ کا عمل ہے‘‘۔ یہاں آپؐ نے اپنے ساتھ صحابہ کو بھی جوڑ دیا۔ پھر صحابہ میں سے خاص طور پر خلفائے راشدین کے بارے میں علیحدہ سے فرمایا: ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ))(۲) ’’تم پر لازم ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑنا میری سنت کو اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو۔‘‘

اب میں سنت رسول کی قسموں میں سے چند ایک گنوا دیتا ہوں۔ ایک وہ سنت ہے جس کو ہم سنت تشریعی کہیں گے کہ جس سے شریعت کے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ وہ فرض ہے‘ واجب ہے‘ سنت مؤکدہ ہے یا سنت غیر مؤکدہ‘ یہ سارے درجے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے قائم کرنے کے ہیں‘ ایک عام آدمی خود فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر درجہ بدرجہ کیا معاملہ ہے۔ بغرضِ تفہیم عرض کر رہا ہوں کہ آپ دائیں سے بائیں کی طرف جائیں تو ترتیب یوں ہوگی: فرض‘ واجب‘ سنت مؤکدہ‘ سنت غیر مؤکدہ‘ مستحب‘ مباح‘ مکروہ تنزیہی‘ مکروہ تحریمی اور حرام۔ فرض سے حرام تک نو درجے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ ہر درجے کا اپنا ایک حق ہے۔

حضور ﷺ اپنے معمولات میں جبلی تقاضے بھی پورے کرتے تھے‘ مثلاً کھانا کھاتے تھے۔ تو اب کوئی یہ کہے کہ کھانا کھانا حضور ﷺ کی سنت ہے‘ تو یہ بات مناسب نہیں۔ یہ تو ایک جبلی تقاضا ہے جو آپ ﷺ نے پورا کیا۔ البتہ آپ ﷺ نے کچھ آداب سکھائے ہیں کہ ایسے کھاؤ تو اس پر عمل کرنا یقیناً سنت کے زمرے میں آتا ہے اور اس پر اجر بھی ملے گا۔ اسی طرح کھانے میں آپ ﷺ کو کدو پسند تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کدو کھانا

---

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الایمان‘ باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ۔

(۲) سنن الترمذی‘ابواب العلم‘ باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع۔

لازم ہے' البتہ اگر کوئی حضور ﷺ سے محبت کی وجہ سے اُن کی پسندیدہ چیز کھائے تو اللہ کے ہاں اس کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح ایک عادی تقاضے ہیں جنہیں ''سنت العادت'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً عادت کے مطابق ہمیشہ آپ ﷺ نے تہبند باندھا۔ شلوار پیش کی گئی تو آپؐ نے اسے پسند فرمایا کہ یہ اچھی چیز ہے اور زیادہ ساتر ہے۔ رات کو آدمی سویا ہوا ہو تو تہبند کے اندر بے پردہ ہونے کا خطرہ رہتا ہے' جبکہ شلوار میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ بعض چیزیں یا بعض افعال حضور اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہیں جن کی پیروی لازم نہیں ہے' بلکہ حضور اکرم ﷺ نے حکماً ان کے کرنے سے روک دیا ہے۔ مثلاً صومِ وصال' یعنی دو دن یا تین دن کا مسلسل روزہ بغیر افطار اور سحری کے۔ آج صبح روزہ رکھا ہے' شام کو افطار نہیں کیا اور اس کے بعد بھی روزہ جاری ہے' اگلی شام کو جا کر افطار کیا۔ یا تیسرے دن کے غروبِ آفتاب پر افطار کیا۔ اس طرح یہ دو دن یا تین دن کا مسلسل روزہ ہو گیا۔ حضور اکرم ﷺ یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے بعض نے یہ روزہ رکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ آپ خود رکھتے ہیں اور ہمیں روکتے ہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِ))(۱) ''تم میں سے کون میرے جیسا ہے؟ میں رات گزارتا ہوں اس حال میں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور مجھے پلاتا ہے''۔ وہ کیا روحانی غذا ہے جو آپ ﷺ کو ملتی تھی' اس کا ہمیں اندازہ نہیں ہو سکتا' لیکن بہر حال رسول اللہ ﷺ نے سختی کے ساتھ صومِ وصال رکھنے سے منع فرما دیا۔

اسی طرح بعض چیزیں انسان کے علم اور تجربے سے متعلق ہیں۔ اہلِ مدینہ ''تابیرِ نخل'' کا معاملہ کرتے تھے۔ یعنی کھجور کے نر پھول اور مادہ پھولوں کو قریب قریب جوڑتے تھے تاکہ فرٹیلائزیشن ہو جائے۔ حضور ﷺ نے کہا کہ تم ایسا نہ کرو تو کیا ہے؟ اس لیے کہ فطرت اپنا انتظام خود کر لیتی ہے' تمہیں اس کے اندر دخل اندازی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صحابہ کرامؓ نے جب تابیرِ نخل کا معاملہ نہیں کیا تو اس سے فصل کم ہو گئی۔ انہوں نے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

حضور ﷺ کو بتایا کہ ہم نے تابیر نخل کا عمل نہیں کیا، لیکن اس سے فصل کم ہوگئی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ))[1] ''تم اپنے دنیوی معاملات زیادہ جانتے ہو''۔ یعنی میں نے کوئی شریعت کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ یہ دنیوی معاملات ہیں جو تجربے سے ثابت ہوتے ہوں اور وہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

الغرض سنت سے استنباط کرنا، استدلال کرنا، نتیجہ نکالنا کہ کون سی سنت کس درجے کی ہے، اس کے لیے دین میں تفقہ کی ضرورت ہے اور حضور ﷺ نے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے خاص طور پر تفقہ فی الدّین کی دعا کی تھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم عطا فرمائے اور قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے اور اس کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا ......

حدیث 42

رحمتِ الٰہی کی وسعت اور توبہ کی فضیلت

۲۲/اگست ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۝ (الزمر)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا۝ (النساء)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۝ۭ (الاحزاب)

عَنْ أَنَسٍ ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا أُبَالِيْ ــــ يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ ــــ يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً)) (۱)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) سنن الترمذی، ابواب الدعوات، باب فی فضل التوبۃ والاستغفار……

''اے ابن آدم! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امیدیں وابستہ رکھے گا تو میں تجھے معاف کرتا رہوں گا' چاہے تیرے اعمال جیسے بھی ہوئے' اور مجھے تیرے گناہوں کی کوئی پروانہیں ــــ اے ابن آدم! تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے معافی مانگے تو میں تجھے معاف کردوں گا ــــ اے ابن آدم! اگر تو اتنے گناہ لے کر آئے کہ روئے زمین بھر جائے تو میں تیری اتنی ہی مغفرت کردوں گا' بشرطیکہ تو نے شرک نہ کیا ہو۔''

معزز سامعین کرام!

اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے آج ہم امام یحیٰ بن شرف الدین النووی رحمۃ اللہ علیہ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ''اربعین'' کی آخری حدیث کا مطالعہ کرنے چلے ہیں۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بندے کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ ''بین الخوف والرجاء'' رہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب' اُس کی سزا اور اُس کی پکڑ کا خوف بھی اُس کے دل میں ہو اور ساتھ ہی اُس کی شانِ غفاری اور شانِ رحیمی سے اُمید بھی دل میں موجزن رہے۔

خوف اور رجاء بھی من جملہ ان چیزوں میں سے ہے جن میں درمیانی راستہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے درمیان اتنا باریک فرق ہوتا ہے کہ اس کو محاورتاً یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک۔ انسان اِدھر بھی ہوسکتا ہے اور اُدھر بھی۔ یہی معاملہ درحقیقت خوف ورجاء کا ہے۔ دل اگر اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہوگیا تو صرف رجائیت رہ جائے گی' یا دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ اُس کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری نظر انداز ہوگئی' تو ان دونوں صورتوں میں بربادی ہی بربادی ہے۔

رجائیت کے حوالے سے قرآن کی عظیم آیت

ابتداء میں' میں نے جو آیات تلاوت کی ہیں' ان میں سب سے پہلے تو وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام گناہوں کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ سورۃ الزمر کی بڑی اہم آیت ہے:

﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے' اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہوں۔ یقیناً اللہ تمام گناہ معاف کر دے گا۔ وہ تو بخشنے والا بھی ہے اور رحم فرمانے والا بھی۔''

ظاہر بات ہے کہ گناہ اپنی ذات پر ظلم ہے' اس سے اللہ کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ گناہ کر کے انسان اپنا ہی مستقبل برباد کرتا ہے اور اپنی ہی شخصیت کو کجی کی طرف لے جاتا ہے۔ گناہ کا ایک نتیجہ تو آخرت میں نکلے گا' لیکن اس کا ایک نتیجہ دنیا میں بھی نکلتا ہے کہ اس سے انسان کی شخصیت صحیح رخ کے بجائے غلط رخ پر پڑ جاتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام گناہوں کی معافی کی امید دلائی ہے۔ چنانچہ مغفرت کے ضمن میں یہ قرآن حکیم کی سب سے زیادہ امید افزا آیت ہے۔

قرآنِ مجید میں انذار کا رنگ غالب ہے!

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید تقویٰ' خوف' خشیت اور انذار کی تلقین سے بھرا پڑا ہے۔ یوں کہیے کہ قرآن مجید میں انذار' تخویف اور خشیتِ الٰہی کا رنگ غالب ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ رجاء اور اُمید کے پہلو کو بھی قرآن نے نمایاں کیا ہے۔ اگر آپ موازنہ کریں کہ کتنی بار انذار کا ذکر آیا ہے اور کتنی مرتبہ رجائیت کا' تو اس میں کوئی شک نہیں کہ خوف اور انذار کا تذکرہ رجائیت کی نسبت زیادہ ہے اور اس کی دو بڑی وجوہات اور اسباب ہیں — ان اسباب کو سمجھنا بہت ضروری ہے' اس لیے کہ اس حوالے سے عیسائیوں نے قرآن' اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کیا ہے اور بظاہر ان کا اعتراض درست معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اور اسلام کی تعلیمات میں اللہ کے خوف پر زیادہ زور دیا گیا ہے' جبکہ انجیل میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں اللہ کی محبت کا وزن زیادہ ہے۔ یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقاریر' خطبات اور مواعظ میں خوف اور انذار کا رنگ بھی اگرچہ موجود ہے' لیکن غالب محبت ہے۔ اب عیسائیوں کا

اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں انذار کا پہلو کیوں غالب ہے؟

اس کے دو اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید اگرچہ ابدی کلام ہے اور اس کی تعلیمات بھی ابدی ہیں' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن مجید ایک خاص وقت' ایک خاص علاقے اور ایک خاص ماحول میں نازل ہوا ہے اور ایک خاص قوم اس کی مخاطب اوّل تھی۔ اس قوم کی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو وہ کسی توحید سے واقف تھی' نہ کسی رسالت سے' نہ کسی شریعت اور آسمانی کتاب سے' بلکہ وہ ہر اعتبار سے اُمّی (اَن پڑھ) قوم تھی۔ مزید یہ کہ قوم کی اکثریت اخلاقی گراوٹ اور سیرت و کردار کی پستی کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں انذار کا رنگ غالب ہونا لازم تھا تاکہ لوگ جاگ جائیں اور ہوش میں آئیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں انذار کے دل دہلا دینے والے انداز مذکور ہیں' مثلاً سورۃ الحاقہ اور سورۃ القارعہ کی ابتدائی آیات ملاحظہ ہوں:

﴿اَلْحَآقَّةُ ① مَا الْحَآقَّةُ ② وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ③﴾ (الحاقة)

﴿اَلْقَارِعَةُ ① مَا الْقَارِعَةُ ② وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ③﴾ (القارعة)

اور سورۃ النبا کا پرجلال آغاز ملاحظہ ہو:

﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ① عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ② الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③﴾

بقولِ حالی:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

چنانچہ قرآن اور اسلام میں انذار کا پہلو غالب ہونے کا ایک سبب تو اس وقت کے حالات اور معاشرے کی اخلاقی پستی تھی' جبکہ اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ محبت کے رمز آشنا بہت کم ہوتے ہیں اور عوام کی اکثریت کسی برے نتیجے کے پیشِ نظر ہی کسی کام سے باز آ سکتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں انذار کا پہلو غالب رکھا گیا ہے تاکہ لوگ عاقبت خراب ہونے کے ڈر سے گناہوں سے بچے رہیں۔ ورنہ محبت تو شاعری بن جاتی ہے۔ ذرا اندازہ کریں کہ آج کل عشقِ خداوندی کے دعوے تو بہت ہیں' لیکن عمل زیرو ہے۔

اسی طرح عشقِ رسول ﷺ کے دعوے بہت ہیں اور نعتوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں‘ لیکن عمل زیرو ہے! چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ رجائیت کے پہلو سے لوگوں کے غلط رُخ پر پڑ جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور عوام الناس کے اندر جو شے زیادہ ضروری ہے‘ وہ خوف و انذار ہے۔ جیسے سورۃ النازعات کی یہ آیت پہلے بھی ہمارے بیان میں آ چکی ہے: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾﴾ (النازعات) ”اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے“۔ یعنی وہ شخص اس تصور سے ڈرتا رہا‘ کانپتا رہا‘ لرزتا رہا کہ ایک دن مجھے اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اس ڈر سے اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا اور نفس کے منہ زور گھوڑے کی لگام کھینچ کر رکھی۔

قرآن مجید‘ رجائیت اور محبت سے بھی لبریز ہے!

مندرجہ بالا دو وجوہات کی بنا پر قرآن مجید میں انذار‘ تخویف‘ تقویٰ اور خشیت کا رنگ غالب ہے‘ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن میں محبت کا پہلو بھی موجود ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵) ”اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے“۔ یہاں تو صرف اللہ سے محبت کی بات کی گئی‘ جبکہ سورۃ التوبہ میں زبانی کلامی محبت کی نفی کر دی گئی۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

”(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتہ دار اور وہ مال

جوتم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے رستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

یعنی حضور اکرم ﷺ کو حکم ہو رہا ہے کہ واشگاف الفاظ میں ان سے کہہ دیجیے' انہیں کان کھول کر سنا دیجیے کہ اپنے مَن کے اندر جائزہ لے لو' اپنے دل میں ایک ترازو کھڑی کر لو —— ایک میزان تو قیامت کے دن قائم ہوگی لیکن ایک میزان آج اپنے اندر نصب کر کے جائزہ لے لو اور اپنی آٹھ محبتوں کو ایک پلڑے میں ڈالو اور دوسرے پلڑے میں اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد کی محبت ڈالو۔ پھر دیکھو کہ کون سا پلڑا بھاری ہے!

اگر تمہیں اپنے (۱) باپ' (۲) اپنے بھائی' (۳) اپنے بیٹے' (۴) اپنے زوج (یہ دونوں طرف جاتا ہے یعنی مرد کے لیے بیوی زوج ہے اور بیوی کے لیے شوہر زوج ہے)' (۵) تمہارے رشتہ دار یعنی تمہارا کنبہ قبیلہ' (۶) وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمایا ہے' (۷) وہ کاروبار جو بڑی مشکل سے جمایا ہے اور تمہیں خوف رہتا ہے کہ اس میں مندہ نہ ہو جائے' (۸) تمہارے بنائے ہوئے محلات' جو بڑے چاؤ سے تم نے تعمیر کیے ہیں' بڑے اہتمام سے انہیں فرنش کیا ہے' ان کی تزئین و آرائش میں چہار دانگِ عالم سے قیمتی اور عمدہ چیزیں لا کر رکھی ہیں جو تمہیں بہت محبوب ہیں۔ اگر یہ آٹھ محبتیں ایک پلڑے میں ہو جائیں اور دوسرے میں تین محبتیں ہوں: (۱) اللہ کی محبت' (۲) اُس کے رسول ﷺ کی محبت' اور (۳) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی محبت۔ اگر ان آٹھ چیزوں کی محبتوں میں سے کسی ایک یا سب محبتوں کا جذبہ اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے راستے میں جہاد کی محبتوں کے جذبے کے مقابلے میں زیادہ ہے تو پھر اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو!

اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے زبانی کلامی محبت تو محض شاعری بن جاتی ہے' لہٰذا اس محبت کا کوئی شاہد ہونا بھی ضروری ہے اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ اگر اللہ کے

دین کو غالب کرنے کی جدوجہد ہے تو یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کا ثبوت ہے' اور اگر آپ باطل کے غلبے پر راضی ہوئے بیٹھے ہیں' باطل کے غلبے کے تحت تقویٰ کی اُمید لیے بیٹھے ہیں' بغیر اس کے کہ اس کے خلاف جدّوجُہد ہو رہی ہو تو یہ اپنے آپ کو دھوکہ دینے (self deception) کے سوا کچھ نہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ⑨﴾ (البقرۃ) ''یہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور اہلِ ایمان کو' حالانکہ یہ نہیں دھوکہ دے رہے مگر صرف اپنے آپ کو اور انہیں اس کا شعور بھی نہیں ہے۔''

بین الخوف والرجاء کا رویہ مطلوب ہے!

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں تخویف اور تقویٰ کا رنگ غالب ہے' البتہ محبت کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے اور رجائیت کے پہلوؤں کو بھی تفصیل سے قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ آج جو حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے' اس میں بھی رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسانوں کے اندر بھی کچھ قنوطی قسم کے' یاسیت پسند (pessimists) لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے کئی بار میں آپ کو سائیکالوجی کی اصطلاحات کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ انسان مزاج کے اعتبار سے دو قسم کے ہوتے ہیں: دروں بین (introverts) اور بیروں بیں (extroverts)۔ اسی طرح بعض لوگ قنوطیت پسند (pessimist) ہوتے ہیں اور بعض رجائیت پسند (optimist) اور ان دونوں کے درمیان عدل اور توازن بہت مشکل معاملہ ہے۔ جیسے دروں بین (introverts) اور بیروں بین (extroverts) کے درمیان دونوں خصوصیات کی حامل شخصیت (ambivert) بہت محال اور بہت مشکل ہے اور نوعِ انسانی میں صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو اس مقام پر پورا تمکن حاصل ہے' اسی طرح بین الخوف والرجاء ایک مشکل معاملہ ہے کہ انسان میں خوف بھی رہے اور امید بھی۔ اس حوالے سے چوٹی (climax) کا قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ آپؓ کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ بتا دیا جائے کہ تمام انسان جنت میں جائیں گے سوائے ایک کے' یعنی صرف

ایک شخص دوزخ میں جائے گا' تو مجھے خطرہ ہوگا کہ شاید وہ ایک میں ہی ہوں' اور اگر مجھے بتادیا جائے کہ تمام انسان دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک کے' یعنی جنت میں جانے والا صرف ایک ہی شخص ہوگا تو مجھے پھر بھی امید ہوگی کہ شاید وہ ایک میں ہی ہوں۔ یہ زروۂ سنام ہے بین الخوف والرجاء کی کیفیت کا۔

اللہ اور قیامت سے اُمیدیں

''رجاء'' کا لفظ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اور قیامت کے حوالے سے بار بار آیا ہے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو قیامت کا معاملہ بہت زیادہ خوف آور اور خوف پیدا کرنے والا ہے' لیکن قرآن مجید میں اللہ کے ساتھ قیامت کو بھی رجاء میں بریکٹ کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی مشہور آیت ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾ ''اے مسلمانو! تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی شخصیت مبارکہ میں ایک بہت عمدہ (کامل' معتدل اور ہر اعتبار سے متناسب) نمونہ موجود ہے (اور اس کامل نمونہ سے استفادہ وہی کر سکے گا) جو (۱) اللہ (سے ملاقات) کی امید رکھتا ہو' (۲) آخرت کے حوالے سے بھی جس میں امید کا پہلو موجود ہو' اور (۳) کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہو''۔ قیامت سے امید رکھنے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جہاں بدکاروں کے لیے قیامت ڈرنے کی جگہ ہے تو ان کے مقابلے میں نیکوکاروں کے لیے یہ مرحلہ تو بڑی بشارت کا ہوگا۔ اس ضمن میں سورۃ الانشقاق کی یہ آیات بڑی اہم ہیں: ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿٧﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿٨﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿٩﴾﴾ ''پس جس کو داہنے ہاتھ میں کتاب دی جائے گی تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا' اور وہ واپس آئے گا (اس مقام سے یعنی کٹہرے سے) اپنے اہل کی طرف بہت خوش وخرم''۔ گویا جنہوں نے اس دنیوی زندگی میں اللہ کے لیے قربانیاں دیں' اللہ کے لیے محنتیں کیں تو ان کے لیے قیامت کا دن ایسے ہی ہے جیسے تنخواہ بانٹنے کا دن ہوتا ہے جس کا انسان شدت سے انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ نیکوکار لوگوں کے لیے قیامت کے حوالے سے بھی رجاء کا پہلو ہوتا

ہے کہ آج اللہ سے ملاقات ہوگی' آج اللہ کے سامنے پیشی ہوگی اور آج ہمیں انعامات سے نوازا جائے گا۔

قرآن حکیم میں یہ مضمون کئی دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ الممتحنۃ میں فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ﴾ (آیت ٦) ''تمہارے لیے یقیناً ان (کے طرزِ عمل) میں ایک بہت اچھا نمونہ ہے اُس کے لیے جو اللہ تعالیٰ (سے ملاقات) اور یومِ آخرت کی اُمید رکھتا ہو''۔ سورۃ الکہف کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝١١٠﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں' (بس فرق یہ ہے کہ) مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ پس جو بھی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے اسے نیک عمل کرنے چاہئیں اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے''۔

سورۃ العنکبوت میں فرمایا گیا: ﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ﴾ (آیت ٥) ''جو کوئی بھی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے وہ مطمئن رہے کہ اللہ کی ملاقات کا وقت آ کر رہے گا''۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں' مصیبتیں جھیل رہے ہیں' تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں' وہ یہ سب اس امید میں کر رہے ہیں کہ ایک روز اللہ کے حضور میں حاضری ہوگی اور اللہ عزوجل ہمیں اپنی ان سرفروشیوں' جانفشانیوں اور قربانیوں کا اجر عطا فرمائے گا۔ شیطان وسوسہ اندازی کرتا رہے' لوگ کہتے رہیں کہ کس خیال میں پڑے ہوئے ہو' کس نے آخرت کو دیکھا ہے' مرنے کے بعد آج تک کسی نے آ کے کوئی خبر دی ہے' کس امید موہوم میں تم اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہو؟ پتا نہیں وہ دن آتا بھی ہے کہ نہیں آتا' اس لیے کہ آخرت تو ادھار کا سودا ہے' جبکہ دنیا نقد کا معاملہ ہے اور عام طور پر قاعدہ بھی یہی ہے کہ ''نو نقد نہ تیرہ ادھار'' یعنی تمہیں اگر کسی شے کے نو روپے نقد مل رہے ہیں تو وہ لے لو' تیرہ روپے میں ادھار کا سودا مت کرو! کیا پتا ادھار

ملے نہ ملے اور رقم پوری مر جائے۔ یہ وسوسہ شیطان پیدا کرتا ہے کہ پتا نہیں وہ دن آتا بھی ہے کہ نہیں آتا۔ تو زیر مطالعہ آیت میں اسی حوالے سے فرمایا کہ انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ وقت معین آ کر رہے گا اور وہ اپنے رب کی ملاقات سے ضرور سرفراز ہوں گے۔

یہ مضمون سورۃ الزمر میں بھی آیا ہے: ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ﴾ (آیت۹) ''بھلا وہ شخص جو بندگی کرنے والا ہے رات کی گھڑیوں میں، سجود و قیام کرتے ہوئے، وہ آخرت سے ڈرتا رہتا ہے، اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار بھی ہے!'' پھر یہی مضمون سورۃ بنی اسرائیل میں بھی آیا ہے کہ یہ مشرکین جن ہستیوں کو پکارتے ہیں، یعنی انبیاء، صدیقین، اولیاء اللہ یا ملائکہ، وہ فی الواقع موجود ہیں اور ان کے وجود سے تو انکار نہیں ہے، باقی ان کے بارے میں جو کچھ انہوں نے عقائد یا تصورات گھڑ لیے ہیں، ان کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، نہ عقل میں، نہ نقل میں اور نہ ہی وحی میں۔ فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾﴾ ''وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے قرب کے متلاشی ہیں کہ ان میں سے کون (اُس کے) زیادہ قریب ہے اور وہ امیدوار ہیں اُس کی رحمت کے اور ڈرتے رہتے ہیں اُس کے عذاب سے۔ واقعتاً آپؐ کے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے''۔ جیسے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص محض اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ کسی صحابیؓ نے بڑی ہمت کر کے پوچھ لیا کہ کیا حضور ﷺ آپ بھی؟ فرمایا: ((وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَةٍ))(۱) ''نہیں میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت (کے دامن) میں ڈھانپ لے۔''

اللہ عزوجل کی شانِ استغناء

بہرحال مطلوب یہی ہے کہ انسان ہر وقت خوف اور رجاء کے درمیان رہے — البتہ ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی بایں طور بیان ہوئی ہے: ((اِنَّ رَحْمَتِيْ

(۱) صحیح البخاری، کتاب المرضیٰ، باب تمنی المریض الموت۔

سَبَقَتْ غَضَبِیْ))(۱) ’’میری رحمت میرے غضب پر غالب آ گئی ہے‘‘۔اس کی شرح اصل میں آج کی ہمارے زیر مطالعہ حدیث میں ہے‘ جس میں اللہ کی ایک خاص شان بیان ہوئی ہے کہ وہ غنی ہے‘ بے نیاز ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۷) ’’(اے منافقو ذرا سوچو!) اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر اور ایمان کی روش اختیار کرو!‘‘ اللہ تعالیٰ‘ معاذ اللہ‘ کوئی ایذا پسند (sadist) نہیں ہے کہ کسی کو تکلیف دے کر اسے خوشی ہوتی ہو بلکہ وہ تو الغنی ہے ــــــ یہ لفظ قرآن مجید میں آٹھ مرتبہ آیا ہے۔ کہیں کہا گیا: غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ‘ کہیں غَنِیٌّ حَمِیْدٌ اور کہیں غَنِیٌّ کَرِیْمٌ۔ کہیں غَنِیًّا آیا ہے ــــ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ اللہ غنی ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس حوالے سے ایک حدیث ہم پڑھ چکے ہیں کہ اگر زمین اور آسمان کے تمام باسی‘ اوّلین بھی آخرین بھی‘ انسان بھی جن بھی‘ سب کے سب دنیا کے بدترین انسان جیسے بن جائیں تب بھی اللہ کی سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی اور اگر تمام انسان‘ تمام جن‘ تمام اوّلین و آخرین‘ سب کے سب متقی ترین انسان جیسے بن جائیں تو اس سے بھی اللہ کی سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ یہ ہے اس کی شانِ استغناء۔

اللہ تعالیٰ کی اسی شان کے بارے میں سورۂ آل عمران میں آیا ہے:

﴿وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾﴾

’’اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ وہ حج کریں اُس کے گھر کا‘ جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔ اور جس نے کفر کیا تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے۔‘‘

یعنی جو لوگ حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کریں تو گویا وہ ایک طرح کا کفر کر رہے ہیں‘ جبکہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور اسے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم ضرور حج کے لیے جاؤ اور اس کے گھر کا طواف کرو۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب التوحید‘ باب قول اللہ تعالیٰ بل هو قرآن مجید……

زیرِ مطالعہ حدیث پر ایک نظر

زیرِ مطالعہ حدیث میں درحقیقت دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے' ایک ہے اللہ سے اُمید واثق رکھنا' اور ایک ہے اللہ کی شانِ استغناء!

حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا —— یہ انداز ایسا ہے جو بڑا یقینی ہو جاتا ہے کہ میں نے خود سنا' اور اگر ''عَنْ'' ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ بات کسی اور صحابی سے ان تک پہنچی ہو —— بہرحال یہ حدیث قدسی ہے جس کی تعریف (definition) کئی مرتبہ میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ اب ہم حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : يَا ابْنَ آدَمَ ! اِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ)) ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امید باندھے رکھے گا'' ((غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا اُبَالِيْ)) ''میں تجھے معاف کرتا رہوں گا' چاہے تیرے اعمال جیسے بھی ہوئے' اور مجھے (تیرے گناہوں کی) کوئی پروا نہیں''۔ یعنی تو جتنے گناہوں کا انبار بھی لے کر میرے پاس آ جائے گا تو میں اُن سب کو معاف کر دوں گا' مگر اس کے لیے دو شرائط ہیں۔ پہلی شرط ہے ((اِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ)) کہ جب تک مجھے پکارتے رہو گے' مجھ سے دعائیں کرتے رہو گے' مجھ سے استغفار کرتے رہو گے' میری مغفرت طلب کرتے رہو گے۔ اور دوسری شرط یہ ہے: ((وَرَجَوْتَنِيْ)) کہ مجھ پر اُمید رکھو گے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور وہ مجھ پر رحم فرماتے ہوئے میرے تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو خود فرماتا ہے کہ ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ﴾ (الاعراف:١٥٦) ''میری رحمت نے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے''۔ چنانچہ جب تک مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے امید رکھو گے تو جو بھی کچھ تم نے خرابیاں یا گناہ کیے ہوں گے میں ان سب کو معاف کر دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔ یہ ہے اللہ کی شانِ استغناء۔

آگے فرمایا: ((يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ

غَفَرْتُ لَکَ)) ''اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے معافی مانگے تو میں تجھے معاف کر دوں گا''۔ آخری بات یہ فرمائی: ((یَا ابْنَ آدَمَ! اِنَّکَ لَوْ اَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ)) ''اے ابن آدم! اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ روئے زمین بھر جائے اور پھر تو مجھ سے ملاقات کرے'' ((لَا تُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا لَاَتَیْتُکَ بِقُرَابِھَا مَغْفِرَۃً)) ''بشرطیکہ تو نے شرک نہ کیا ہو تو میں تیری اتنی ہی مغفرت کر دوں گا''۔ گویا گناہوں کی مغفرت کے لیے شرطِ لازم ہے کہ بندے نے شرک نہ کیا ہو۔

یہ مضمون سورۃ النساء میں دو مرتبہ آیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا ﴿۴۸﴾﴾

''یقیناً اللہ اس بات کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم تر جو کچھ ہے وہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اس نے تو بہت بڑے گناہ کا افترا کیا۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۭ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾

''اللہ ہرگز نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لیے چاہے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ تو گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بھی بہت دور نکل گیا۔''

یعنی کسی صورت بھی عام معافی کا اعلان نہیں ہے، بلکہ معافی کے لیے بنیادی اور لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اللہ ہی کو پکارتا رہا ہو اور اُس نے کسی اور کو نہ پکارا ہو۔ کہیں ''غوث الاعظم'' کو نہ پکارا ہو، کسی ولی کو نہ پکارا ہو، کسی نبی اور رسول کو نہ پکارا ہو، چنانچہ زیر مطالعہ حدیث کے آخر میں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! اگر تو میرے پاس زمین کے حجم جتنے گناہ لے کر آئے گا اس حال میں کہ تو نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے لیے زمین کے حجم جتنی ہی مغفرت لے کر آؤں گا۔

شرک اور اقسامِ شرک

اب غور کیجیے کہ اس حدیث کے اندر گناہوں کی مغفرت کے لیے اللہ عزوجل نے کتنی شرطیں رکھی ہیں: (۱) اگر تم مجھے پکارتے رہے' (۲) مجھ سے امید واثق رکھی' (۳) مجھ سے مغفرت چاہی' اور (۴) میرے ساتھ شرک نہ کیا' تو میں تمہارے سب گناہ بخش دوں گا۔ اس آخری شرط کے حوالے سے جان لیں کہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق یہ شرط بنیادی اور لازمی ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ شرک درحقیقت کتنا عظیم گناہ ہے' لیکن اس کی حقیقت کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ ع ''ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں'' کے مصداق آپ نے بت سامنے رکھ کر نہیں پوجا' لیکن اپنی خواہش نفس کو پوج لیا تو یہ بھی شرک ہے۔ پچھلی نشست میں ہم یہ آیات پڑھ چکے ہیں: ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (الفرقان:۴۳) ''(اے نبی ﷺ!) آپ نے غور کیا اس شخص کے حال پر جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے!'' کوئی بُت خانہ نہیں ہے' لیکن اندر کا بُت خانہ آباد ہے۔ لہٰذا شرک کی اقسام کیا ہیں اور شرک کی حقیقت کیا ہے' اس کا جاننا بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں شرک اور توحید کی بحثوں کو بعض خاص نکات پر مرکوز کر دیا جاتا ہے مثلاً نور و بشر کا مسئلہ' علم غیب کا مسئلہ' قبر پرستی کا مسئلہ۔ ٹھیک ہے یہ چیزیں بھی اپنی جگہ پر اہم ہیں' لیکن جس نے آج کے دور کے شرک کو نہ پہچانا تو وہ تباہی کے دہانے پر ہے۔

ہمارے پچھلے علماء نے شرک کی جو اقسام بیان کی ہیں' وہ ان کے اپنے زمانے کے اعتبار سے تھیں۔ آج وہ شرک بھی ہو رہے ہیں۔ قبر پرستی بھی ہو رہی ہے' اولیاء پرستی بھی ہو رہی ہیں' سب کچھ ہو رہا ہے' لیکن آج کا اصل شرک انفرادی سطح پر نفس پرستی اور دولت پرستی ہے' جبکہ اجتماعی سطح پر حاکمیت انسانی آج کے دور کا سب سے بڑا شرک ہے۔ اس لیے کہ حاکم تو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں اور تم نے انسانوں کو حاکم بنا دیا۔ کبھی حاکم ایک ہوتا تھا نمرود یا فرعون کی شکل میں' جبکہ آج جمہوریت میں تمام انسانوں کو نمرود بنا دیا گیا ہے۔ گویا وہ نجاست جو ٹنوں کے حساب سے ایک شخص کے سر پر رکھی ہوئی تھی' اسے جمہوریت

میں ماشہ ماشہ سب عوام کو بانٹ دیا گیا۔ اب نجاست تو نجاست ہی رہے گی' چاہے وہ تولہ ہو' ماشہ ہو' یا ٹن کے حساب سے ہو۔ پھر آج کے دور کا ایک بہت بڑا شرک مادہ پرستی (Materialism) بھی ہے کہ سارا توکّل' سارا اعتماد مادی وسائل پر ہے۔ اسی طرح وطن پرستی بھی شرک کے زمرے میں آتا ہے کہ اس دورِ جدید میں وطن کو ہی معبود بنا لیا گیا۔ علامہ اقبال نے اسے دورِ حاضر کا سب سے بڑا ''بُت'' قرار دیا ہے: ؎

اس دور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے' وہ مذہب کا کفن ہے

چنانچہ فرمایا: ؎

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

''جے ہند'' کیا ہے؟ یہی کہ وطن معبود ہے' محبوب ہے! آج قوم کی شیرازہ بندی وطن کی بنیاد پر ہو رہی ہے' حالانکہ قوم کی شیرازہ بندی ایمان کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اقبال نے کہا تھا: ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم!

یعنی ہم افغان' ترک اور تاتاری نہیں ہیں' بلکہ ہم تو چمنستانِ اسلام کے شگوفے اور ایک شاخِ ایمان کے پھول ہیں۔ ان پھولوں کے مابین رنگ و بُو کی تمیز ہم پر حرام ہے' کہ ہمیں تو ایک ہی نئی بہار نے پروان چڑھایا ہے۔ لہٰذا شرک کی حقیقت اور شرک کی اقسام —— شرک فی الذات' شرک فی الصفات' شرک فی الحقوق' شرک فی العبادت' شرک فی الدعاء —— کو سمجھنا بہت ضروری ہے تاکہ شرک سے بچا جا سکے۔

شرک کے موضوع پر میرے بہت سے خطابات ہیں اور اس اُمت کے لیے میرے بڑے ابتدائی تحفوں میں سے ایک ''حقیقت و اقسامِ شرک'' کے عنوان سے میری چھ گھنٹے کی تقریریں تھیں جو مسجد دارالسلام میں ہوئیں۔ چھ گھنٹے کی ان تقاریر کو پہلے صفحہ قرطاس پر اتار کر مرتب کیا گیا' پھر قسط وار ماہنامہ میثاق میں شائع کیا گیا اور اب انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔☆ شرک کی حقیقت اور آج کے دور میں شرک کی اقسام کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ شرک کی حقیقت اور اقسام کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ شرک وہ شے ہے جو معاف نہیں ہوگی۔

رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر: توبہ

زیر مطالعہ حدیث کے ضمن میں اب آخری بات کی طرف آتے ہیں۔ قبل ازیں میں نے آپ کو اللہ عزوجل کے دو فرمان سنائے: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ ''میری رحمت نے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے'' اور ((اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ)) ''میری رحمت میرے غضب پر غالب آ گئی ہے''۔ اب سوچئے کہ اس رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر کیا ہے؟ ایک سوال آپ اپنے آپ سے کیجیے اور پھر اس کا جواب تلاش کیجیے۔ حضور اکرم ﷺ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا کرتے تھے اور پھر خود ہی جواب دیتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو آپؐ نے پوچھا: ((اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟)) ''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟'' اب صحابہؓ نے جواب دیا: اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْھَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ ''ہم تو اپنے

☆ اب یہ تقاریر ''حقیقت و اقسامِ شرک'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ (ادارہ)

درمیان مفلس اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس درہم و دینار نہ ہو"۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِصَلَاۃٍ وَصِیَامٍ وَزَکَاۃٍ، وَیَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ ھٰذَا وَقَذَفَ ھٰذَا وَاَکَلَ مَالَ ھٰذَا وَسَفَکَ دَمَ ھٰذَا وَضَرَبَ ھٰذَا، فَیُعْطٰی ھٰذَا مِنْ حَسَنَاتِہٖ وَھٰذَا مِنْ حَسَنَاتِہٖ، فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُہٗ قَبْلَ اَنْ یُقْضٰی مَا عَلَیْہِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاھُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْہِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ))(۱)

"قیامت کے دن میری اُمت کا مفلس وہ آدمی ہوگا کہ جو نماز، روزے، زکوٰۃ وغیرہ سب کچھ لے کر آئے گا، لیکن اُس نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا، تو ان سب کو اس آدمی کی نیکیاں بانٹ دی جائیں گی، اور اگر اس کی نیکیاں ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کے گناہ اس آدمی پر ڈال دیے جائیں گے، پھر اس آدمی کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"

اسی طرح قرآن مجید بھی پہلے سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ مثلاً سورۃ الصف میں اہل ایمان سے ایک سوال کیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴿۱۰﴾﴾ "اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟" پھر ساتھ ہی اس کا جواب بھی دے دیا گیا: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۱﴾﴾ "(وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔"

اسی طرح آپ بھی اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر کیا ہے؟ ـــــ اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر "توبہ" ہے اور یہ وہ شے ہے جو عیسائیوں کو بہت بڑی ٹھوکر دے گئی، بایں طور کہ انہوں نے عقیدہ بنا لیا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے ایک خطا ہوگئی تھی اور اس کے بعد جو بھی انسان اس دنیا میں آتا ہے وہ اس خطا کا

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم الظلم۔

بوجھ لے کر آتا ہے۔ عیسائیوں کے اس تصور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر گناہگار ہے۔ اب اس کا ازالہ کیسے ہو؟ تو اس کے لیے انہوں نے باطل پر باطل (ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ) کے مصداق یہ عقیدہ اخذ کیا کہ اللہ نے حضرت مسیحؑ کی صورت میں اپنا صلبی بیٹا دنیا میں بھیجا اور اسے لوگوں کی طرف سے کفارہ بنا کر (قربانی کے بکرے کی طرح) سولی پر چڑھوا دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ نقل کفر کفر نباشد۔ اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کو نہ جان سکے۔ سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں قرآن بتاتا ہے کہ ان سے خطا تو ہوئی تھی لیکن پھر انہوں معافی طلب کی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝٣٧﴾ (البقرۃ) ''پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات' تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ یقیناً وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا' بہت رحم فرمانے والا''۔ اب کوئی بھی ابن آدم اپنے جدّ امجد آدمؑ کے گناہ کا بوجھ لے کر اس دنیا میں نہیں آتا۔

توبہ کی فضیلت

توبہ کے موضوع پر اس سے پہلے بھی ہمارے ہاں کئی درس ہو چکے ہیں اور بہت سی احادیث کا میں حوالہ دے چکا ہوں۔☆ آج دو حدیثیں میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ پہلی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ((اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا)) ''یقیناً ایک بندہ گناہ کرتا ہے''۔ ((فَقَالَ: رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْلِیْ)) ''پھر وہ کہتا ہے: اے پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے' مجھے معاف فرما دے''۔ ((فَقَالَ رَبُّهٗ)) ''تو پروردگار کہتا ہے''((أَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ)) ''کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک ربّ ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور اس کی سزا بھی دے سکتا ہے؟'' یعنی وہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پالنے والا ہے جو

☆ توبہ کی عظمت اور اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے دو خطابات پر مشتمل کتاب ''توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر اور موجودہ دور میں کرنے کا اصل کام' ملاحظہ کیجیے! (ادارہ)

چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو اسے سزا دے دے۔ اس کے صرف اس جاننے کی بنیاد پر اس کے اس علم اور اس کے اس ایمان کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ)) ''میں نے اپنے بندے کو معاف کیا''۔ ((ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰہُ)) ''پھر وقت گزرا جتنا کہ اللہ نے چاہا''۔ ((ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا)) ''پھر اس سے گناہ ہو گیا''۔ ((فَقَالَ: رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْہُ)) ''وہ پھر کہتا ہے: اے پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے پس تو مجھے معاف فرما دے''۔ ((فَقَالَ)) ''(تو اس کا ربّ) فرماتا ہے'' ((أَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ)) ''کیا میرے بندے کو یہ معلوم ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور چاہے تو اس پر پکڑ بھی سکتا ہے (سزا بھی دے سکتا ہے)''۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ((غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ)) ''میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا''۔ ((ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰہُ)) ''پھر ایک عرصہ گزرا جتنا کہ اللہ نے چاہا''۔ ((ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا)) ''پھر اس سے گناہ ہو گیا''۔ ((قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ آخَرَ)) ''اس نے کہا: پروردگار میں نے تو پھر ایک اور گناہ کر دیا'' ((فَاغْفِرْہُ لِیْ)) ''پس مجھے بخش دے''۔ ((فَقَالَ: أَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ)) ''اللہ فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے (جسے وہ پکار رہا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اسے اختیار حاصل ہے کہ) چاہے تو بخش دے اور چاہے تو پکڑ لے''۔ اللہ فرماتا ہے کہ اُس کے اِس علم' اس ایمان کی بنیاد پر میں نے اسے معاف کر دیا: ((غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثَلَاثًا ' فَلْیَعْمَلْ مَا شَاءَ))(۱) ''میں نے اپنے بندے کو تینوں دفعہ معاف کر دیا۔ بس وہ اب جو چاہے کرے۔'' یہ ہے اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری اور شانِ استغناء' جس کے بارے میں زیر مطالعہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: فَلَا أُبَالِیْ ''پس مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔''

دوسری حدیث اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ مسلم شریف میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ بیان کیا:

(۱) صحیح البخاری' کتاب التوحید' باب قول اللّٰہ تعالیٰ ﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلَامَ اللّٰہِ﴾۔

((اَنَّ رَجُلًا قَالَ: وَاللّٰهِ لَا یَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ ' وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ: مَنْ ذَاالَّذِیْ یَتَأَلّٰی عَلَیَّ اَنْ لَا اَغْفِرَ لِفُلَانٍ؟ فَاِنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَاَحْبَطْتُ عَمَلَكَ))(۱)

''ایک شخص نے یہ کہا: اللہ کی قسم' اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کون ہے جو میرے اوپر حاکم ہونے کا دعوے دار ہے (یعنی میری طرف سے حکم لگا رہا ہے) کہ میں فلاں شخص کو معاف نہیں کروں گا! اس کو تو میں نے معاف کر دیا اور اس شخص کے تمام اعمال میں نے ضائع کر دیے (یعنی اس شخص نے میرے بندے کو میری رحمت اور شانِ غفاری سے مایوس کیا تھا' اس لیے میں نے اس کے تمام اعمال ضائع کر دیے)۔''

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کہ اللہ تعالیٰ انسان کے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے' لیکن اس کے لیے زیر مطالعہ حدیث میں چند شرائط بھی بیان کی گئی ہیں جن پر عمل پیرا ہونا بہت ضروری ہے: (۱) اللہ سے دعا' (۲) اللہ سے استغفار' (۳) اللہ سے امید' اور (۴) شرک سے اجتناب۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ شرائط پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب النهی عن تقنیط الانسان من رحمة اللّٰه تعالٰی۔

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک پا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ